مہاجر

پچاس سالہ سفر کی داستان

بریگیڈیر عبدالرحمٰن صدیقی (ستارۂ خدمت)

مہاجر

پچاس سالہ سفر کی داستان

بریگیڈیئر عبدالرحمٰن صدیقی (ستارۂ خدمت)

بسلسلہ کتب

گولڈن جوبلی آف پاکستان

فہرست

	آزادنوٹ	7
	مصنف کے بارے میں	9
	تعارف: ڈاکٹر مبشر حسن	11
	پیش لفظ	17
باب نمبر 1	تاریخی پس منظر	25
باب نمبر 2	قیام پاکستان 45	
	پہلے دس سال	
	1947-1958	
باب نمبر 3	ایوب، یحییٰ دور	61
	پہلے طویل فوجی مارشل لاء سے تقسیم پاکستان تک	
	1958-1971	
باب نمبر 4	بھٹو ضیاء دور 79	
	سول مارشل لاء، پہلا آئینی و جمہوری دور حکومت	
	اور دوسرا طویل فوجی مارشل لاء	
	1971-1985	
باب نمبر 5	ایم کیو ایم کی آمد	97
	سندھ میں نئی سیاسی جھتے بندیاں	
باب نمبر 6	تصادم سے عوامی مقبولیت تک	121
	ضیاء جونیجو بینظیر دور	
	1986-1990	
باب نمبر 7	تنظیمی پھیلاؤ اور اندرونی کشمکش	143
باب نمبر 8	ایم کیو ایم اور پاکستانی سیاست	171
باب نمبر 9	مہاجر سے متحدہ تک	187

پیش لفظ

عبدالرحمٰن صدیقی کی تصنیف " تقسیم ہند اور بہادر شاہ ظفر کی واپسی " ایک دلچسپ پیرائے میں بیان ہوئی ہے' سب سے پہلے تو اس کا عنوان ہی قاری کے کان کھڑے کرتا ہے اور وہ فوراً تصنیف کے متن کے مطالعہ کیلئے بے تاب سا ہو جاتا ہے اور جب مسودہ کھول کر پڑھتا ہے تو وقت سے بے نیاز پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کی تصنیف کی ' اپنے پہلے حرف سے ہی قاری کو گرفت میں لے لینا' سب سے بڑی خوبی مانی جاتی ہے۔

تصنیف " رنگون بر مزار ما غریباں " سے شروع ہوتی ہے' اس " بر مزار ما غریباں " میں ہندوستان کا آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر آرام فرما ہے' پہلو میں ان کی ملکہ نواب زینت محل ابدی نیند سو رہی ہیں۔

" صاحب عالم " چند روز سے عجب پریشان سے ہیں۔" خواب میں ایک بے خد و خال ہیولا آتا ہے پھر یکدم غائب ہو جاتا ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔" ایسی ہی صورت حال میں حضرت نظام الدین اولیاء سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا' فرماتے تھے۔" میاں ابو ظفر تم بھلے رہے دلّی بدر ہو کر' رنگون آ پڑے۔ رسوائی انگریز کی ہوئی کہ بادشاہ کو اپنی راجدھانی' اپنے حلقے اور اپنی دلّی سے باہر کیا ایک ہم ہیں کہ دلّی میں پڑے ہیں اور دلّی ہے کہ پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے' بس اتنا کہا اور غائب ہو گئے۔"

پھر خود ہی ' صاحب عالم " کہتے ہیں کہ " سنا ہے ہندوستان کا بٹوارہ ہونے والا ہے اور پھر بٹوارے کے نفع و نقصان پر سوچتے ہوئے خیالات کے پر لگا کر ۱۸۵۷ ء کے غدر کے زمانے میں چلے جاتے ہیں۔ جب وہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ اور ان کے اختیارات از دلّی تا پالم تک محدود

تھے۔اس کے آگے پیچھے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ مٹکاف اور۔کبر ہڈسن اوراس کے حواریدندناتے پھرتے تھے۔

''صاحب عالم'' کوشدہ شدہ خیال کی رو نے دلّی پہنچادیا۔ جہاں ہندوستان کے بٹوارہ کی کاغذی کارروائی مکمل ہوچکی ہے دونوں ملکوں (پاکستان، بھارت) کے سرحدی تعین کا کام بھی جاری ہے۔اس لحاظ سے گویا دلّی اورحضرت نظام الدین اولیاء، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت بوعلی قلندر پانی پتی، حضرت امیر خسرو اورمرزا غالب بھارت کے مال ومنال ٹھرے اور لاہور اورحضرت داتا گنج بخش ہجویری، بابا فرید الدین گنج شکر، بلھےشاہ، مادھولال حسین ملتان اورحضرت زکریاملتانی اوردوسرے صوفیائے کرام، سندھ اور حضرت عثمان مروندی اورشاہ عبدالطیف بھٹائی پاکستان کے حصے میں آئے۔

تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی دونوں مما لک کے سامنے مسائل درمسائل کھڑے ہو گئے۔دہلی سے پنجاب تک کی پوری آبادی ادھر سے اُدھر ہوئی' لاکھوں لوگوں کے گھر بار چھوٹے اور جیسیفرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بندھ گیا۔دونوں طرف کے لاکھوں بےقصور لوگوں کو جانا پڑا۔حضرت نظام الدین اولیاء اورحضرت بوعلی قلندراور دیگر صوفیائے عظام اب بھی بہادرشاہ ظفر کو 'صاحب عالم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔اوراس سے ان کے قلب کو یک گونہ طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ان کا کہنا یہ کہ زمین اللہ کی ہے 'زمین پرحکمرانی ان کی ہوتی ہےاور جو وہاں کے حکمران ہوتے ہیں اورحکمرانی بدلتی رہتی ہے۔نہیں بدلنے والی شے ہماری وہ تہذیب وتمدن اورزبان ہے 'جنہیں ہم نے صدیوں پروان چڑھایا' اوراب ہم اسی کا تحفظ کرنا ہے کہ یہی ہماری حکمت ہے۔

چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاء نے اس کارخیر کے نئے دہلی میں ایک جلسہ بلانے کی تجویز پیش کی' جس میں پاک وہند کے صوفیائے عظام کوشرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ فرض "صاحب عالم" کوسونپا گیا کہ ان بزرگوں کی نگاہ میں وہی ساڑھے چارسو برس کی تہذیب وتمدن کے وارث ووالی ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے اس موقف کو لے کر' ان کے ایماء پر صاحب عالم حضرت داتا

گنج بخش ہجویری سے لاہور میں نے۔ یہاں بھی داتا بخش نے آخری مغل تاج دار بہادرشاہظفر "صاحب عالم" ہی سے

مخاطب کیا۔ داتا گنج بخش سے ملاقات کا تاثر خود صاحب عالم پر یہ ہوا کہ جیسے "میں اللہ سبحان وتعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی امان میں آ گیا۔"

دلّی واپسی پر "صاحب عالم" نے دیکھا کہ ایک طرف پاکستان کا جھنڈا اور دوسری طرف ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور دونوں جھنڈے تلے ادھر سے اُدھر ہونے والی مخلوق بے یار و مددگار' خون خرابے سے پناہ مانگ رہی ہے اور صاحب عالم سوچ رہے ہیں "یا اللہ یا مولا یہ تیری خدائی میں کیا ہو رہا ہے۔"

"صاحب عالم" کے لئے یہ نظارہ بڑا سوہانِ روح ثابت ہوا کہ لال قلعہ پر سہ رنگا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اسی عالم میں وہ حضرت نظام الدین' کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ داتا گنج بخش سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ صوفیائے عظام کی دلّی کے اجلاس میں شرکت کی دعوت کو داتا صاحب نے بہ سرو چشم قبول کیا ہے۔ "صاحب عالم" کو اس وقت حضرت نظام الدین کی معیت میں چند بزرگ بیٹھے نظر آئے' وہیں امیر خسرو سے بھی ان کا صاحب سلام ہوا۔ امیر خسرو نے صاحب عالم" کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر حاضرین سے ان کا تعارف کرایا۔ حاضرین میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی' نصیر الدین چراغ وملوی' بابا فرید گنج شکر اور لکیر شریف کے سابد یہاں موجود تھے۔ ان بزرگوں نے بہار شاہ ظفر کو "صاحب عالم" سے مخاطب کیا۔ اس پر انہیں نظام الدین کا یہ فرمان یاد آیا کہ "اب آپ محض سراج الدین نہیں بلکہ فرماں روائے تہذیب و تمدن ہند ہیں' ملک خدا کا' ریت بادشا یا حاکم کی۔ مگر صاحب عالم کے ذمے جو فرض سونپا گیا ہے اس کا تعلق برصغیر کی سرزمین یعنی اس کے جسم سے نہیں بلکہ اس کی روح سے ہے۔ اس روح سے جو ہمارے بزرگوں نے اس کے جسد خاکی میں چھونکی اور جو اب آپس کے جھگڑے فساد کی نذر ہوا چاہتی ہے۔"

پھر "صاحب عالم" سرہند گئے اور مجدد الف ثانی سے اپنے موقف کا اظہار کیا' انہوں نے بھی حضرت نظام الدین اولیا اور دیگر بزرگوں کے موقف کی تائید کی۔

مولوی ذکاء اللہ کی اس کتاب کی یاد دلاتی ہے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق ہے' اسے پڑھ کر خواجہ حسن نظامی

اور ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیف "ایامی" کی یاد بھی آتی ہے اور ذہن سر سید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کی طرف بھی جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "تقسیم ہند اور بہادر شاہ ظفر کی واپسی" کی تحریر حد درجہ دلکش اور موثر ہے۔لیکن آگے پیچھے اتنے واقعات اور ان کے نتائج ذکر میں آئے ہیں کہ تحریر کی وہ زندہ دلی' واقعات کی کثرت اور نوعیت بوجوہ برقرار نہ رہ پائی جس کا نظارہ ابتدائی پچاس ساٹھ صفحات میں کیا گیا۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک قابل مطالعہ تصنیف ہے۔اس کی غایت ومنشاء دو پڑوسی ممالک (پاکستان و ہندوستان) کے امن وسلامتی میں رہنے اور زندگی گزارنے کا ہے۔ایک صاحب قلم کیلئے ایسا چاہنا انسانیت کے فروغ و بقا کے لئے لابدی ہے۔

آفتاب احمد خاں

صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

یوں دلّی میں پاک و ہند کے صوفیائے اعظام کا یہ جلسہ منعقد ہوا جلسے کی صدارت مجدد الف ثانیؒ نے فرمائی اور مسند

عالیہ پر ''صاحب علام''، متمکن ہوئے۔ دلی کا جلسہ واقعی یادگار یوں ٹھرا کہ اس میں پاک و ہند کے صوفیائے عظام، قطب الاقطاب اور عظیم الرتبت اشخاص شریک ہوئے۔

اس جلسے کو ہندوستان سے حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت نصیر الدین چراغ، حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت بو علی قلندر، خواجہ سلم چشتی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت مجدد الف ثانی نے خطاب کیا اور پاکستان سے داتا گنج بخش ہجویری بابا فرید الدین گنج شکر' مضرتو سلطان باہو' مادھو لال حسین' بابا بلھے شاہ' حضرت عثمان مروندی اور حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی نے اس جلسے کو مخاطب کیا۔ اس جلسے میں عظیم المرتبت شخصیات کی نمائندگی مرزا غالب نے کی۔

آخر کار جلسے کو سمیٹتے ہوئے صدر جلسہ حضرت مجدد الف ثانی نے "صاحب عالم" سے مختصراً فرمایا کہ ہم نے آپ کا انتخاب کثرت رائے سے کر دیا ہے آپ کو جو ذمے داری تفویض کی گئی ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بخیر و عافیت عہدہ براہونے کی سبیل پیدا کرے۔ مگر یا برصغیر کی تہذیب وتمدن و زبان کی حکمت کے بہادر شاہ ظفر والی قرار پائے۔

بعد کے زمانے میں "صاحب عالم" کی طرف سے وسیع تر افراد پر مشتمل ایک اور بڑے جلسے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس میں صوفیائے عظام کے ساتھ ہر مکتب فکر کے افراد مدعو کئے جاتے ہیں۔ ان میں قائداعظم محمد علی جناح' مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی حیثیت نمایاں ہے۔ اس کانفرنس میں گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ اب جبکہ دونوں آزاد مملکتیں ایک حقیقت ہیں تو دونوں کو مل کر ایک ایسی فضا قائم کرنی چاہے جس میں ہر روز کی تاتنی سے انسان کو نجات ملے اور دونوں ممالک کے عوام امن وسلامتی کے ماحول میں زندگی بسر کریں۔ ان کا بنیادی موقف بہ قول مصنف جناب عبدالرحمٰن صدیقی "بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام" ہو۔

مختصر یہ کہ کتاب مذکور کے مصنف عبدالرحمٰن صدیقی اپنی مخصوص رواں سلیس تحریر میں قیام پاکستان کے بعد کے پچاس برسوں کے واقعات کو جستہ جستہ قلم بند کرتے گئے ہیں۔ ان کی تحریر

سے ہے جس میں یہاں کے باسی' بالخصوص ہندو۔ مسلمان سب کے برابر شریک ہیں۔ ان میں دلی کے حضرت

نظام الدین حضرت قطب الدین بختیار کا کی حضرت امیر خسرو' حضرت نصیر الدین محمود چراغ ،خصرت خواجہ باقی یا اللہ' سر ہند کے حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی ، پانی پت کے حضرت بو علی قلندر' لاہور (پنجاب) کے حضرت سید علی ہجویری' اجودھن (پاک پٹن) کے خواجہ فرید الدین گنج شکر' (راولپنڈی/ اسلام آباد) لطیف بری امام ، سائیں بلھے شاہ ، حضرت سلطان باہو' حضرت مادھو لال حسین اور سندھ کے شاہ لطیف بھٹائی سبھی شریک محفل ہیں۔

نقشے پر تقسیم کے جو خطوط کھینچے گئے ہیں اور ان کے جلو میں جو بین الاقوامی سرحدیں وجود میں آئی ہیں وہ بے شک اپنی جگہ ہیں اور انہیں وہیں رہنا چاہیئے۔ کہ سیاسی اور بین الاقوامی مصلحت اور حکمت عملی کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ تاہم ان کی موجودگی ہر گز اس مشترک روحانی ورثے کی نفی اور تنسیخ نہیں کرتی جو پورے برصغیر کے ہندو۔ مسلمانوں کا ہے۔ بالخصوص اولیاء اللہ کے وہ مقدس مزار جو غیر منقسم ہندوستان میں مرجع خلائق تھے اور آج بھی اسی طرح چلے آرہے ہیں اور ائندہ بھی ان کی وہی حیثیت رہے گی خود کتاب کی زبان میں "وکیلوں' ججوں اور حکام نے تو اپنا کا کام کرلیا کہ بھائی دریا اور نہریں اور ان کا پانی ایک طرف کھیت اور کھلیان اپنی اپنی جگہ اہم ،مگر ان سب کو تو توڑ کر بھی بنایا جاسکتا ہے مگر مزاروں کو تو نہیں ہلایا جاسکتا رہا بین الاقوامی سرحدوں کا تو سارے اولیا کرام کا یہی متفقہ فیصلہ تھا کہ زمین کے بٹوارے سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ ملا' حظہ کریں کتاب ہی سے ایک اور مختصر اقتباس

"یہ معاملہ (تقسیم) زمین اور اہل زمین کا ہے وہ جو چاہیں جو کریں زمیں خود بہت ظالم ہے وہ اپنا بدلہ خود لیتی ہے اور لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی۔ ہماری کوشش اور دعا صرف یہ ہے کہ روحانیت کا جو ارتقاء سرزمین ہند میں صدہا برس میں ہوا ہے اور جو ہماری سب سے قیمتی میراث ہے وہ لوح محفوظ کی طرح باقی رہے۔"

کتاب کے مرکزی خیال یعنی تقسیم ہند کے بارے میں محترم مشتاق احمد یوسفی صاحب کا اپنا نظریہ اور اپنے ذہنی تحفظات ہیں جس کا میں دل سے احترام کرتا ہوں۔ ان کے نزدیک بجا طور پر

یہ کتاب میں نے اپنے قیام سنگا پور کے وزران قلم برداشتہ صرف پانچ ہفتوں میں مکمل کی ۔ ہر چند کہ مجھے اردو رسم الخط سنبھالنے میں کافی دقت ہوتی ہے ۔مگر اس کتاب کی تکمیل کے دوران کچھ ایسی آمد اور روانی ہوئی کہ بس لکھتا ہی چلا گیا۔ اور مجھے یوں لگا کہ جیسے پاک و ہند کے جن اولیاء کرام کے حوالے سے یہ کتاب لکھی گئی 'ان سب کا سایہ عاطفت میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کو اس کتاب کا مرکزی کردار یوں بنایا گیا کہ اس کے باوجود کہ پوری سلطنت مغلیہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا تسلط ہو چکا تھا۔ تاہم سکہ وخطبہ بہادر شاہ ظفر ہی کے نام تھا اور سرکاری دستاویز کی باقاعدہ 'رسمی توثیق' کیلئے انہی کی مہر شاہی درکار تھی۔

رما محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کا' سو جس جرأت اور بے باکی سے انہوں نے کم از کم پانچ سلاطین کا مقابلہ کیا اس کی مثال ہماری پوری تاریخ میں نہیں ملتی ۔ ہنوز دلی دوراست ، کا محاورہ انہیں حضرت محبوب الٰہیٰ کی زبان مبارک سے اس وقت نکلا جب' سلطان غیاث الدین تغلق ایک اہم فوجی مہم سر کرنے کے بعد فتح ونصرت کے شادیانوں کے ساتھ دلی واپس ہو رہا تھا۔ سلطان کی محبوب الٰہی سے کشیدگی اور برہمی چونکہ انتہا تک پہنچ چکی تھی اس لئے خلق خدا کو خوف تھا کہ وہ آتے ہی محبوب الٰہیٰ کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرے گا۔ حضور نے سنی ان سنی کر کے بس یہ فرمایا کہ ہنوز دلی دوراست ۔ اور یہ محاورہ نہ صرف زبان زدخلائق ہوا بلکہ خود سلطان کے حق میں بددعا ثابت ہوا۔ دلی سے صرف چندکوس دور اس پر بجلی گری اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔

کتاب کا محور تقسیم ہند کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق برصغیر کے اس تاریخ اور مشترکہ روحانی میراث

شکریہ

جناب مشتاق احمد یوسفی کا جنہوں نے از راہ لطف و کرم میرے قلمی مسودے کا بہت غور و فکر سے مطالعہ کیا' حسب ضرورت اصلاح اور ترمیم کی اور میری انتہائی حوصلہ افزائی کی۔

اپنے دوست جناب آفتاب احمد خاں' چیئر مین انجمن ترقی اردو' پاکستان کا جنہوں نے خود مسودے کو پڑھا اور انجمن کے دیگر ماہرین کو تبصرے کے لئے دیا۔

پروفیسر فخر مان فتحپوری کا جنہوں نے پروف پر نظر ثانی کی اور مجھے اور میرے ناشر کو مفید مشوروں سے نوازا۔ دلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سلیم بقائی کا' جنہوں نے اپنے کواپنی کے قیام کے دوران سب سے پہلے مسودے کو پڑھا اور پسند کیا۔

میرے دوست اور دیرینہ ساتھی جناب اختر علی خاں مرحوم و مغفور کا جنہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے اپینڈکس کی تدوین اور تکمیل کی۔

اپنے پرانے ساتھی اور معاون جناب محمد شریف کا جنہوں نے میرے بدخط علمی مسودے کو صاف کر کے اشاعت کے قابل بنایا۔

اپنے ناشر رائل بک کمپنی کے جمشید مرزا کا جنہوں نے مسودے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے کتابی صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

اپنے بیٹے انیس الرحمٰن اور بہو ناجیہ انیس الرحمٰن جن کے گھر کے پرسکون ماحول میں، میں نے اس کتاب کو مکمل کیا۔ کتاب کی تکمیل کے کچھ ہی عرصے بعد اللہ تعا'لی نے انہیں ان کی پہلوٹھی کی بچی اور ہماری اکلوتی پوتی لامعہ کی ولادت سے نوازا۔

اپنی بیوی عارفہ خاتون کا جو آج تک اپنے پیدائشی نام کی حامل ہیں اور بیوی سے کہیں زیادہ خاتون خانہ ہیں۔

اور سب سے آخر میں اور خلوص دل سے میں ان حضرات کا فرداً فرداً انتہائی مشکور ہوں کہ جن کی معاونت کے بغیر اس کتاب کی تکمیل اگر ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہوتی۔

اللہ تبارک تعالیٰ میرے ان سب مہربان دوستوں کو اپنی نوازشات اور عنایات سے نوازے آمین ثم آمین۔

این دعاء از من واز جملہ جہاں آمین بار

کراچی۔اکتوبر ۲۰۰۲ء ع۔ر۔ص

پہلا باب

رنگون:

برمزارِ ماغریباں......!

چندروز سے عجیب بے کلی سی ہے۔خواب میں ایک ہیولا سا نظر آتا ہے بے خدوخال اور پھر ایک دم سے غائب ساتھ ہی آنکھ بھی کھل جاتی ہے، ناور پھر اسی طرح کھلی کی کھلی رہتی ہے۔ لاکھ کروٹیں بدلو مگر مجال ہے جو آنکھ ذرا بھی لگ جائے روز استخارہ لیتا ہوں مگر خواب میں وہی بے نام ونشان ہیولا آکر چلا جاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی زیارت کیلئے دل بے قرار ہے مگر زیارت سے ہنوز محروم ہوں عرصہ ہوا ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا فرماتے تھے میاں ابوظفر تھے بھلے رہے۔ دلی بدر ہوکر رنگون جا پڑے۔ رسوائی انگریز کی ہوئی کہ بادشاہ کو اپنی راجدھانی اپنے قلعے اپنی دلی سے باہر کیا اور دیارِ غیر میں اسیر کیا مگر بھلا اس میں تمہارا ہی ہوا کہ وہ بلائیں جو ہم پر نازل ہوئیں ان سے تو بہرحال بچ گئے۔ ایک ہم ہیں کہ دلی میں پڑے ہیں اور دلی ہے کہ گویا پاؤں تلے نکلی جا رہی ہے بس اتنا کہا اور پھر غائب ہوگئے۔ وہ دن اور آج کا دن ان کی زیارت اور ہم کلامی سے محروم ہوں۔

سنا ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہونے کو ہے۔ ہندوستان ہمارے پرکھوں کی سرزمین ہماری

تہذیب اور زبان کا گہوارہ اب تقسیم کے کنارے آلگا ہے۔ اس کی تاریخی وحدت اب پارہ پارہ ہونے کو ہے۔ ہندو ایک طرف اور مسلمان ایک طرف۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ہماری پھول والوں کی سیر اور چھڑیوں کا کیا ہوگا۔ خود محبوبِ الٰہی کی درگاہ کا کیا ہوگا کہ پورے ہندوستان کا آستانہ تھی۔ ہندو مسلمان' چھوٹے بڑے سب وہاں جبیں سائی کرتے' فاتحہ پڑھتے' منتیں مانتے' حیران و پریشان آتے' کامران و شادماں ہو کر لوٹتے۔ ان کی تسلی گھڑی دو گھڑی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ بھی کیا کچھ کم ہے زندگی بھی تو آخر گھڑی دو گھڑی سی ہی کی ہے کلام شاعر بزبان شاعر بھلا تو نہیں معلوم ہوتا مگر ذہن کے کسی کم گشتہ گوشے سے نکل کر بے اختیار ہونٹوں پر آ گیا ہے اور اب منہ سے نکلے بغیر نہیں رہے گا وہی اپنا پرانا شہر

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن

دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

تو کیا واقعی ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو رہے ہیں حال ہی میں فاتحہ کیلئے چند بھلے مانس اللہ کے نیک بندے' آ گئے تھے۔ ان کی زبان تو پوری طرح ہماری فہم سے سے باہر تھی۔ مگر تقسیم کا لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔

یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے

اللہ گواہ ہے ہم نے تو اپنی جانب سے نور کی سعی کی کہ ہندو بے شک اپنی جگہ ہندو اور مسلمان اپنی جگہ مسلمان رہے اور اللہ کے حضور بصد عجز و انکساری یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ ہماری سعی ہرگز سعی رائیگاں نہ تھی۔ ہندو' مسلمان سبھی ہندوستانی تھے۔ بمنزلہ بھائی بھائی۔ رہا آپس کی بیزاری اور ناراضگی کا تو میاں اس سے کہاں اور کیسے مفر۔ کیا یہ سب کچھ حقیقی بھائیوں کے بیچ نہیں ہوتا خاندان میں بٹوارے نہیں ہوتے باپ دادا کی حویلیاں نہیں بنتیں ایک ہی مکان میں بھائی بھائی کے حصوں کے بیچ تیغے نہیں لگتے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ذات اور شہریت بھی بدل کر رہ جائے۔ آپس کے جھگڑے اور بٹوارے ایک طرف لیکن پورے کے پورے شہر کے پورے ملک بھی کہیں اس طرح تقسیم ہوا کرتے ہیں ملک نہ ہوا زمین اور

جائیداد ہوگئی کہ ادھر قبالوں کا تبادلہ ہوا ادھر ملکیت بدل گئی ملک کا بٹوارجانبین کے مابین لین دین کا معاملہ تونہیں کہ شہر کے حاکم اور ضلع کچہرے کے سرشتہ دار کو بلایا اور اس کی موجودگی میں ادھر کی چیز ادھر اور ادھر کی چیز ادھر۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

خبر چونکہ پکی نہیں اس لئے اضطراب اور بھی بڑھا جارہا ہے عقل کام نہیں کرتی البتہ کان گنہگار ہیں حضرت آئیں تو پکی خبر لائیں روزان کا دھیان کر کے سوتا ہوں مگر کوئی پتہ نہیں میری تو ان سے وہی نسبت ہے جو مرید کو مرشد سے ہوتی ہے نعوذ باللہ۔ نہ میں بادشاہ نہ وہ فقیر۔ نہ میں سلطان غیاث الدین تغلق، نہ وہ باغی درویش۔ ہماری تو نسبت بالکل ایک تھی۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ قلعہ چھوڑ کر درگاہ پر تکیہ بنالوں مگر ادھر حکومت نہ ہوتے ہوئے بھی بادشاہت کا بھرم ادھر مٹکاف صاحب (دلی ک انگریز حاکم، ریزی ڈینٹ) کی صبح وشام کرنے والی حکمرانی کے انداز۔ آج قلعہ سے غیاث پور کے لئے پروازہ راہ داری کا عریضہ لکھو۔ ایک مدت بعد ان کا جواب ملے اور وہ بھی کبھی ہاں اور کبھی نہ۔ حاکم وقت جو ٹھرے۔ ہماری اپنی حیثیت شاہ شطرنج کی اور وہ بھی ایسے ایسے کھلاڑیوں کے بیچ جو بازی جیتنے کی خاطر بادشاہ کو پیادے سے پٹوادیں ایک طرف نواب زینت محل تھیں بھلا کہاں ہم کہ کب کے ستر کی سرحد پار کر چکے تھے اور کہاں وہ کہ ابھی چالیس سے بھی کم دوسری طرح حکیم احسن اللہ خاں صاحب تھے، ہمارے معالج اور راز دان خاص۔ جسم وجان کے بھیدی سر سے پاؤں تک ہم سے متعلق بھلا کونسی ایسی بات جو ان سے چھپی ہوئی تھی۔

انہیں معلوم تھا کہ نواب زینت محل ہماری کمزوری تھیں ہماری ہی عقل پر پتھر پڑے کہ ہم انہیں اس پیرانہ سالی میں بیاہ لائے۔ حکیم صاحب کے نسخوں پر ہی ہمارے گھر کی زندگی کی خوشی اور ناخوشی کا کل دارومدار تھا۔ وہ نسخے لکھتے ہم گھول کر پی جاتے۔ وہ مرکبات تجویز کرتے ہم انہیں آنکھوں سے لگاتے اور بسم اللہ کہہ کر منہ میں ڈال لیتے مگر بھائی بڑھاپا، بڑھاپا ہے۔ وقت کے حاکم مطلق کے آگے بھلا کس کی چلتی ہے حکیم صاحب کے نسخے اور مرکبات ایک طرف اور وقت کا تقاضہ ایک طرف۔ دوا کبھی اپنا کام کر دکھاتی تو واہ، واہ۔ ورنہ پھر وہی ہائے جوانی۔ رات ڈھنگ

سے گزر بھی گئی تو پھر صبح کی کوفت اور کسل مندی کا کیا علاج کہ پوراتن ہی خستہ ہو جائے تو پھر بیچارے حکیم احسن اللہ کا کیا دوش وہ تو موتی اور ہیرے ہی کھرل کر سکتے ہیں۔ڈھلی ہوئی کھال کی جھریاں تونہیں نکال سکتے۔اور پھران دونوں کے پیچھے مرزا الٰہی بخش،مرزا مغل تھے، پڑھنے لکھنے سے تو خیر انہیں واسطہ ہی کیا تھا۔گھڑسواری بھی کرتے تو بے دلی سے، شروع شروع میں پہلوانی کا شوق ہوا سو وہ بھی کچھ ہی عرصے میں ختم ہوکر رہ گیا۔آداب شاہی تو بڑی بات ہے۔آداب محفل سے کمال بے خبر تھے۔مٹکاف صاحب کبھی بہر ملاقات یعنی ٹوہ لینے قلعہ میں تشریف لاتے اور کہیں شہزادے سے ان کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ان کی لولو بول دیتے۔لاکھ سمجھاؤ کہ میاں حاکم وقت ہے اگر جھک کر سلام نہیں کر سکتے تو کنی کاٹ کر نکل سکتے ہو،کیا ضروری ہیں عین سامنے آکر ان کی لولو بولو۔مگر بھائی وہ بھلا کس کے سننے والے۔بس ابا حضور،ابا حضور کہہ کے آئیں بائیں شائیں کر جاتے۔

کبھی نواز ب زینت کی محلاتی سازشوں اور حکیم احسن اللہ خاں کی غداری کا خیال اتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے دل میں بس ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ یا اللہ تیری خدائی میں یوں بھی ہوتا ہے۔اپنے ہی بیری ہو جائیں تو پھر غیروں سے کیا شکوہ؟ نواب زینت محل کو تو خیر معاف کیا جا سکتا ہے کہ مگر حکیم نے کھلی غداری کی۔گھر کا بیدی لنکا ڈھائے۔انگریزوں کی پوری فوج نے وہ نہیں کیا جو ایک حکیم صاحب نے کر دکھایا۔اگر ہم رہتے تو پتہ نہیں انہیں پھانسی دیتے یا جلاوطن کر دیتے ان کا جرم تو قطعی ناقابل معافی تھا۔کڑی سے کڑی سزا بھی اس کے لئے ناکافی تھی۔بہرحال اب پچھتائے کیا ہوت......

نواب زینت محل تو ہمارے ساتھ رنگون ہی آگئیں اور آج تک بلکہ رہتی دنیا تک ہمارے پہلو میں ہی رہیں گی۔مگر حکیم صاحب تو غدر بلکہ غداری کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ ہمیں تو آج تک پتہ نہیں کہ کہاں جا پڑے۔مرزا نوشہ نے شاید انہیں کے بارے میں کہا ہوگا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

دلی کی تباہی دلی والوں کی بربادی اوخود اپنی اولاد کا غم لئے ہم تو بے آسرا، بے یارو مددگار اپنے جدامجد حضرت نصیر الدین ہمایوں کے مزار پر چھپے بیٹھے تھے۔ آفت کے اس دور میں بھی ہماری وفادار رعایا نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کھانا پینا وہی ہمارا من پسند قورمہ اور ریانی سے لے کر شاہ پسند مسور کی دال تک چھپ چھپ کر اللہ کے بنادے آتے اور نذر کر جاتے ۔حسرت تھی تو اس کی کہ اتنی قربت کے باوجود حضرت نظام الدین کی طرف سے نہ کوئی پیغام نہ کوئی اشارہ۔ بالکل خاموشی۔

ان دنوں بھی کم وبیش وہی کیفیت ہے جو ان دنوں تھی۔ کمال بے چینی اور بے کلی کی۔ البتہ اس کا خوف نہیں کہ ظالم انگریز کب کھوج نکالے اور ایک ایک کر کے بدلہ چکائے۔ سچ پوچھو تو ہمیں انگریز سے بھی کوئی رنجش، کوئی شکایت نہ تھی کہ ازماست کہ برماست!

بھائی جو بپتا پڑی تھی اس کی سراسر ذمہ داری ہم پر ہی تھی او جو سزا ابھی ملنے والی تھی اس کے بھی اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک ہم ہی سزاوار ہوں گے۔ آسمان سے گلہ اور انگریز کو کوسنے سے کیا فائدہ۔

ہمایوں کے مقبرے پر گئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا ایک دن صبح صبح غلغلہ ہوا۔ فوج آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے لال کرتی والوں نے مزار پر قبضہ کرلیا۔

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا

آستین میں دشنہ پنہاں، تو خیر یونہی منہ پر آ گیا۔ ہاتھ میں کھلا خنجر اور ننگی سنگین البتہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔ میں نے دیکھتے ہی میجر ہڈسن کو پہچان لیا کہ بارہا قلعہ میں قاصد کی حیثیت سے آچکا تھا۔ یا اللہ کیسی غضب ناک تھی اس کی آنکھیں۔ سچ مچ شعلہ بار۔ چہرہ انار کی طرح سرخ اور اسی طرح بے ڈھنگا، ہاتھ میں سنگینی، جو وہ بالکل میرے سامنے تانے کھڑے تھے۔ منہ سے کف جاری اور زبان پر گالیوں کی بوچھاڑ۔ ان کی اکثر گالیوں کی تو مجھے بھی پہچان تھی کہ بارہا کھائی تھیں جب وہ زور زور سے ہونٹ ہلا کر ا یکدم سے بھینچ لیتے تو سمجھ لو ماں، بہن کی کر رہے ہیں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پھر اپنی گوراشاہی اردو میں کہا ''بڈھے، اٹھو بوت آرام کیا۔ بلڈی فلاں'

بلڈی فلاں۔

پیچھے نواب زینت محل میلے اور پھٹے ہوئے دوپٹے کا پلو کئے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔شہزادے ان کے پیچھے تھے ۔گم سم، سکتے کے عالم میں قلعہ کی ساری شوخیاں، شرارتیں اور چھیڑ چھاڑ سب نکل کر رہ گئی تھیں۔ مٹکاف صاحب کی لولو بولنا تو بڑی بات ہے۔اب میجر ہڈسن کے سامنے بھی زبان پر تالے پڑے گئے تھے۔

ویل بڈھے اور تمہارا خاندان ہمارے قیدی ہیں۔ چپ چاپ ہمارے پیچھے ہولو۔اگر کسی نے ذرا بھی کوئی حرکت کی تو گولی ماردی جائے گی۔ سمجھا بڈھا، بادشاہ بہادرشاہ۔ بلڈی اولڈ مینا.....'' اسکے ہونٹوں پر جوزہر تھا بھلائے نہیں بھولتا۔ بھلا اسے کبھی بھلایا جاسکتا ہے کبھی نہیں۔

تو لیجئے میاں۔آگے پیچھے میجر ھڈسن کی فوج اور بیچوں، بیچ ہم اور ہماراشاہی خاندان، نہ سر پرٹوپی نہ پاؤں میں جوتی ۔سر جھکائے چلے جارہے ہیں۔ پاؤں جیسے من من بھر کے ہوئے جارہے تھے۔اٹھائے نہ اٹھتے ۔مگر اٹھانے پر مجبور۔ ذرا لڑکھڑائے پیچھے سے سنگین کی نوک کمر میں۔اور ٹھوکر ٹانگوں پر'' تیز چلو بڈھے تیز'' سپاہی کون تھے سب کے سب ہمارے اپنے ہندوستانی۔سب کے سب ہمارے بھائی، ہماری رعیت۔ ہوسکتا ہے کبھی خود ہماری فوج میں رہے ہوں۔مگر اب انگریز کے نمک خوار۔ان کا نمک کھاتے اور ان کے گن گاتے۔ان کا حکم بجالاتے۔آفرین ہے انگریز پر جس نے انہیں ایسی تربیت دی کہ غیر کی نمک حلالی اور غیر سے وفا داری اپنوں کی عزت اور اپنوں پر بھاری ہوئی۔ان کے ایک اشارے پر ناچنا گویا فوجی تنظیم اور تربیت کی انتہا سمجھی گئی۔

ہمارا تو خیر جو حال تھا سو تھا شہزادوں کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی تھی۔ان کے لئے ایک ایک قدم بھاری ہورہا تھا ذرا گردن اٹھاتے تو پیچھے سے ہندوستانی سپاہی جھٹکا دے کر گردن نیچی کر دیتا۔اس انتہائی بے بسی کے عالم میں جو ہمت زینت محل نے دکھائی اس کے اعتراف سے انکار سراسر ناانصافی ہوگی۔ وہ منہ پر دوپٹے کا پلو تھامے لگ بھگ ہمارے شانہ بشانہ نہایت اطمینان اور سکون سے بے اف کئے چلتی رہیں۔ کیا شان کبریائی ہے۔کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ کہاں پورے دربار کو نگاہ روبرو کرنے کا حکم اور کہاں گردن اٹھا کر چلنے کی ممانعت۔

مقبرے سے دروازے تک کا راستہ اور پھر اس کے آگے چاندنی چوک تک کا راستہ پتہ نہیں کس طرح کٹا۔قلعہ مصلیٰ راستے میں تھا اس کے در و دیوار اسی طرح کھڑے تھے۔صرف بادشاہ اور اس کا کل خاندان باہر تھا۔اتنی مہلت بھی نہ تھی کہ گردن موڑ کر اپنے گھر کو دیکھ لیں؟ بس ادھر قلعہ کی طرف گردن مڑا اور ادھر پیچھے سے دھاپ پڑی۔خبر نہیں کیوں مرزا نوشہ کا وہ شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

حالانکہ آشیانے پر نہ صرف بجلی گر چکی تھی بلکہ خود ہی ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے گرے جا رہی تھی اور اس کی کڑک سے ہمارے کان پھٹے جا رہے تھے۔

قلعہ کے صدر دروازے پر دو ہتھیار بند انگریز سپاہی کھڑے تھے۔باوردی انتہائی چاق و چوبند،ان کی کھلی سنگینیوں کی چمک ہی گویا وہ بجلی تھی جو ہمارے آشیانے پر گر رہی تھی۔عین صدر دروازے کے اوپر انگریز کا جھنڈا الہرا رہا تھا۔غضب ہے ہمارا تو جھنڈا تک نہیں تھا۔کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔بس رنگ برنگی جھنڈیوں اور جھالروں ہی سے جی خوش لیا کرتے تھے۔

قلعہ پیچھے رہ گیا اور ہم آگے بڑھ گئے اتنے میں کوتوالی آ گئی۔ہڈسن نے ''ہالٹ'' کہا اور اس کے صرف ایک لفظ پر ہمارا شاہی قافلہ وہی کھڑا ہو گیا۔پھر ہماری اور نواب زینت محل کی آنکھوں پر پٹی کس دی گئی۔اور ہمیں وہیں ایک طرف کھڑا کر دیا گیا پھر تڑاتڑ گولیوں کا شور سنائی دیا مرنے والے شہزادوں کی آوازیں گولیوں میں گونج میں دب کر رہ گئیں۔پھر ہماری پٹیاں کھول دی گئیں۔عین ہمارے سامنے شہزادوں کے لاشے پڑے تھے۔اگر اس وقت تک گویا خود ہم پتھر کے ہو چکے تھے۔آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھی۔مگر دل و دماغ ماؤٹ تھے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔چلو اچھا ہوا ان کی جان تو چھٹی۔ہم سے تو بھلے رہے۔آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔پھر وہی جرنیلی راج۔فوجی عدالت میں مقدمہ غداری،جلاوطنی کا حکم۔گویا ہمارا کہا ہم پر ہی نازل ہو گیا یعنی۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کیلئے

دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں

مرتو ہم اس روز گئے تھے جس روز دلی چھٹی، عمرعزیز؟ سمجھ میں نہیں آتا اس چار روزہ تماشے کیلئے، عمرعزیز، کی اصطلاح کس مسخرے نے گھڑی...... جو دن باقی رہ گئے تھے سواسیری میں کٹے ایک کونے میں ہم پڑے آہیں بھر رہے ہیں دوسرے میں نواب زینت محل سینے پرونے میں لگی ہیں۔ وہ بھی اب ایک دم سے بوڑھی ہو چکی ہیں۔ اگرچہ عمرعزیز کے ابھی چالیس سال سے زیادہ کیا پورے کئے ہوں گے ساٹھ ستر کی لگنے لگیں۔ بال سفید، دانت آدھے سے زیادہ غائب، چہرے پر جھریاں ہی جھریاں، آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے پر سینے پرونے سے باز نہیں رہتیں۔ آخر کریں بھی تو کیا کریں۔ زندگی کیلئے کوئی بہانہ، کوئی مشغلہ تو چاہئے۔ صبح، شام، رات، خدمتگار کھانا دے جاتا ہے مگر بھوک کس کمبخت کو ہے۔ بس یونہی نوالے دو نوالے لئے اور اللہ کا شکر ادا کر لیا۔

رات جب دنیا سوتی ہے میرا ذہن جاگ رہا ہوتا ہے برسوں کی یادیں آنے لگتی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے پرانی تصویریں پھرتی ہیں۔ ان میں سے اکثر گڈ مڈ اور مگر کچھ بالکل اس طرح روشن اور واضح جیسے کل کی بات ہو۔ قلعہ معلیٰ، حکم احسن اللہ خاں نواب زینت محل، الڑھ اور احمق شہزادے خاص طور پر ہمارے ہونے والے جانشین مرزا مغل سب کے سب گویا سامنے کھڑے ہیں، مگر ان سب نقوش، سب تصویروں پر اس سنی سنائی کا سایہ چھایا ہے جو ہم نے ان بھلے بانسوں کی زبانی سنی جو ہماری فاتحہ کیلئے آئے تھے۔ اور جس کا اشارہ ہمیں پہلے ہی حضرت نظام الدین کی طرف سے مل چکا تھا۔ یعنی تقسیم در تقسیم اب ہم لاکھ کوشش کریں لاکھ منتیں مانیں مگر وہ ہیں کہ روٹھے ہوئے ہیں۔ مجال ہے کہ ذرا بھی ٹس سے مس ہوں کہ وہ ہی سدا ہی سے ایسے ہیں۔ جمالی بھی اور جلالی بھی۔ عالم ارواں میں جب بھی آمنا سامنا ہوا تو اکثر گلاب کی طرح کھلے ہوتے ہیں بلکہ رنگ اور خوشبو میں اس سے بھی سوا مگر کبھی کیکر کی طرح خار دار۔ آنکھیں خشمگین اور شعلہ بار، غصے سے ہاتھوں کی مٹھیاں بند، ہرگز منہ نہ لگاتے۔ ہر چند کہ یہ کیفیت کبھی کبھی ہی ہوتی۔ مگر جب ہوتی تو پھر ان سے ہم کلامی تو دور، سلام کا جواب بھی صرف وعلیک...... کہہ کر ٹرخا دیتے۔ حد تو یہ ہے بیچارے خسرو سے بھی گھڑی دو گھڑی رخ موڑ لیتے۔ خسرو ان کی زندگی تھے۔ ان سے ناراضگی کی گھڑی دو

گھڑی ان پر بھاری تھی جب تک خود خسرو آ کر نہیں مناتے بھلا وہ کہاں راضی ہونے والے تھے۔

گذشتہ شب اسی طرح کروٹیں بدل رہا تھا۔تا ہم سخت پیچ و تاب کا عالم تھا۔آنکھ ذرا سی لگتی پھر کھل جای۔آخر لگ ہی گئی۔گھڑی دو گھڑی گزری ہو گی کہ حضرت نمودار ہوئے سراپا جلال۔دیکھتے ہی دیکھتے جیسے شل ہو کر رہ گیا۔یاالٰہی یہ ماجرہ کیا ہے۔بے چین تھا کہ حضرت سے کچھ پوچھوں پر ہمت نہیں پڑتی تھی اور وہ مجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھے جا رہے تھے جیسے پھانسی کا حکم سنانے والے ہوں۔زبان تو پہلے ہی میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔اب ہاتھ پاؤں بھی جواب دے گئے۔شش و پنج اور گومگو کی سی کیفیت اگر تھوڑی دیر جاری رہتی تو یقیناً وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

''کچھ خبر بھی ہے بسنت کی میاں سراج الدین؟'' وہ گرج بولے

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا گیا۔

''چار آدمیوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا ہے۔معاذ اللہ۔ہر چیز کی آخر ایک حد ہوتی ہے۔مگر اب تو پانی سر سے گزر چکا اور تقسیم کا منصوبہ کاغذ پر رقم ہو کر زمین پر خط تقسیم کی صورت میں مکمل ہونے والا ہے۔سمجھ گئے میاں سراج الدین۔بہادشاہ ظفر، صاحب عالم، شاہ شطرنج......''

میرا منہ یونہی کھلا کا کھلا رہ گیا۔گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔کانوں پر یقین نہیں آتا تھا حضرت تھے کہ لال آنکھوں سے گھورے جا رہے تھے۔روشن پیشانی پر اندھیرا۔جھریوں کا جال، سفید براق داڑھی پر پیلا ہٹ آ چکی تھی۔داڑھی کے نچلے حصے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔اس طرح جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔

''میں نے ہمت کی حضور؟''

ابھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ انتہائی زہر خند کے ساتھ بولے۔''فرمائیں ہم بھی تو سنی صاحب عالم محمد ابوظفر بہاد، بادشاہ ہندوستان اس بارے میں کیا سوچتے ہیں، کیا کر سکتے ہیں جی؟''

''حضورت تو گویا آخری فیصلہ ہو چکا......''

''جی ہاں، صاحب عالم، آخری فیصلہ ہو چکا ادھر ہندوستان کا آخری فیصلہ ہو چکا اور ادھر شہنشاہ ہند قبر میں پڑے میٹھی نیند سو رہے ہیں۔''

''میٹھی نیند، بھلا میں اور میٹھی نیند۔ حضور کو کون بتائے کہ راتیں کس طرح کروٹیں بدل بدل کر کاٹتا ہوں......'' بس اتنا کہا اور رک گیا کہ ایسے میں چپ ہی بھلی۔

پھر ایک دم سے حضور کے تیور بدلنے شروع ہو گئے۔ چہرہ خشمناک آنکھوں سے گویا انگارے برس رہے ہوں ہاتھوں کی مٹھّیاں کبھی کھلی کبھی بند، بالکل اسی طرح جس طرح میں نے خواب دیکھا تھا۔

''زمین کی تقسیم کریں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ آخر کو یہ سدا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ پورے ہندوستان میں سینکڑوں کے حساب سے راج دھانیاں ہیں، ریاستیں ہیں۔ جن کے اپنے اپنے راجہ، اپنے وزیر، اپنا اپنا سکہ، اپنا اپنا قانون، مگر بھائی یہ سب کی سب ہندوستان سے باہر تو نہیں، ادھر ہی ہیں، کیوں؟''

''بالکل اور جائیں گی کبھی کہاں''

''ٹھیک بولے، مگر جس انداز سے خط تقسیم کھینچا جا رہا ہے بلکہ سمجھ لو کہ کھینچا گیا۔ اس کا پیمانہ زمین نہیں لوگ ہیں ہمارے اپنے لوگ یعنی ایک طرف ہندو اور دوسری طرف مسلمان غضب خدا کا کہیں لوگ بھی بٹے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے بیزاری، منافرت، علیحدگی ایک بات ہے۔ گھر کی اور حویلی کی تقسیم ایک بات مگر پورے ملک کی تقسیم اور خود اپنے ہاتھوں، صرف ایک جنبش قلم سے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ قلم، سیاہی اور کاغذ سب کے سب بدیشی، قبالے پر دستخط بھی بدیشی حاکم کے، حکم بھی اس کا اور ہم محض اس کے دستخط اور حکم کی توثیق کے لئے رہ گئے ہیں.....'

''قلعہ معلیٰ کا کیا ہوگا۔ ہمارے جد امجد نصیر الدین ہمایوں نور اللہ مرقدہ کے مزار شریف کا کیا ہوگا۔ ہماری شاہ جہانی جامع مسجد کدھر جائے گی۔ دلی کے گلی، کوچوں کا کیا ہوگا۔''

''بہت خوب! اماں دلی بٹ گئی ملک تقسیم ہو گیا اور تم رہے وہی سراج الدین کے سراج الدین، بادشاہ نہ بن سکے اگرچہ سکہ تمہارے نام کا چلتا اور احکامات پر مہر تصدیق بھی تمہاری چلتی۔ مگر حکم کسی

اور کا ہوتا حاکم کوئی اور ہی ہوتا۔ بادشاہ قلعہ میں خود اپنے خاندان کی الجھی ڈور کو سلجھاتا اور اس کا سرا اسے نہیں ملتا اور باہر انگریز حکمرانی کرتا......''

میں حضور کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کیا، اضطراب کا عالم بیان سے باہر، مگر زبان نہیں کھلتی تھی۔

سنو میاں قلعہ معلیٰ اور جامع مسجد کی تو اور بات ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ ایسی اور بنالیں گے البتہ ہمایوں کے مقبرے کا کیا ہوگا، خود ہمارے مزاروں کا کیا ہوگا جو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلے ہوے ہیں۔ ان کی صورت ان میخوں کی سی ہے جن سے ہندوستان کی وحدوت جڑی ہے ان میخوں کو بس ذرا ڈھیلا کردو اور ہندوستان کی وحدت ختم۔

غضب خدا کا کیا گاندھی، کیا نہرو، کیا جناح، کیا تو، کیا میں۔ کسی بھلے مانس کو توفیق نہیں ہوئی کہ خود سے پوچھے کہ پٹڑے کی میخیں نکالنے کے ساتھ خود ہندوستان کا پڑا نہیں ہو جائے گا۔ وکیلوں، ججوں او حکام نے تو دنیا کا کام کرلیا مگر کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ بھائی دریا اور نہریں اور ان کا پانی ایک طرف، کھیت اور کھلیان اپنی اپنی جگہ انتہائی اہم۔ مگر ان سب کو توڑ کر بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مگر مزاروں کو تو نہیں ہلایا جاسکتا......''

واللہ ہم نے تو اس کے بارے میں ذرا بھی نہ سوچا تھا۔ حالانکہ سب سے پہلے ہمیں اس بارے میں سوچنا چاہئے تھا اگرچہ جلا وطنی کے بعد ہم خود حضور کی درگاہ سے اتنی دور ہو گئے تھے۔ تاہم عالم ارواح میں آنے کے رابطہ رہا۔ اس لئے دوری میں بھی حضور کی کیفیت رہی۔ ہونے کو تو نصیر الدین چراغ دلی سے بھی راہ تھی۔ مگر حضرت نظام کی بات ہی اور تھی۔ وہ نہ صرف دلی بلکہ پورے شمالی ہند کے مرجع خلایق تھے۔ ان کا جمال تو چھوٹے بڑے سب کیلئے تھا۔ مگر جلال بادشاہوں اور ان کی پوری بادشاہت کو بھسم کرسکتا تھا۔ غیاث الدین جیسے جلیل القدر سلطان نے انہیں چھیڑا۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ، ہنوز دلی دوراست، اور سلطان دلی پہنچنے سے پہلے ہی لقمہ اجل بن گیا۔ سچ یہ ہے کہ غیاث پور والوں کو کچھ بات ہی اور ہے۔ جلالی اور جمالی کا ایک سنگم، ایسا مل کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

''کھاں کھو گئے سراج الدین، تمھاری عقل میں بھی کچھ آیا؟''

''حضرت؟......''

اور بس یہیں پر زبان اٹک کر رہ گئی۔

حضرت پھر کڑک کر بولے

''میاں سراج الدین زمین پر ہمارا کچھ اختیار نہیں کہ تغیرات کے باوجود سدا سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ فاتحین آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ زمین جوں کی توں وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ ہندوستان کی زمین بھی سدا سے یونہی چلی آ رہی ہے۔ مگر خود ہندوستان یا اس پر زمین کا وہ حصہ جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں بہت پرانا نہیں۔ اس کی ڈور کا ایک سرا اکبر اعظم سے اور دوسرا محمد شہاب الدین شاہ جہاں سے ملتا ہے۔ ان کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ نری سیاست اومہم جوئی۔ اس کا اس ہندوستان سے شاید ہی کوئی تعلق ہو۔ اس تہذیب، زبان، فن، شاعری، موسیقی۔ دوسرے الفاظ میں اس تہذیبی وحدت کا، شاید ہی کوئی واسطہ ہو جسے ہم ہندوستان کہتے ہیں اس کا سہرا بھی صرف اور صرف ہمارے اسی ہم دم اور ہم نفس دیرینہ کے سر بندھا ہے۔ برملا کہتا ہوں کہ اگر خسرو نہ ہوتے تو وہ ہندوستان بھی نہیں ہوتا جسے ہم ہنادوستان کہتے ہیں۔ خسروں نے ہندوستان کو وہ سب کچھ دیا جس نے ہندوستان کو ہندوستان جنت نشان بنایا۔ کیا زبان کیا موسیقی کیا ساز کیا آواز کیا بولی ٹھولی، بھلا کونسی ایسی آواز ہے جو اس ایک خسرو نے ہندوستان کو نہیں دی۔

''اکبر بہر حال ایک بادشاہ تھا۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ۔ اس کے بس میں وہ سب کچھ تھا جو شہنشاہوں کے بس میں ہوتا ہے۔ اس نے نہ صرف خسروں کے ورثہ کو بچایا۔ بلکہ اسے اور فروغ دیا۔ حضرت سلیم چشتی کی دعا سے ان کے ہاں نورالدین پیدا ہوا اور انہیں کی دعاؤں اور کرامات سے اس کے دورہ کو وہ فروغ ملا، وہ ترقی عطا ہوئی کہ جس کی مثال اس کے بعد مشکل ہی سے ملے گی......کیا بات تھی خواجہ کی۔ یاروں کا یار دوستوں اور دشمنوں دونوں کا دوست......

''بہر حال اب ان سب کا ذکر ہی کیا جو گزر گیا سو گزر گیا۔ گزری کا رونا کیا۔ آنے والے آشوب کی فکر لازم کہ اس سے کس طرح نمٹا جائے۔ ملک کا بٹوارہ تو آج ہوا کہ کل ہوا تو اس پر تو ہمارا

بس نہیں کہ جس طرح روح کا بدن سے جدا ہوکر بدن سے کوئی واسطہ نہیں اسی طرح عالم ارواح کے مکینوں کا عالم فنا کے اعمال سے کوئی علاقہ نہیں تاوقتیکہ وہ عالم ارواں اوراس کے مکینوں کوخود نہ چھیڑنیں اوراب نہ صرف وہ ہمیں چھیڑ رہے ہیں بلکہ منہ چڑھا رہے ہیں۔ ہمارا سارا کیا دھرا ڈھکانے لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔لہٰذا ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا......''

میں خاموشی سے حضرت کی باتوں کوسنتا جارہا تھا۔ان کی باتون کی روانی ان کی دلی کیفیت کی غمازی کررہی تھی۔ باتوں کے ساتھ ان کے چہرے کا رنگ بدلتا جارہا تھا۔آنکھوں میں سرخی کی جگہ غروب آفتاب جیسا رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ جب دونوں وقت ملتے ہیں اوراندھیرا ہونے سے لمحہ بھر پہلے روشنی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔حضور چہرے پرغلبہ کی جگہ ایک ایسی کیفیت پیدا ہو چلی کہ جسے اضطراب سے زیادہ سختی کا ایک ایسا انداز قرار دیا جاسکتا ہے جوکسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ بولتے بولتے ایک دم سے خاموش ہوگئے آنکھوں کی پتلیاں پھرسی گئیں نظریں کہیں دورافق پرکھوسی گئیں میں نے بھی چپ سادھ لی کہ ایسے میں ذراسی لب کشائی بھی کمال گستاخی ہوتی۔ پھران کی نگاہیں گھوم گھام کرمجھ پرآ کرٹھر گئیں ۔چہرے پرنرمی اورہونٹوں پرہلکی سی مسکراہٹ کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔فرمایا:

''سراج الدین قبریں اگر بانٹ بھی لیں تو روحوں کوتونہیں بانٹا جاسکتا۔وہ توازلی بھی ہیں اورمتحرک بھی۔یہ لوگ لاکھ بٹوارہ کرلیں پروانہ راہ داری کا نفاذ کریں مگرروحوں کی نقل وحرکت کونہیں روک سکتے۔ہرچندکہ بٹوارے کے نتیجے میں جوفاصلے اوردوری پیدا ہورہی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اورقطعاً ناقابل برداشت اورناقابل قبول ہے۔بہرحال ہمارا اپنا سفر اپنا رابطہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ اوربڑھے گا۔

''لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے سب اوراگلے پچھلے ساتھیوں سے مشاورت کروں اوربندر بانٹ کا جویہ عمل ہورہا ہےاس کے بارے میں ان کی رائے معلوم کروں۔اس کے بارے میں اپنے پرانے رفیق قطب الدین اورنصیرالدین سے پہلے مشورہ کرچکا ہوں۔ان دونوں کی بھی وہی رائے ہے جومیری یعنی اب اوروقت ضائع کئے بغیر سارے اولیاء اللہ کے اجتماع کا بندوبست کیا

جائے۔ ہمارا ان سے صرف ایک ہی سوال ہوگا اور وہ یہ کہ سرزمین ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوستان کی تہذیب کو کیسے بچایا جائے۔ نیز یہ جوان گنت لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں خدا کے نیک بندے ہماری قبروں پر فاتحہ خوانی، گریہ وزاری اور منتیں ماننے جوق در جوق چلے آتے ہیں تو کم از کم انہیں تو یہی گمان بلکہ یقین ہے کہ ہم نہ صرف زندہ ہیں بلکہ پوری طرح فعال اور متحرک بھی اور اس بات کی مکمل اہلیت رکھتے ہیں کہ ان کے دل کی مرادیں پوری کریں اور اللہ کے فضل و کرم سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ حاضرین کی مرادیں برآتی ہیں اور وہ ہمارے مزاروں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ باہر لنگر میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

''اب ہمیں خود یہ کر کے دکھانا ہوگا کہ ہماری نیند ابدی نہیں بلکہ پوری طرح بیدار ہیں، اور عالم خواب میں ہماری دونوں آنکھیں کھلی ہیں۔ ہمارا پنجر البتہ قبر میں دفن ہے۔ مگر ہماری روحیں بیدار اور ہر اس جگہ موجود ہیں، جہاں، جہاں ان کی ضرورت ہے۔ کیوں؟ اس بارے میں تمہاری اپنی رائے کیا ہے، سراج الدین......

''حضرت کیا میں اور کیا میری رائے۔ بھلا میری کیا مجال جو چوں بھی کر سکوں۔ من آنم کہ من دانم''

''بس، بس یہی تو تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے یہ فارسی کہاں سے سیکھ لی تم نے؟ اپنی سیدھی سادھی بولی میں بات کیوں نہیں کرتے......''

حضرت قدرے برہم ہو کر بولے جلال نے ایک بار پھر جمال کی جگہ لے لی میری تو زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی اور نگاہیں نیچی۔

دیکھو میاں سراج الدین کان کھول کر سن لو اس پوری کارروائی، پورے عمل میں تمہارا اہم ترین حصہ ہوگا ہمارے نزدیک تم ہنوز ہندوستان کے بادشاہ نہ ہوا اور اس تہذیب کے محافظ اور علم بردار جیسے ہندوستان تہذیب کہا جاتا ہے''

یہ فقیر اور ہندوستان کا بادشاہ......''

ہاں ہاں ایک بار تو کہہ دیا اور آج بلکہ اس لمحے سے اپنے آپ کو فقیر کہنا چھوڑ دو۔ تمہاری اس

فقریی ہی نے مغلیہ جاہ وجلال کو ڈبو کر رکھ دیا۔قلعہ،یعینی اپنے قلعہ معلیٰ کو سارا جہاں سمجھا اور وہیں مقید ہوکر بیٹھے رہے لاحول ولا،کہیں بادشاہی کے بھی یہ انداز ہوتے ہیں؟

میں خاموشی سے نگاہی نیچی کئے ان کا کہا سنتا رہا۔

دیکھو،فیصلہ سب کا متفقہ ہی ہوگا یہ تو صرف میری اپنی رائے ہے قطب الدین اور نصیرالدین کا اس پر مکمل اتفاق ہے ،باقی مشاورت کے بعد جو بھی سب کا فیصلہ ہوگا اس کے مطابق عمل بھی......

حضرت آخر بندے کو کیا کرنا ہوگا''میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا......تاج پوشی میرے بس کی بات نہیں۔خلعت شاہانہ سے میں بالکل بیگانہ اور بیزار،رہے آداب شاہی سو بندے کو پہلے ہی ان سے کیا واسطہ جو آئندہ ہوگا۔

رہے وہی بدنصیب کے بدنصیب ظفر صاحب عالم میری مراد ہرگز تاج پوشی ،خلعت شاہانہ اور آدب اشہی سے نہیں بلکہ صحیح معنوں میں حکمرانی سے ہے اور وہ بھی لوگوں کے دل ودماغ پر کہ اس میں تم پہلے بھی ناکامیاب نہیں تھے برے دنوں میں بھی لوگوں کے دلوں پر تمہارا حکمرانی البتہ تھی۔میگر کیا ان کے دماغ پر بھی تمہارا سکہ چلتا تھا؟

دماغ،کیسا دماخ کس کا دماغ کیسی باتیں کر رہے ہیں حضور''اس کے ساتھ پھر وہی مرزا نوشہ زبان پر آ گئے

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

(یہ مرزا نوشہ پتہ نہیں کہاں سے آ ٹپکتے ہیں مان نہ مان میں تیرا مہمان)

میں تو یونہی ذرا کی ذرا اپنی خام خیال میں گم ہو چلا تھا کہ حضرت پھر گویا ہوئے مگر اس بار ان کی آواز میں قدرے نرمی تھی لہجہ ایک ایسے استدا کا سا تھا جع ابھی تک اپنے نالائق شاگرد سے بالکل مایوس نہ ہوا ہو۔

میاں ظفر خود ہی سوچو جس ملک کا بادشاہ خود اپنے آپ کو کم نصیب اور بے گھر سمجھے اور اعلانہ اس کا اعتراف بھی کرتا پھر اس کی رعیت کیسے خوش نصیب اور خوشال ہوسکتی ہے تم نے

شاہی میں فقیری کی اچھا نہیں کیا کہ فقیری کا قیام الگ اور بادشاہی کا درجہ الگ کیوں؟

میں اسی طرح نگاہیں نیچے کئے خاموش رہا۔

تم مانو یا نہ مانو مگر سچ پوچھو تو تمہاری فقیری بھی فقیری نہیں بلکہ انہائی کم ہمتی اور کمزوری پر دآل تھی ۔ اگر فقیری کا ایسا ہی شوق تھا تو مہاتما بدھ کی طرح قلعہ چھوڑ کر گیان دھیان کیلئے تلاش حق میں جنگلوں کا راستہ لیتے یہ کا کہ بڑے محلوں میں اور جھونپڑیوں کے خواب ۔ ہاتھی کی سواری بھی جاری ہے زینت محل سے شادی بھی رچائی جارہی ہے خلعت شاہی بھی زیب تن ہے ڈربار داری بھی جاری ہے ہر قسم کا شاہانہ تکلف روا مگر بادشاہی کا اعتراف کرنے کی بجائے آج تک فقیری کا دعوےٰ کئے جاتے ہیں۔ بھلا ہر بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

حضور کی باتیں تیر ونشتر کی طرح دل میں اترتی جارہی تھیں ۔فقیری کا میں کبھی دعوی دار ہیں رہا شاعر میں البتہ اس کا ذکر ہوا سو میاں شاعر ایک طرف اور شاہ ایک طرف خدا گواہ ہے میری زندگی میں منافقت کا کوئی شائبہ تک نہیں میں نے جو کچھ بھی کیا اور کہا مقدور بھر سچ کہا اور کیا ویسے بندہ بشر ہے۔خطا کار، گنہگار جو گناہ باہر نہیں ہو پا تا وہ دل کے اندر ہی اندر سر زد ہو جاتا ہے اور اندر کا حال تو بس اللہ کو ہی معلوم ہے۔

حضرت پھر گویا ہوئے سراج الدین ماضی میں تم نے شاہی میں گدائی کی ۔ بھلا کونسا ہے وہ تمہارا اپنا شعر ہے۔کلام الملوک ملوک الکلام ہاں یاد آیا یہی ہے نا!

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا

یا میرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اگر چہ شعر اپنی جگہ پر برا نہیں مگر جکہیں بادشاہوں کے یہ تیور ہوتے ہیں کہیں حکومتیں اس طرح کی جاتی ہیں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمہاری یہ شاعری نہیں ہوتی تو فصیل کے باہر ہی انگریز کی فوج ہتھیار ڈال دیتی اور پہاڑی سے منہ جھکائے جھکائے تم سے پناہ مانگنے قلعہ کا رخ کرتی ، خیر جو بیت گئی سو بیت گئی اب تمہیں گدائی میں شاہی کرنا ہوگی بس اس کیلئے کمر بستہ ہو جاؤ۔ایک بات کان کھول کر سن لو ورا چھی طرح سمجھ لو اور وہ یہ کہ اگر اب بھی تم نے فقیری کی

بموجب سرکاری یعین حضرت نظام الدین بادشاہی کا تہیہ کئے بیٹھا تھا مگر بھائی بھلا ناخن بھی کبھی ماس س یجدا ہوہئے ہیں پرانی ال ہے کسی نہ کسی بہانے پلٹ اتی ہے

مرزا تو صرف ہمارا ایک مصرعہ دہرا کر چلے گئے یعنی

واں کے جانے سے مری توقیر اندھی رہ گئی

خود اپنی مگر زبان پر تو بار بار یہی آتا تھا کہ

بعدمرنے کے میری وقیر آدھی رہ گئی

اماں، لاحول ولا یاد نہیں رہا یہ بعدمرنے کے میری توقیر آدمی رہ گئی، والا مصرعہ کہاں پڑھا تھا۔شعر تو پورا یاد آ گیا مگر یہ یاد نہیڈں رہا کہ تھا کس کا۔کسی بگڑے استاد کا ہی ہوعگا سوچتے ہی ایک دم سے ہنسیآ گئی شعر کچھ اس طرح کا تھا۔

میری تربیت پر لگایا نیم کا اس نے درخت

بعدمرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی

نری ضلع جگت شاعری تو کسی طور نہیں بہرحال جن کا کلام ہے اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے آمین، ثم آمین!

لاہر نکلنے سے پہلے سوچا کیوں نہ ایک بارفقلعے کا چکر لگا ئیں ۔ چاندنی چوک پر نظر ڈالیں ذرا معلوم تو ہو کہ اب وہاں کیا ہورہا ہے ۔لہٰذا السلام علیکم یا اہل قبور کہا او شہر کا رخ کیا۔قلعہ آباد،فوجیوں سے پٹا پڑا تھا، چوک اور بازار البتہ ویران ۔ایک سرے سے دوسرے تک فوج ہی فوج پڑی تھی ۔ معلوم ہورہا تھا کہ جیسے جرنیلی راج لگ گیا ہے سڑک اینٹ اور پتھروں سے پٹی پڑی تھی ۔ایک خاص قسم کا بدبودار دھواں جگہ جگہ سے اٹھ رہا تھا۔آنکھوں میں مرچیں سی لگیں، پانی آ گیا۔

لوصاحب تو جشن آزادی ختم ہوا۔ پہلے عقل پر پتھر پڑے پھر بازار میں پتھراؤ، ہلڑبازی، دنگا فساد۔نوبت گولی تک پہنچی ،بلیماروں کی نکڑ سے گزرے ۔اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی ۔سامنے فتحپوری کی مجسد ہیں ۔ جامع مسجد کی طرح ویران، البتہ مسجد کے اندر لوگوں کا ایک خاصہ بڑا اجتماع

دکھائی دیا۔ بہت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے نمازی تو کیا ہوں گے۔ صبح کے گیارہ بارہ بجے بھلا کونسی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ باہر بازار کی مارا ماری سے بھاگ کر اللہ کے گھر پناہ لینے آ گئے ہوں گے اللہ ان کے حال پر رحم کرے۔ دلی والوں پر کیا اسی طرح قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہے گی ان کے حق میں بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اب لاہور کا رخ ہے۔ نصیرالدین وہاں پہلے ہی حضرت ہجویری کے دربار میں موجود تھے ہمارا لاہرو جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں والوں سے واسطہ رہا۔ رہے حضرت علی ہجویری۔ جنہیں لاہرو والے داتا گنج بخش کہتے ہیںؒ۔ ان کی کرامات تو ہم نے بھی سنی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اب دیدار بھی ہو جائے گا۔

تیسرا باب

لاہور

داتا کی نگری

لیجئے صاحب لاہور روانہ ہوئے۔ راستہ میں جو نقشہ دیکھا تو چاندنی چوک کو بھول گیا کہ چاندنی چوک چاہے کتنا بڑا سہی بہرحال ایک بازار تھا۔ اس کے بیچ جو کچھ بھی ہوتے دیکھا ایک محدود جگہ پر تھا مگر یہاں تو ماجرہ ہی اور تھا۔ پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اللہ میاں کی اتنی بڑی مخلوق آخر کہاں سے امڈ آئی۔ میلوں تک بس سر ہی سر نظر آتے تھے۔ بوڑھے اور جواز مرد و زن بچوں کی انگلیاں تھامے، کاندھوں اور گود میں اٹھائے چلے جارہے ہیں۔ بہتوں کے سر پر باندھ کی چارپائیاں تھیں اور اس پر کل اثاث البیت کچھ اتنے بوڑھے لاغر اور آفت زدہ کہ دو قدم اٹھانے سے بھی مجبور۔ بیل گاڑیوں میں بیٹھے، گدھوں پر سوار ہائے ہائے کرتے، دھاڑیں مارتے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چلے آرہے ہیں۔

اتنے میں گھڑ سواروں کا ایک غول آیا۔ ہاتھوں میں ننگی تلواریں لہراتے اور دل دہلا دینے والے نعرے لگاتے سرپٹ چلے آرہے ہیں۔ راستے میں جو بھی آتا ہے کچلا جاتا ہے، جس کا سر ذرا بھی اٹھا وہیں بھٹے کی طرح اڑا دیا گیا۔ یادش بخیر، بے اختیار میر تقی میر کا وہ شعر یاد آ گیا

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
بیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

یوں لگا کہ جیسے میر صاحب نے پہلے اس ہولنا منظر کو دیکھا اور پھر یہ سعر کہا۔ پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے صرف دو مصرعوں میں۔

راستے میں بوعلی قلندر کا مزار شریف پڑتا تھا۔ ان کا ایک شعر ہم نے بھی سنا تھا اور جب سے قلعہ میں رہتے ہئے بھی تاج اور تخت سے عملاً کنارہ کرلیا تھا۔ وہ بار بار ہماری زبان پرآتا خود کو مٹانے کو جی چاہتا۔ مگر اتنا حوصلہ ہی کہاں تھا اس دل داغدار میں۔ بوعلی قلندر صاحب کا شعر کچھ اس طرح ہے۔

وصال دوست طلب می کنی زخود بگذر

کہ درمیان تو، واو بجز تو حائل نیست

اس تو، تو میں، میں نے ہی تو ہمیں مارڈالا۔ انگریز کیسی ہوشیاری کیسے تدبر سے تجارت کی آڑ میں پورے ہندوستان پرابض ہوگیا اور ہم قلعی معلیٰ میں پڑے پڑے ایک دوسرے کی ایسی تیسی کرتے رہے۔ جب اپنے ہی فیل اور گھوڑے اپنے خلاف ہوجائیں، اپنے ہی پیادہ شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو پھر بازی تو گویا شروع ہونے سے پہلے ہی قٹ کر رہ گئی۔

حضر بوعلی قلندر صاحب کی درگاہ پہنچے تو دیکھا کہ درگاہ کا صحن خلق خدا سے پٹا پڑا ہے۔ پریشان حالی کی جیتی جاگتی تصویریں، ننگے سر اور لگ بھگ ننگے بدن، عورتوں کے پاس سینہ ڈھانپنے کے واسطے بھی کچھ نہ تھا دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یاالٰہی یہ کسی بستی کے رہنے والے ہیں۔ کہاںؒ سے آئے ہیں۔ کدھر کا رخ ہے ضرور کسی بدنصیب بادشاہ کی رعیت ہوں گے اور وہ بدنصیب بادشاہ ہمارے علاوہ بھلا اور ہو بھی کون سکتا تھا، ضرور یہ بھی وہیہ بے گھر اور بے آسرا لوگ ہوں گے جو پناہ کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے بوعلی کے آستانہ مبارک تک پہنچ سکے اور وہیں پناہ گیر ہوئے اللہ ان کے اور ہم سب کیحال پر رحم فرمائے۔ آمین!

فاتحہ کیلئے مرقد مبارک پر حاضر ہوا۔ وہاں دو چار مجاور بیٹھے تسبیح کے دانے پھیرتے جاتے اور زیر لب آیات کا ورد کرتے جاتے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر ہمیں بیک وقت رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔ کیسی مجبوری اور بے بسی کا عالم تھا۔ ادھر درگاہ شریف کے باہر گویا کربلا کا سماں تھا۔ ادھر یہ

بیٹھے الٹی سیدھی تسبیح پھیر رہے ہیں عمل کی قوت اور حوصلہ تو گویا ان میں بالکل ختم ہوکر رہ گیا ہے۔

فاتحہ سے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ بوعلی کی شبیہ مبارک نظر آئی۔شان تو ان کی قلندرانہ تھی۔وہی بردباری اور بے نیازی کی۔مگر روئے مبارک پر گہری سوچ بلکہ پریشانی کے آثار صاف عیاں تھے میں نے سلام کیا تو ہلکی آواز میں بلکہ صرف ایک جنبش لب سے اس کا جواب دیا اور پھر جیسے گم ہو گئے۔

میں نظریں نیچے کئے دست بستہ کھڑا رہا۔پھر خود ہی کچھ اس طرح گویا ہوئے۔

''سراج الدین راستے میں، میں نے تو بہت کچھ دیکھا ہوگا۔کیا خیال ہے؟ کیسی گزری تمہارے دل پر؟

ایک آہ سرد کے علاوہ ہمارے پاس بھلا اور رکھا بھی کیا تھا۔

حضور کے چہرے پر ایک قسم کی سختی سی آ گئی۔

سراج الدین،اب تم صاحب عالم ہو،جو فرض تمہیں سونپا گیا ہے اسے تمہیں ہر حالت میں نبھانا ہوگا اور آہ سرد کی جگہ پوری ہمت اور عزم سے کام لینا ہوگا۔مجھے نظام الدین نے از خود سب کچھ بتا دیا ہے۔وہ جو بھی فرماتے ہیں بالکل ٹھیک ارو بروقت،زمین کی تقسیم پر خط تنسیخ کھینچنا ناممکن ہوگا،جب ایک ہی گھر،ایک ہی حویلی کے مکینوں کا ساتھ ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے تو بیچ والی دیوار میں دروازے کی بجائے تیغہ کھینچنا ہی بہتر ہوگا۔

زمین کی رواہ سے زیادہ ہمیں اس مقدس ورثے اور عظیم تہذیب کی ہے جو ہمارے پرکھوں سے ملی ہے اور جس کے بغیر ہندوستان،ہندستان نہیں بلکہ گویا اس تہذیب کا قبرستان بن جائے گا جس کے بل پر ہم آج تک مر کر بھی زندہ ہیں او رتا قیامت زندہ رہیں گے۔عالم ارواح میں ہوتے ہوئے بھی ہمارا عالم خاکی سے پورا واسطہ رہے گا اور فرض کی ادائیگی کیلئے نظام الدین نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور تم پورے ہندوستان کے آخری مورث اعلیٰ اور تاجدار ہو۔ہر چند کے حکومت انگریز ہی کی تھی اور تمہاری حیثیت خود اپنے گھر،اپنے قلعے میں زندانی سے زیادہ نہیں تھی۔مگر دستاویزات پر مہر تصدیق تمہاری ثبت ہونی تھی،سکہ اور خطبہ تمہارے ہی نام پر تھا''

میں سر جھکائے حضور کا کہا سنتا رہا۔سو بات اب بوعلی تک پہنچ چکی تھی۔اس انکشاف سے میرا حوصلہ بھی بڑھا۔ پیچھے ہٹنے کا اب سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا۔قدم اٹھایا ہے تو انشاءاللہ آگے بڑھتا ہی رہے گا۔

بوعلی قلندر نے قریب آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

ہمت مرداں مدد خدا خ شاہی میں فقیری تو بہتر کر چکے افقیروں میں قلندر بن کر دکھاؤ۔قلندر کو غلط مت سمجھوں کہ وہ ہتھیلی پر سر رکھ کر چلتا ہے۔تم نے سرمد کو دیکھا وہ تو بالکل تمہاری بغل میں ہیں۔اپنا کٹا ہوا سر لے کر ننگ دھڑنگ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے دشمنوڑں کو للکارتے رہے۔

منصور الحلاج کو دیکھا کہ صرف دولفظوں سے پوری سلطنت عباسیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔انہوں نے اان الحق ،کا نعرہ بلند کیا ۔جس کے جو منہ میں آیا ان کے خلاف کہہ ڈالا۔کفر کا الزام لگا اور جرم ثابت ہونے سے پہلے سولی پر چڑھا دیا گیا۔''

میں ہمت کر کے ان بے آسرا اور بے گھر لوگوں کے متعقل پوچھا جن سے درگاہ کا صظحن پٹ پڑا تھا۔فرمایا یہی قسمت کے مارے ہیں گھر بیٹھے بیٹھے نرغے میں آ گئے۔ بھلا ان بے چاروڑں کا بٹوارے سے کیا واسطہ۔ یہ یونہی گویا ہاتھی کی جولان گاہ کے بیچ آ کر روندے گئے۔پھر ذرا سا وقفہ دے کر فرمایا تم ان ک فکر بھلے مت کرو۔

انہیں ہم دیکھ لیں گے۔لاہور جاؤ اور دیکھوں وہاں کیا ہو رہا ہے۔علی ہجویری کے حضور حاضر ہونا ،نصیر الدین ابھی تک وہیں ہوں گے۔ان کی خدمت میں میرا بہت بہت سلام پیش کرنا ،ہم تو قلندر ہو کر بھی اس مقام کو چھو تک نہیں پائے۔ جہاں ہجویری کھڑے ہیں وہ بیک وقت قلندر بھی ہیں اور عالم بھی۔صاحب کمال بھی ہیں اور صاحب جمال بھی۔ان کی ذات مجموعہ صفات ہے۔گنج بش اس لئے کہلائے گئے کہ گنجینہ معرفت ہیں۔دین اوک ردنیا دونوں ان کی ذات والا صظفات میں کچھ سا طرح جذب ہو گئے ہیں کہ دنیا والے اپنا سمجھ کر ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں اور فرشتے سلام کرتے ہیں۔کیا کہنے ہیں ان کی ذات والا صفات کے۔

میں نے بوعلی پیشانی کو بوسہ دیا۔ان کے دست مبارک اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر

چوما۔ان کے لمس میں ایک عجیب سی روتھی عجیب سی حرارت تھی ارو مجھے یوں لگا جیسے زاندگی کی پوری توانائی میرے وجود میں سرائیت کرگئی ہوں۔ پھرانہوں نے مجھے گلے لگایا، میری پیشانی کو بوسہ دیا، اورزیرلب کچھ پڑھ کر مجھ پر دم کر کے فرمایا۔

تو جکاؤ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ ہندوستان بلکہ پاکستان کے تمام اولیاء اللہ تمہارے ساتھ ہیں ان کی دعائیں تمہارے حق میں ہیں۔ وہ منزل جو ہم سب کی ہے وہ ہمیں البتہ ملے گی، انشاءاللہ۔ فی الحال ان بندگان خدا کی فکر کرو جو بے گھر اور بے آسرا ہوکر عافیت کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جن کی گردنوں پر خود اپنے بھائیوں کی تلواریں مسلط ہیں“

اتنا کہا اور پھر فضا میں تحلیل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں اپنے باقی سفر پر روانہ ہوا۔

تمام راستے وہی قیامت کا منظر تھا۔ وہی لٹے ہوئے انسانوں کے قافے، کہیں لاشوں کے ڈھیر کہیں زخمیوں کی پکار ۔کہیں عورتوں کی آہ و بکا کہیں چھوٹے معصوم بچوں کا رونا دھونا اچانک پیدل یا گھڑسوار، ہتھیار بند، درندہ نما انسانوں کے جتھے آتے اور ایک دم سے بکھرے قافلوں پر ٹوٹ پڑتے، لاٹھی حتیٰ کہ تڑاتڑ گولیاں تک چلتیں کتنے ہی وہیں کے وہیں ڈھیر ہوجاتے۔ کتنے ہی زخمی اور گھائل ہوکر دھڑام سے گرکر سسکنے لگتے اور آہ بکا کرتے۔ پانی کی ایک بوند کیلئے التجا کرتے شیر خوار بچے مردہ یا زخمی ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے چپکے چس چس کرتے آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں دیکھا نہ جاتا تھا۔

زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا کہ بیک وقت دو جھنڈے نظر آئے ایک تو وہی جو قلعہ معلیٰ کے صدر دروازے پر دیکھا تھا۔ تین رنگوں والا، دوسرا نیا تھا۔ سبز زمین پر چاند تارہ بنا ہوا تھا۔ جھجنڈوں کے درمیان بس گزوں کا فاصلہ ہوگا۔ جھنڈوں تلے فوج کے سپاہی کھڑے تھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے ہیں، اور بیچ میں ایک سپاٹ سا میدان، نہ دریا نہ پہاڑ۔ بھلا کسی قسم کی سرحد تھی۔ ہمیں تو زمین پر کھینچی کوئی لکیر بھی نظر نہیں آئی۔ ے

طرفہ تماشہ یہ تھا کہ انسانوں کا وہ ریلا جو ایک طرف سے دوسری طف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ سو

ہم نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ سرحد پار کرتے ہیں یعنی ایک جھنڈے کے سائے سے نکل کر دوسرے جھنڈے کے سائلے تے آتے ہیں زمبین بوس ہوکر یا لڑکھا کے گر کر بے اختیار اپنے جھنڈے تلے دھول کو اپنے منہ اور آنکھوں میں ڈال دھاڑیوں مار رہے ہیں لو صاحب انہوں نے اپنی منزل پالی۔ ہندوستان یعینی مشرق کی طرف سے آنے والوں کا مغرفب کی طرف سے آنے والوں کے مقابلے میں واضح طور پر زیادہ تھا۔اب حال کچھ اس طرح ہوا کہ دونوں جھنڈوں تلے لوگ یا اس طرح بے سدھ پڑے ہیں گویا آخری سانسوں پر ہوں یا پھر ایسے نڈھال کہ ہلنے کی طاقت نہیں یا پھر وہی دیر نہیں،حرم نہیں، درنہیں،آذستاں نہیں، کی تصویریں بنے دھاڑیں مار رہے ہیں۔

کمال ہے،منزل بھی ملی تو ایسی ملی کہ جہاں خوشی اور اطمینان کی بجائے،زخمی جچانورں کی طرح لوٹ رہے ہیں۔سر جھاڑ منہ پہاڑ۔اللہ میاں ان کے حال پر رحم کرے۔

سبز چاند ستارے والے جھنڈوں سے گزرے تو وہاں نسبتاً سکون کی سی فضا پائی ایک وسیع وعریض پکے فرش پ لوگ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑے ہیں۔تاہم ان میں زندگی کے آثار تھے اور زندہ رنے کا سامان بھی۔ عورتیں ہنڈیا چو تھے میں مصروف، بچے کھیل رہے تھے۔چار بانسوں پر چادریں ڈال کر خیمے سے بنائے گئے تھے۔خیموں کے باہر مرد پڑے گویا اینڈھ رہے تھے اسکے علاوہ اور کرنے کو تھا بھی کیا۔نہ رزق نہ موت، نہ آگا نہ پیچھا۔

لاہرو سے ہمیں زیادہ اقفت نہ تھی۔شاید ہی کبھی ادھر کا رخ بھی کیا ہو۔ہنسی کی ہنسی،غم کا غم۔ذرا غور کریں کہ شہنشاہ ہند ہوتے ہوئے بھی اور دلی سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی شاید ہی کبھی لاہرو کا منہ دیکھا ہو۔انارکالی بازار کی شہرس تنی تھی ۔اتنا معلوم تھا کہ حضرت نورالدین جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے مقبرے ادھر ہیں۔شاہی مسجد اور اکبر اعظم کا قلعہ بھی ادھر ہی ہے شالیمار باغ بھی۔رہا حضرت سید علی ہجویری کا تو ان کی،خدمت اقدمس میں حاضر ہونے ہی کو آئے تھے۔ایک اور بزرگ حضرت مادھول لال حسین صاحت کے بارے میں بھی سنا تھا کہ وہ بھی ادھر ہی اپنی ابدی آرامگاہ میں ہیں۔مادھلو لال حسین عجیب سا نام تھا گنا جمنی نام بہت اچھا لگا۔

آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ لاہور شہری حدود میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی حالت دلی کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی سناٹا سا ضرور تھا دکانیں آدھی بنی اور آدھی کھلی آنے جانے والے کم ہی دکھئی دیتے تھے پھر بھی امن تھا۔ خوبصورت شہر تھا۔ صاف ستھری کھلی کھلی سڑکیں۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہوا میں بھی تازگی دلی والی گھٹن ذرا بھر نہ تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ بھی کبھی ہماری سلطنت کا حصہ تھا دلی اور آگرے کے بعد لاہرو ہی کا نام آتا تھا۔ جو جو آثار ہمارے اپنے بزرگوں نے دلی اور آگرے میں چھوڑے کم و بیش وہ لاہر میں بھی، تاج محل کا تو خیر کہنا ہی کیا (یاد نہیں پڑتا کہ کھلی آنکھ سے کبھی تاج محل بھی دیکھا ہو گویا بادشاہ عالم از دلی تا پالم والی پھبتی ہم پر بالکل صحیح بیٹھتی تھی) کہ یگانہ روزگار تھا باقی لال قلعے کے مقابلے میں قلعہ لاہرو، جامع مسجد کے مقابلے میں لاہر کی شاہی مسجد بھلا کونسی ایسی جگہ جو دلی میں تھی اور لاہرو میں نہ تھی۔

پھر گویا سارا شہر لاہر ہمارے سامنے تھا۔ انار کلی اور چاندنی چوک یک سڑک کے مقابلے میں کافی چھوٹی تھی۔ ذرا بلندی سے ادھر الدھر نگاہی دوڑائیں تو چاروں طرف اپنی تاریخ کے اوراق کھلے پڑے تھے۔ قلعہ، مسجد، باغ ان سب ک دیکھ کر دل کو یک گونہ تسلی سی ہئوی کہ چلو دلی گئی سو گئی کم از کم لاہور تو اپنی طرف آ گیا۔ پھر اچانک خود ہی سوچ میں پڑ گئے کہ بمبئ یہ اپنی اوران یک طرف سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا مطلب ہے، ہندوستان جس کے چاروں کونے ہمارے یعنی ہم سب کے ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان۔ ہمیں تو ہولی پر رنگ کھیلنے اور دشہرے اور دیوالی پر ماتھے پر تلک لگانے پر کوئی عار نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہمارے تھے۔ خدا گواہ ہے جو ہم نے ان میں کوئی فرق برتا ہو دونوں ہی ہماری آنکھوں کے تارے تھے دونوں ہی کو ہم سینے سے لگاتے اور اب نوبت اینجا رسید کہ اپنی طرف اور انی طرف کی بات چل نکلی ہے۔

پھر ایک دم سے ہلڑ ہنگامے کی آوزیں آنا شروع ہوئیں۔ اتنی ہی بھیانک اور وحشت ناک جیسی دلی اور دلی سے لاہکر ک تک کی اپنی پوری مسافت کے دوران سنی تھیں وہی چیخ و پکار وہی بھگدڑ، جگہ جگہ سے آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں کسی کے ہاتھ میں لاٹھی، کسی کے ہاتھ میں چھرا، ہتھیار بند نہتوں کا اس طرح پیچھا کر رہے ہیں، جیسے خوانخوار شکاری اپنے شکار کا۔ دل دہل کر رہ

گیایاالٰہی یہ ماجرہ کیاہے۔ باہم یمشورے اوراتفاق رائے سے بٹواہواہے ذ دونوں نے قبالوں کی اپنی اپنی نقول پر دستخط کئے ہیں پھر یہ مارا ماری کیوں پھر یہ خون کی ارزنی کیوں؟

ہماری تو خاک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر جو کچھ بھی ہورہاہے، کیوں ہورہاہےاوراس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ دلی لٹی تو خیرلٹی کہ اس کا تو مقدرہی یوں چلا آرہاہے غیروں سے بھی کہیں زیادہ اپنوں نے اسے تاراج کیا۔اس کے باسیوں کو لوٹا قتل عام کاحکم صادرکیا۔ دلی کے سر پرتو سداہی سے گزرتی آئی سوگزرتی رہے گی مگرلاہرکوکیا ہوگیاہے۔ادھرمسلمانوں کی اکثریت ہندووٴں یک اقلیت کا گلا کاٹ رہی ہے۔ادھرتعداد میں کہیں زیادڑہ ہندو، تعداد میں کہیں کم مسلمانوں کے در پر آزار ہیں۔ واللہ ہمیں تو کبھی اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوا کہ تعداد میں کون زیادہ اورکون کم ہے۔ ورنہ خیر ہماری تو اوقات ہی کیا۔ اگرشاہ جہاں اوران کے بیٹے اور جانشین حضرت محی الدین اورنگزیب چاہتے تو کیا ان میں یہ قدرت نہیں تھی کہ و ہآبادی کا توازن مسلمانوں کی حق میں کردیتے بھلا انہیں روکھنے والا کون تھا اگر وہ چاہتے تو ہندوستان کا نام بدل کر ترکمانستان، اسلامستان رکھ سکتے تھےمگر تاریخ گواہ ہےانہوں نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں وہ تو ادھرآئے اورادھرکے ہوکررہ گئے۔

حضرت اورنگزیب عالمگیرکو لاکھ کٹر متعصب لکھیں مگر کیا کبھی انہوں نے اپنی ہندو رعایا کے دین پر ہاتھ ڈالا؟ کیا انہوں نے وہ سب کچھ کیا جوآئندہ آنے والے عیسائی پادریوں نے کیا؟ بھلے اکبراعظم کی طرح حضرت اورنگزیب کا مسلک صلح کل کا کیوں نہ ہو۔انہوں نے ہندومت پر ہاتھ نہیں ڈالا عملاً وہ بھی بامسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام کے مسلک پرقائم رہے۔

ہم نے بھی اتنے برسوں تاج اورتخت کی ریت کونبھایا۔مگر نہ صرف یہ کہ کبھی ہندوکو ہندو نہیں سمجھا بلکہ بحمداللہ مسلمان رہتے ہوئے بھی، بول چال، رسم ورواج میں پورے ہندوستانی بن گئے۔حتیٰ کہ اگرآج ہم اپنے عظیم اسلاف کے دیس میں جائیں، سمرقنداور بخارا میں جاکرتکیہ کریں تو بھلا ہمیں کون پہچانے گا کون کہے گا کہ ہم اس تیموراروبابرکی اولاد ہیں جو آندھی کی طرح اپنے ملک سے نکلےاور برسات کی گھنگھورگھٹاوٴں کی طرح پورے ہندوستان پر چھاگئے۔

جنگ وجدل کی خونریزی کی بات اور ہے کہ جنگ وجدل کا نام ہی خونریزی کا ہے۔ مگر اس کے بعد ہماری افواج کے ہاتھوں کتنے ہندو بھائی قتل ہوئے۔ کتنے گھر سے بے گھر ہوئے۔ جتنوں کے گھر لٹے۔ خود ہمیں دیکھ لو مرتے دم تک ہندو ساہوکاروں کے مقروض رہے تو کیوں بھائی ہم نے اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی۔ ہمارے ہاتھ میں تو تلوار تھی کہ قرض مانگنے کی بجائے بادشاہی کا ڈنڈ مانگتے۔ رعیت کے مال کو اپنا مال سمجھ کر بحق سرکار ضبطی کا حکم جاری کرتے۔ اس کا تو خیر سوال کیا پیدا ہوتھا تھا۔ ہم پر تو مرزا نوشہ کا وہی شعر صادق آتا تھا کہ

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاق مستی ایک دن

قسم لے لو کہ لاجکھ گنگہار رہی۔ کافرہ جو کبھی اس کم بخت شراب خانہ خاب کو چھا تک جو ہو۔ ستم تو بس یہ ہے کہ قرض پھر بھی لیتے رہے اور وہ بھی ہندو سکا ہوکار سے مسلمان بے چاروں کی اتینی حیثیت کہاں تھی کہ وہ بیچارے تو خود کنگال تھے نام کے جو نواب اور شہزادے تھے ان کا بھی بال بال قرض میں بندھا تھا۔ کمال ہے کہ مسلمان بادشاہ کی مسلمان رعیت غریب اور ہندو رعیت مالا مال۔ ہماری دادرسی کا بھلا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

مگر ادھر یہ کمبخت انگریز آیا۔ ادھر مسلمان ایک طرف اور ہندو ایک طرف ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ انگریز کا شارا ملنے پر ہندوؤں نے کنارہ کرنا شرع کر دیا۔ وضع داری اپنی جگہ کہ اس کا بھرا ب بھی کسی نہ کسی طور پر کسی نہ کسی صورت باقی تھا۔ مگر خلوص ایسا عنقا ہوا کہ ڈھنڈوں نہیں ملتا تھا۔ صدیوں کے رشتے ناطے دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے۔

ادھر ہم اپنے الجھے ہئے خیالوں میں غلطاں و پیچاں۔ ادھر نیچے گلی کوچوں میں خود ہماری آنکھوں تلے مارا ماری جاری تی۔ شور البتہ کم ہو گیا تھا۔ مارنے والے، چھرے، لاٹھیاں اور تلواریں لہراتے گویا اپنا کام پورا اور بندگان خدا کا کام تمام کر کے واپس جا رہے تھے۔ مرنے اور زخمی ہونے والے سڑک پر پڑے کراہ رہے تھے۔ بچنے والے اپنے اپنے ٹھکانے جا پڑے ہوں گے۔

ہمیں داتا گنج بخش کے دربار میں حاضری دینا تھی۔ حضرت جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے

مزاروں پر فاتحہ پڑھنا تھی۔ ذرا کی ذرا سیر گلشن یعنی شاملیمار باغ کار بھی کرنا تھا اس خواری اور بے چارگی میں سیر کی سوجھ رہی تھی۔ دلی والے جوٹھرے۔ گھر پھونک تماشہ دیکھ، ہمارے لئے ہی تو کہا جاتا ہے تو کیوں نے پہلے شالیمار چلا جائے۔ سوچا او پلک جھپکتے ادھر پہنچ گیا۔ کیا خوبصورت باغ تھا۔ ایسا باغ تو ہم نے دلی میں نہ دیکھا تھا بیچ و بیچ نہر، نہر کے سرے پر بارہ دری، جھرنا درخست قطار در قطار، ہری ہری گھاس کے قطعے ایسے ہموار جیسے کھلے ہئے مخمل کے تھان۔ مگر بالکل ویران۔ نہ آدم نہ آدم زاد پس پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے۔ ظاہر ہے جب آدھے سے بھی کہیں زیادہ شہر خالی پڑا ہو تو ایسے میں باغ کا رخ کون کرتا۔

مجھے دماغ نہیں خندہائے بیجا کا

ذرا کی ذرا باغ کے کونے میں آرام کیا پھر اٹھا اور حضرت جہانگیر کے مقبرے روانہ ہوا۔ وضع قطع سے بالکل حضرت ہمارےیوں کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ البتہ رقبے میں کھ با ہی ہگا یہاں وہی ویرانی کا عالم تھا البتہ درختوں تلے کچھ افیونی سے اپنی پینی پینک میں پڑے تھے۔ سیدھے جا کر مزار پر حاضری دی، فاتحہ پڑھی پھر وہیں بیٹھ گیا۔ خاندان مغلیہ کی ساری عظمت گویا دلی لاہور اور آگرہ میں مدفون تھی۔ بس ہم اکیلے پڑے تھے۔ دیارِ غیر میں خدا بھلا کرے حضرت نظام الدین کا کہ ہمیں خواب گراں سے جگا کر چھوڑا۔

حضرت جہانگیر کے مقطرے کی بالکل بغل میں ایک انتاہائی شکستہ مقبرے کے بیچ ملکہ کی قبر تھی۔ قبر کا کتبہ اپنی جگہ سلامت تھا اور اس پر کندہ عبارت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزو نے بنالد بلبلے

کیسی عبرت کا مقام تھا کہاں حضرت جہانگیر کی محبوب ملکہ، جس کا صرف ایک اشارہ بادشاہ کیلئے حکم کا درجہ رکھتا تھا اور کہاں بے بسی، بربادی اور ابنائے وطن کی بے اعتنائی او عدم توجہی کی یہ تصویر۔ یبات اگر چہ گھٹا ہے مگر ہمیں اعتراف ہے کہ نور جہاں کے مزار کی نا گفتہ بہ حالت دیکھ کر

ہمیں یک گونہ اطمیان بھی ہوا کہ کسمپرسی میں ہم ایکلئے نہیں بلکہ نورالدین جہانگیر کی ملکہ بھی اس میں شامل ہیں جو شہنشاہ کی پشت پر لگے پردے کے پیچھے بیٹھ کرحکمرانی کی ڈور ہلاتیں۔

شاتحہ پڑھی اور داتا صاحب کی درگاہ کا رخ کیا جو گلی درگاہ کی طرف جاتی تھی اس کا کم وبیش وہی نقشہ تھا جو حضرت نظام الدین کی درگاہ جانے والی کا۔کمال یہ کہ اور مقامات کے برعکس ادھر گہما گہمی تھی۔ پھولوں والوں کی دکانیں ڈھکلی تھی کباب پراٹھوں کے ٹھبئے اپنی جگہ تھے۔ جیسے ہی دبے پاؤں درگاہ کے ادر داخل ہوا تو دیکھا کے صحن خلق خدا سے بیعنہ اس طرح پٹا پڑا ہے جس طرح بوعلی قلندری کی درگاہ کا صحن۔شکل کے سب کے سب ایک جیسے معلوم ہوتے تھے۔البتہ حلئے سے ہندو تھے۔ پاجامے کی جگہ دھوتی۔ ماتھے تلک ہر چند مٹ چکا تھا۔پھر بھی نمازی کے گٹے کی طرح اس کا نشان ابھی تک باقی تھا۔ان کی ورتویں تو پانے کپڑوں سے صاف پہچانی جاتی تھیں بچے تھے سب ایک سے ہوتے ہیں۔رہے لونڈے بالغ نجوان سو بالکل حونق کھلے کھلے منہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں،سب لٹے پٹے جان بچا کر داتا کے دربار آ پڑے تھے کہ صرف ادھر امان تھی آگے چل کر کیا ہوگا۔کون جانے،یہی کچھ کم ہے کہ غنڈوں کے نرغے سے نکل آئے تھے۔

مزار مبارک پر حاضری دی۔فاتحہ پڑھی نفل پڑھے ابھی دعا سے فارق ہی ہوا تھا کہ داتا صاحب سامنے کھڑے تھے اشارہ سے ایک طرف حجرے میں آنے کو کہا فوراً حجرے کا رخ کیا۔اندر داخل ہوا تو حضور اپنی نشست گاہ پر تشریف فرما ہوئے۔ پھر مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں نگاہیں نیچے کئے کونے میں بیٹھ گیا۔ان کی صخصیت کا کچھ ایسا رعب تھا کہ سلام تک بھول گیا ۔نگاہ روبرو کئے بغیر معلوم ہوتا تھا کہ گویا حضور کی نگاہی مجھ پر جمی ہیں اور رگ و پہ میں سرائیت کرتی جارہی ہیں۔حجرہ ان کے نور سے منور تھا۔

سراج الدین اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔ہمیں نصیر الدین کی زبانی سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔نظام الدین جو سوچتے ہیں ٹھیک سوچتے ہیں او پھر اسے پورا کر دیکھاتے ہیں صرف انہیں کا کال ہے کہ سات آٹھ باداشہوں کے دور میں رہے مگر لاکھ منت سماجت کے باوجود کسی کے دربار میں کھڑے نہیں ہوئے حق کی بات کہتے اور سناتے رہے۔

بے شک زمین کی تقسیم پر ہمارا کوئی اختیار نہیں نہ ہمارا اس سے کچھ اسطہ، کہ زمین صرف اور صرف اللہ کی ہے اور وہی کلیتًا اس کا مالک ومختار ہے۔ بھلے بندے سے بانٹتے رہتے ہیں، برادری، خاندان، حکومت اور ریاست کے نام پر اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور نام تو علیحدہ علیحدہ ہوسکتے ہیں مگر زمین اپنی جگہ جوں کی توں رہتی ہے سلطنتیں ختم ہوجاتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی زمین پر ان کا اختیار بھی، صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا اختیار باقی رہ جاتا ہے اور تا ابد رہے گا۔

ہندوستان کو دیکھو سو سال سے بھی کچھ کم پہلے اس پر زمین پر خود تمہارا سکہ اور خطبہ چلتا تھا۔ پھلے نام کو سہی مگر اس دور کو تو اج بھی دور مغلیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا پھر انگریز آئے اور انہوں نے پنے قدم اس طرح جمائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں ہٹانے والا کوئی نہیں۔ ہر سوان کا ہی غلبہ انہیں کا حکم انہی کی حکومت آج وہ بھی اپنا بستر بوریا گول کر کے ہندوستان چوڑنے پر مجبور ہچکے ہی مگر چلتے چلتے اپنی چالا کیوں سے باز نہیں آئے وہ کام جو وہ اپنے دور میں نہیں کر پائے اور خود ہندوستان کے ہندو اور مسلمانں کے ہاتھوں کرانے کے بعد جا رہے ہیں۔

اتنا کہہ کر حضور نے کچھ توقف کیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

سراج الدین تم اس طرح نظریں جھکائے جھکائے کب تک بیٹھے رہو گے۔ ذرا کی ذرا ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو اب فرمانروائے ہند اس تہذیب وتمدن اور اس کے گھوارے یعنی ہندوستان جنت نشان کے تنہا وارث اور محافظ جس کو اب آزادی کے نام پر ختم کیا جا رہا ہے کیوں؟

حضور کے حکم سے ذرا دیر کی سرتابی بھی کسی عنان ممکن نہ تھی لہٰذا میں نے حوصلہ کیا۔ آنکھیں رو برو کیاں۔ داتا صاحب کی نگاہیں کویا نور کا چشمہ تھی۔ دو ایسے چراغ تھے کہ جس کی روشنی دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ کئے دیتی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ان میں کچھ ایسی ٹھنڈک کچ ایسا سحر تھا کہ دیکھنے والا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری نگاہی ان کے چہرے مبارک پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ بولنے کی ہمت تو ابتک تک نہیں تھی آنکھمیں آنکھ ڈالنے کا حوصلہ کہاں سے آتا۔ البتہ نظر ملائے بیٹھا

رہاان کے ہونٹوں پرایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور پھر یوں گویا ہوئے۔

سراج الدین تم ود کہ ملک کی تقسم کے ساتھ ساتھ ہماری قبور کی تقسیم بھی کردی گئی۔ گویا ان کے نزدیک اس طرح روحانیت کی اس مضبوط رسی کو بھی توڑا جاسکتا ہے جس کے بیچ ہندوستان کا پورا وجود اس کی پوری یگانگت اور ایکائی بندھی ہئی ہے قبروں کا تقدس ایک طرف کہ اس سے انکار ممکن نہیں اور اس کا تحفظ بہر حال ہندو، مسلمان سدا سے کرتے چلے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ رہا روحانیت کی ڈور کا تو تھلا کس کی مجال جو اس پر ہاتھ بھی ڈال سکے۔ توڑنا تو بڑی بات ہے البتہ اسے الجھایا ضرور جاسکتا ہے۔ دونوں طرف سے اس کے سرے کو چھڑ وکر اسے اتنا ڈھیلا اور کمزور ضرور کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ساری لچک ختم ہوکر رہ جائے۔ تقسیم کے عمل میں اپنے اور بیگانوں، جن جن کا بھی ہاتھ ہے انہوں نے ہرگز ایسا سوچا بھی نہ ہوگا مگر ان کی سوچ پر تو گویا پہلے ہی پتھر پڑ چکے ہیں ان میں برے بھلے کی ذرا سی تمیز ہوتی تو بھلا ایسا ہونے ہی کیوں دیتے ہم تو اسے ان کا نا کردہ گناہ ہی سمجھتے ہیں۔ مگر گناہ خواہ کردہ ہو یا نا کردہ۔ سزا تو بہر حال اس کی بھگتنی ہی ہوگی۔ مکافات عمل سے کوئی بچ کر نہیں رہ سکتا۔ قصور خواہ چند افراد کا ہو یا پوری قوم اور جمعیت کا۔

انہوں نے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے اس بارے میں مجھ سے کچھ پوچھنے کی خواہش مند ہوں حق تو یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ بھی میرے دل میں تھا مرزا نوشہ کے الفاظ میں:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اختالف کا تو معاذ اللہ سوال ہی پیدا کیا ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے نہ صرف میرے بلکہ پورے ہندوستان جکے دل کی بات تھی۔ تاہم مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ عرض کی۔

حضور نے جو کچھ بھی فرمایا گو وہ میرے بلکہ ہم سب ہندوستان والوں کے دل کی بات تھی۔ روحانتی کا جو رشتہ ہمارے درمیان ہے اسے ہرگز نہیں توڑا جاسکتا۔ اس کا تحفظ بہر حال ہم سب پر لازم ہے اور ہم اپنے تئیں یہ سمجھ کر کہ چونکہ یہ رشتہ نا قابل شکست، محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر

نہیں بیٹھ سکتے۔کوشش بہرحال بندے کا کام، دینا نہ دینا اس کا کام ہے۔

میری بات سن کر سید علی ہجویری کے لب مبارک پر مسکراہٹ سی آئی گویا وہ میرے جواب سے مطمئن ہیں۔ پھر قدرے توقف سے گویا ہوئے:

شیخ ام مجدد الف ثانی سے وقف ہو؟ عرض کی ان کا شہرہ کس نے نہیں سنا البتہ حضرت نظام الدین نے بندے سے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

انہوں نے قصداً تم سے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھا کہ تعلق خاطر اور احترام وافر کے باوجود مسلکا نظام الدین شیخ احمد سے دور ہیں۔ شیخ احمد ٹھرے کٹر شریعت والے۔ اگرچہ نظام الدین کا مسلک بھی وہی ہے مگر ان کا تمام تر جھکاؤ تصوف کی طرف ہے ہر چند کہ طریقت اور شرعیت ای ہی سکے کے دو رخ ہیں مگر جہاں شریعت میں جذب اور جذبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے طریقت نام ہی جذبے کا ہے۔ جذبے کی اس ماحول کا ہے جسے صوفیائے کرام اپنی بان میں فنا کہتے ہیں اور جہاں پہنچ کر خالق ،مخلوق ایک ہوجاتے ہیں۔

یہیں سے نظام الدین اور شیخ احمد کے راستے الگے الگے ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کے سالک دونوں ہیں منزل بھی دونوں کی ایک ہے اور راستے بھی ایک البتہ پگڈنڈیاں علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہیں۔

اب رہا ہمارا معاملہ تو، صاحب عالم (لیجئے داتا صاحب بھی آداب شاہی پر اتر آئے) اسی مصلحت کے پیش نظر نظام الدین نے ہم سے کہا کہ ہم شیخ احمد صاحب سے ابطہ کریں اور ان لیس مشورہ کریں کہ بغیر ان کی ہدایت اور رہنمائی کے ایک قدم آگے بڑھانا بھی ناممکن ہوگا۔ ایسا عظیم انسان پورے ہندوستان میں کون ہوگا جو اکبر اعظم کے سامنے ڈٹ کر کلمہ حق کہے۔

سو ہم نے ان سے مشورہ کرلیا ہے۔ وہ اس ضمن میں پوری طرح ہمارے ساتھ نصرف شریک ہیں بلکہ وہ نظام الدین کو اپنی حمایت اور ضروری ہدایت سے آگاہ کریں گے بلکہ کب کے کر چکے ہوں گے۔ اب تم واپس دلی جاؤ اور جو کچھ تم نے پانی مسافت کے دوران بو علی قلندری کی درگاہ لاہور کے مضافات اور شہر میں دیکھا اس کا مفصل حال اپنے مرشد نظام الدین اولیاء کی

خدمت میں عرض کرو اور انہیں اور خسر و کو ہمارا اسلام پہنچاؤ۔

اور ہاں ان کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دینا کہ ہم نے اور رفقا سے بھی اس بارے میں مشاورت کر لی ہے۔ ان میں حضرت سلان باہو بھی ہیں سائیں بلھے شاہ بھی، بری امام اور سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور عثمان مروندی بھی شامل ہیں ہماری کوشش اور خواہش ہے کہ اس نیک عمل میں صاحبان طریقت اور شریعت، عقل اور عشق، نور اور شعور دونوں ہی کا باہمی میل اور اشتراک ہو کہ اس کے بغیر منزل کی طرف ہمارا ایک ساتھ سفر اور منزل کا حصول دشوار بلکہ غیر ممن ہو جائے گی، فی امان اللہ ۔

داتا صاحب سے ملاقات کے بعد میں خود کو اتنا ہلکا اور تر و تازہ محسوس کر رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے یوں لگا کہ گویا میرا دین اور دنیا دونوں جہانوں کا سفر مکمل ہوا اور میں اللہ سبحان وتعالی اور اس کے پیارے رسول کی امان میں آ گیا۔

دلی واپس جاتے ہئے راستے میں جو کچھ دیکھا وہ پہلے سے بھی کہیں بدتر تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے بجائے لہرانے کے ساکت کھڑے ہیں اور ان جھنڈوں تلے خانماں برباد خلق خدا قافلہ در قافلہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ایسی افراتفری کا عالم کہ بیان سے باہر میدان حشر کا سماں تھا۔ اور اس پر بلا کا گھمس ۔ ہوا کا نام نہ تھا۔ درخست بھی گویا دونوں جھنڈوں کی طرح دم سادھے کھڑے تھے۔ بڑے اور جوان تو خیر اپنی جگہ تھے کہ ان کی حالت ابتر ہونے کے باوجود نگفتہ بہ تھی البتہ بچوں کا حال برا تھا، بیان سے باہر اس طرح وہ چیز جو چار روزہ زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ حیات ابدی پانے کے بعد دیکھ لی۔

یا اللہ مولا یہ تیری خدائی میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے کہ تیرے اور چار بندوں کے شکرانے کے دو نفل پڑھنے کی بھی مہلت نہیں ۔ جسے دیکھو بس ایک طرف سے دوسری طرف دوڑا جا رہا ہے خاندان کے خاندان بیل گاڑیوں میں، گدھوں پر سوار، بڑھے جوانوں کے کاندھے پر، ایک عورت تین، تین بچے سنبھالے ایک کاندھے پر ایک گود میں ایک پیٹ میں نہیں معلوم کہ غدور کے دوران دلی والوں پر کیا گزری ہوگی ہم تو خود بال بچوں سمیت قلعہ معلی سے سیدھے حضرت ہمایوں کے مقبرے چل نکلے تھے مگر جو کچھ ہم اس وقت دیکھ رہے تھے اس سے بدتر بھی کیا ہوگا۔

لاہور سے دلی کا پورا سفر اس اذیت ناک تماشے کو دیکھتے دیکھتے گزر گیا راستے میں قلعہ پڑا۔صدر دروازے پر وہی تین رنگوں والا ہندوستان کا جھنڈا بالکل ساکت بلکہ سرنگوں دائیں طرف جامع مسجد تھی ہوسکتا ہے وہ یہ صرف ہمارا واہمہ ہی ہو مگر اس کے گنبد و مینار جیسے تصویر حیرت و یاس بنے تھے۔گویا عین اپنے اسئے تلے، اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے الی تباہی اور بربادی کی گواہی دے رہے ہوں۔

باقی کا راستہ بھی کسی نہ کسی طرح کٹ گیا۔چاروں طرف ہو کا عالم۔بس فوجی پہرہ دار۔اپنی اپنی بندوقیں تھامے پہرے پر تھے۔کیسا پہرہ۔واللہ ہماری تو سمجھ ہی میں ہی کچھ نہیں آرہا تھا۔عقل جیسے ماؤف ہو چکی تھی۔ہوش اڑے اڑے سے تھے۔

بستی نظام الدین میں گھستے ہی جیسے نقسہ ایک دم سے بدل کر رہ گیا۔ادھر کا حال حسب دستور تھا۔درگاہ کے راستے کی دو کانیں کھلی تھیں۔البتہ شہر کے سیلانی جیوڑے نہ ہونے کے برابر۔اس کا اندازہ ہمیں کھ اس طرح ہوا کہ اگر چہ کباب پراٹھوں اور پھول والوں کی دکانیں کھلی تھی۔مگر دکاندار جیسے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے تھے سیلانی ہوتے تو گاہک بھی پڑتا۔بہر حال کھلا بزار بند بازار سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔گاہک نہیں تو رونق بازار ہی سہی۔

حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہہاں کئی اور بزرگ بھی نظر آئے۔امیر خسرو بھی آداب سلام کے بعد میں کونے میں بیٹھنا چاہتا تھا کہ حضت نے قریب بلا کر اور اپنے پہلو میں بیٹھنے کو کہا۔پھر دوسرے بزرگوں کی طرف اشارہ کر کے فراداً فرداً سب کا تعارف کرایا۔سب سے پہلے حضرت قطب نظام الدین، بختیار کاکی، پھر نصیر الدین چراغ دہلی، اس کے بعد خواجہ فرید الدین گنج شکر اور آخر میں کلیر شریف کے صابر میاں۔یہ سب بزرگ مجھ سے کمال شفقت سے پیش آئے۔ایسی شفقت جس میں احترام کا پہلو نمایاں تھا۔میرے نام کے ساتھ ساتھ صاحب عالم کا پیوند بھی جوڑ دیا۔جس سے مجھے یک گونہ پریشانی سی ہوئی۔کہاں وہ اولیاء اللہ اور کہاں میں راندہ درگاہ، اللہ کا ایک گنہگار بندہ۔پھر حضرت نظام الدین کا فرمان یاد آیا کہ اب ہم محضر سراج الدین نہیں بلکہ صاحب عالم خ فرمانروائے تہذیب او تمدن ہند ہیں۔ملک تو بہر حال خدا کا اور رعیت بادشاہ کی یا حاکم وقت کی۔مگر ہمارے ذمہ جو فرض سونپا گیا تھا اس کا تعلق برصغیر کی سرزمین سے نہیں

،

اس کے جسم سے نہیں بلکہ اس کی روح سے تھا۔ اس روح سے جو ہمارے پرکھوں نے اس کے جسد خاکی میں پھونکی اور جو ب آپس کے جھگڑے فساد کی نذر ہوا چاہتی تھی۔

لٰہذا ہم نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور تمام بزرگان دین کو نظر بھر کر دیکھا۔ امیر خسرو ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شوخی تھی اور لبوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ جس کا مرقع خود ان کی زندگی تھی۔ پھر حضرت نظام الدین ہم سے مخاطب ہوئے فرمایا۔

سراج الدین صاحب عالم سب کچھ دیکھ لیا یا ابھی کچھ دیکھنا باقی رہ گیا۔

پناہ بخدا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

تو بھائی بندگان خدا پر جو گزر رہی ہے اس کا حساب تو ان بندگان خدا کو دینا ہوگا جو اس آفت کے ذمہ دار ہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہے ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے شاید اسی سے دا کے یہ بدنصیب بندے اور ان کے ہوس اقتدار کے نشے میں چور قائدین کچھ سبق سیکھ لیں۔ تاریخ کا بننے سے پہلے بگڑنا لازمی ٹھرا۔ انقلاب اسی کا نام ہے۔

اس کے بعد حضرت نے امیر خسرو کو اشارہ کیا وہ گویا اس اشارے کے منتظر تھے فوراً کھڑے ہو کر اپنے پیرو مرشد دوست اور ہمدم کے سامنے دست بستہ ہو لگئے۔

حضرت نظام الدین نے محفل میں موجود بزرگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو وہ امیر خسرو سے مجلس شوریٰ کے بارے میں کچھ کہنے کے ساتھ ساتھ اپنا تازہ کلام پیش کرنے کو بھی کہیں کہ اس طرح ذرا دل بھی بہل جائے گا اور ہندو۔ مسلمان کے اس مشترک ورثے کی ترجمانی بھی ہو جائے گی جس کے بغیر ہندوستان کی حیثیت ایک جسد بے جان سے زیادہ نہیں ہوگی۔ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین کی طرف دیکھا انہوں نے بہت آہستہ سے گردن ہلا کر کہنے کی اجازت دی۔ ملاحظہ کریں۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چوں عمر کوتہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

جس زبان میں طوطی ہند حضرت امیر خسرو نے خطاب کیا۔ اس کا بیان میرے بس کے باہر ہے۔ ان کی زبان کیا تھی گویا سبد گل تھی۔ اس میں فارسی، ہندی، برج بھاشا، پراکرت، سنسکرت کا ایسا خوبصورت آمیزہ تھا کہ جس کی نقل نہ صرف ناممکن تھی بلکہ خود میرے نزدیک تو ایک ناقابل معافی گناہ

سے کیا کم تھا۔لہٰذا میں صرف اس کے خلافے پر اکتفا کروں گا۔

ابتداء انہوں نے خود میرے اس سفر کی تفصیلات بتائیں جو انہیں میرے دلی پہنچنے سے پہلے ہی مل چکی تھیں۔جن آفات کا خلق خدا کو سامنا تھا۔ان کا حال تو ان بزرگان دین کو اپنی اپنی جگہ پہلے معلوم ہو چکا تھا۔لہٰذا امیر خسرو نے اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی اور صرف اس ملاقات کے بیان پر اکتفا کیا جو میری حضرت علی ہجویری سے ہوئی اور جس کی تفصیلات پہلے ہی از خود انہوں نے حضرت نظام الدین تک پہنچا دی تھی۔

باہمی مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ اولیاء کرام کی باقاعدہ ایک مجلس شوریٰ بلائی جائے اور ملک کی تقسیم کے بعد ہمہ جت جو خطرات پیدا ہوئے ہیں ان کا جائزہ لے کر ایسے اقدامات کا تعین کیا جائے کہ جن کی مدد سے بندگان خدا کی جان و مال کے تحفظ کسے اتھ ساتھ اس روحانی اور تہذیبی ورثے کی بقاء کا اہتمام بھی کیا جا سکے۔جن کے بغیر ہندوستان، ہندوستان ہی نہ رہے گا اس سلسیل کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ آخری تاجدار ہند، بہادر شاہ ظفر کو با اتفاق رائے بادشاہی کے اس منصب اعلیٰ پر دوبارہ فائز کیا جائے جنہیں انگریزوں نے زبردستی وہاں سے معزول کر کے جلاوطن کیا۔اقتدار اعلیٰ کو بحض خود ضابطہ کر لیا اور اس تہذیب، تمدن، زبان اور فن کو تہ و بالا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو ہمارا صدیوں کا ورثہ تھا۔

جہاں تک بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی بحال کرنے کا اور اس پورے عمل میں ان ک یکردار کا تعلق ہے سو اس کا آخری فیصلہ اولیاء کرام کی مجلس شوریٰ میں ہی ہوگا سر دست اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہے مقام شکر ہے کہ اس تجویز کو آپ کے علاوہ حضرت علی ہجویری اور سرہند شریف کے حضرت شیخ احمد کی پوری حمایت اور تائید حاصل ہے۔میرے مرشد حضرت نظام الدین کا یہ مشورہ ہے کہ اس مجلس کے انعقاد کا اہتمام بلا تاخیر کیا جائے اس کے انعقاد کیلئے انہوں نے لال قلعے کے دیوان عام کو منتخب کیا ہے۔اس بارے میں آپ سب کی رائے کیا ہے۔جواب میں سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔اس کے ساتھ امیر خسرو کا خطاب ختم ہوا اور وہ حضرت نظام الدین کی اجازت سے واپس اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

میں نے پہلی بار نگاہ بھر کر وہاں موجود بزرگوں کو دیکھا تو ان کے نا ور سے گویا میری آنکھیں روشن ہوگئی۔ قطب الدین بختیار کا کی کی مدظلہ کا مزار مبارک گویا ہماری تکیہ گاہ تھا۔ جب بھی مہرولی جاتے حاضری دیتے اور گھنٹوں وہاں پڑے رہتے۔ درود وسلام سے فرص پا کر ذرا کی ذرا ک سمع سے روح کو گرماتے۔ کیسے کیسے منجھے اور خوش گلو قوالوں کی صولیاں حضور ک یمزار مبارک ضر صبح شام حاضر ہوتی۔ حافظ اور خسرو کے کلام سے سامعین کو نوازتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں اس شعر سے عشق ہے جسے سن کر خود حضرت قطب الدین پر بے خودی کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جس کے ہوتے ہوئے سامع دنیا میں ہتے ہوئے عرش معلیٰ پر پہنچ جاتا۔ فانی ہوتے ہوئے بھی لافانی ہوجاتا۔ چنانچہ حضور کا وصال بھی فنا و بقا کی اس ملی جلی کیفیت میں ہوا جو یہ شعر سن کر ان پر طاری ہوئی:

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زمان از غیب جان دیگر ایست

یہ شعر تو ہما کا ہے کو کبھی بھولے ہوں گے مگر بعد از مرگ زندگی کے جس مرحلے پر ہم اس وقت تھے اور جو مقدس فریقہ بزرگان دین نے ہمارے سپرد کیا تھا اس کے بعد ہمیں کچھ اپنی ذات پر گویا ابدیت کا گمان سا ہونے لگا۔ استغفار پڑھ کر اپنی پراگندہ خیال سے دامن چھڑانے کی کوشش کی اور اپنے آپ سے کہا۔

سراج الدین کسی بھلاوے میں مت رہنا۔ بھلا کہاں تم کہ خام درجانہ، بھی نہ بن سکے اور کہاں وہ اولیاء اللہ جو عالم فانی سے گزرنے کے بعد سدا باقی رہتے ہیں اور انہیں ہر وقت او ہر عہد میں نئی زندگی ملتی ہے اور ملتی رہے گی پھر مرزا انوشہ کا وہ شعر یاد آیا تو ذرا دل کو تسلی ہوئی۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی

ہر چند کہیں ہے کہ ہے نہیں ہے

بھلے وقت یاد آئے مرزا۔ ہستی کے فریب سے بچا لیا۔ کہاں ابدیت اور کہاں ہماری عمر مستعار جو ہمس ی صرف ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی لئے ودیعت کی گئی۔

جب ایک ایک کر کے سب بزرگ رخصت ہوئے اور صرف ہم امیر خسرو اور حضرت نظام الدین

رہ گئے تو قدرے وقفے کے بعد فرمایا کیوں نہ عید کی چودھویں کوسوراً کا اہتمام کیا جائے اچھا رہے گا۔ چاندنی کی چاندنی اورعدالفطر کا مہینہ جوخدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اپنے بندوں کوگویا اس صبرو آزمائش کا انعام ہے جوانہوں نے باررضا ورغبت ماہ صیام میں برداشت کیں کیا عجب جو اسکے جودوکرم سے ہماری مجلس شوریٰ اس مقصد کی کا یمابی کا نقطہ آغاز ہوجائے جس کا ہم نے بیڑا اٹھایا ہے۔

کلام الملوک خ ملوک الکلام تو سنتے آئے تھے مگر اللہ کے برگزیدہ بندوں کی بات ہی کچھ اور تھی آزمائش میں ان کا فرمان گویا پتھر پرلیکراور صلاح مشورے میں گویا کامیابی کا تیر بہدف انہوں نے جوبھی فرمایا اس میں ذراسی بھی ترمیم، کم و بیشی کی گنجائش ہی کہاں تھی حضور کے مشورے سے میں نے مکمل اتفاق کیا۔ تبسم فرما کر بولے:

ہم آج ہی اس بارے میں سید علی ہجویری اور سرہند شریف کے مجدد صاحب سے مشورہ کریں گے مسند صدارت انہیں دو بزرگوں میں سے ایک کوسنبھالنا ہوگی۔ دیکھیں اس ضمن میں وہ کیا فرماتے ہیں۔

البتہ جہاں تک ہمارا تعلیٰ ہے تو تمہاری موجودگی ضروری ہوگی مگر صرف اس طرح کہ تم سب کو دیکھ سکو اور دسرا تمہیں نہ دیکھ پائے۔ بس چپکے چپکے سے آکر ایک کونا سنبھال لینا۔ صدر محفل سلطنت مغلیہ کے تخت وتاج پر تمہاری بحالی کی تجویز شرکاء محفل کے سامنے پیش کریں گے اوراس کی منظوری کے اعلان کے بعد تمہارا نام پکاریں گے تو تم فوراً حاضر ہو جانا۔ اس کے بعد بھی جو کارروائی ہوگی اس کی صدارت کا منصب تم خود سنبھالو گے۔

اس کے بعد حضرت خاموش ہوکر سجدہ ریز ہوگئے۔ امیر خسرو نے ہونٹوں پر سیدھی انگلی رکھ کر مجھے اشارے سے رخصت ہونے کو کہا اور میں دبے پاؤں ہجرہ مبارک سے نکلا۔ باہر درگاہ کے صحن میں پناہ گیروں کو لنگر بانٹا جارہا تھا۔ میں ایک طرف آڑے کر وہاں سے نکلا اور قلعہ معلیٰ کی طرف روانہ ہوگیا۔

چوتھا باب

مطلع الانوار

(اولیاء اللہ کی مجلس مشاورت)

عیدالفطر کی چودھویں شب آسمان پر کہ بادل کا نشان تک نہ تھا۔ چودھویں کا چاند پورے شباب پر تھا اور قلعہ معلیٰ کا وسیع و عریض صحن اس کی روشنی میں گویا نہایا ہوا تھا۔ پورے قلعے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مگر جیسے دیوان عام کی طرف بڑھا تو ہر چند کہ وہاں بھی مکمل خاموشی تھی مگر چاروں طرف سر ہی سر نظر آتے تھے اور روشنی کا یہ عالم تھا کہ باہر چاند کی روشنی اس کے سامنے پھیکی پڑ گئی تھی۔ بس نور کی ایک چادر تھی جو دیوان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھی ہوئی تھی۔ گویا ایک سیل تھا جس کی روشنی سے وہاں کا کونا، کونا منور تھا۔

حیران تھا کہ ایسے میں کون سا ایسا کونا سنبھالوں کہ جہاں سے میں سب کو دیکھ سکوں او مجھے کوئی نہ دیکھ سکے کہ ایک طرف دیوان عام کی جالی کے باہر ایک گوشہ نظر آیا وہاں سے بیٹھ کر میں اندر کا سب حال دیکھ سکتا تھا۔ جبکہ مجھے کوئی نہیں۔ بس وہی کونا سنبھال لیا۔ جالی سے جھانک کر دیکھا تو تخت شاہی کے برابر والی مسند پر ایک انتہائی بارعب، دراز ریش اور مضبوط بدن کے بزرگ تشریف فرما تھے۔ مگر تخت شاہی خالی پڑا تھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اسے اس بندۂ عاصی کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک بار پھر بے اختیار مرزا نوشہ کا شعر ہونٹوں پر آ گیا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا

یا آپ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہر چند کہ ہم نے کبھی سرہند شریف کے مجدد الف ثانی کو نہیں دیکھا۔ مگر مسند صدارت پر تشریف فرما بارعب بزرگ ان کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتا تھا درویشی اور بادشاہی، خاکساری اور بردباری گویا ان کی ذات میں سمو دیئے گئے تھے۔ یاد نہیں پڑتا کہ زندگی میں ایسا کوئی اور دیکھا ہو۔ مجدد صاحب کی تو شخصیت ہی عجیب وغریب تھی۔ انہی دیکھ کر کبھی جسم وجان پر لرزہ سا طاری ہوتا محسوس ہوتا اور کبھی عافیت کا یا سا احساس جیسے بچے کو ماں کی گود میں۔

حضرت مجدد صاحب کے برابر حضرت علی ہجویری تھے۔ ان کے شانہ سے شانہ ملائے قطب الدین بختیار کا کی، خواجہ فرید الدین شکر گنج اور خواجگان سلیم اور معین الدین چشتی شاہ عبدالطیف بھٹائی، عثمان مروندی نور پور شاہان کے، بری امام عبدالطیف، بنگال کے شاہ جلال شانہ بشانہ بیٹھے تھے۔ ہم سے ان سب بزرگان دین کا مفصل تعارف، امیر خسرو نے کرایا۔

حضرت مجدد کی پشت پر حضرت نظام الدین اولیاء تشریف فرما تھے۔ مجمع پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ حضرت نظام الدین نے اٹھ کر حضرت مجدد کے کان میں کچھ کہا اور پھر مودبانہ اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ حضرت مجدد نے حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ لمحہ بھر کے لئے گویا ان کی نظریں وہیں جم کر رہ گئیں۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کئے بغیر اپنی تقریر کا آغاز کچھ اس طرح کیا:

اس کا علم تو یقیناً آپ سب حضرات کو ہوگا ملک تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف پاکستان یعنی اب شیخ احمد ہندوستان کے اور علی ہجویری پاکستان کے ہوئے۔ معاذ اللہ بھلا کبھی روحیں بھی بٹیں ہیں۔ قبروں کا بٹوارہ بھی کبھی ہا ہے۔

بہر حال ہونی شدنی، ہونی شدنی، قدرت اور تاریخ کا شاید تقاضہ بھی یہی تھا کہ پہلے تو خود اہل ھند پورا ہندوستان اور اس کی حکومت، مٹھی بھر تاجروں کے حوالے کر دیں اور عین اس وقت جب وہ تاجر خود اپنے حالات سے مجبور ہو کر ہندوستان سے راہ فرار پر آمادہ ہو تو یہ آپس میں دست وگریباں ہوں اور خود اپنے گھر کو آگ لگا کر تماشہ دیکھیں۔

غضب یہ ہے کہ جب ہندستان کے سہرے کے پھول کھلنے کا وقت آیا تو دولہا ہی کے دوٹکڑے کر ڈالے اور ابھی تو خدا جانے اور کتنے ٹکڑے ہوں گے کہ شیشہ اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر اس کے ٹکڑے اکھٹا کر کے ایک طرف تو رکھے جاسکتے ہیں مگر انہیں جوڑا نہیں جاسکتا۔

اس کے بعد تو انہوں نے کچھ توقف فرمایا۔ دیوان عام میں لاکل سناٹا تھا۔ نظام الدین گردن جھکائے اسی طرح مجدد صاحب کی پشت پر بیٹھے تھے۔ قطب الدین بختیار کا کی کی گہری سوچ میں خواجہ گنج شکر کی نگاہیں ای ساتھ حضرت مجدد پر لگی تھی۔ عثمان مروندگی کی نگاہ سے بلا کا غصہ ٹپک رہا تھا۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی کے لبوں میں ہلکی سی جنبش تھی۔ شاید وہ کچھ گنگنا رہے تھے جہاں تک میری نظر پہنچ سکتی اور کام کر سکتی تھی۔ باقی اپنی اپنی جگہ اسی طرح ساکت اور خاموش بیٹھے تھے۔

ہر چن کہ وقفہ صرف چند سیکنڈ پر محیط تھا مگر یوں لگا گویا سال بیت گئے۔ حضرت مجدد نے حاضر پر ایک طائرانہ نگاہ الی اور پھر گویا ہوئے۔

''ہر چند کہ ہم اس پر عمل اور ارادے کے سختی سے غلاف ہیں جس کا ذرا سا تعلق بھی بادشاہت اور آداب شاہی سے ہوا۔ اکبر اعظم پورے ہندوستان کی بادشاہ تھے او ہمیں ان کی حیثیت اور حقیقت سے ہرگز انکار نہ تھا۔ مگر اجب انہوں نے آداب شاہی سے تجاوز کر کے نعوذ و باللہ خدائی کا دعویٰ کیا او قلعہ سے نکل کر خانقاہ پر ہاتھ ڈالا اور ہم سے کہا کہ ہم ان کے بھرے دربار میں کورنش بجالائیں تو انہیں للکارتے اور صرف ہماری ایک للکار سے انہیںؒ خاموش رہتے ہی بن پڑی۔

لہٰذا ہمیں بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی اور اس کی بحالی سے کوئی واسطہ نہیں۔ بادشاہت تو صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کی ہے اور اسی کو سزاوار ہے۔ انسان تو حکومت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ کر بھی زیادہ سے زیادہ خلیفۃ اللہ ہوسکتا ہے۔ اس کی یعنی انسان کی بادشاہت کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حضرت اورنگزیب کی وفات کے بعد جس طرح ان کے جانشینوں نے بادشاہت کی مٹی پلید کی اس کے بعد تو جلد یا بدیر نصرف بادشاہت کو ختم ہونا تھا بلکہ حق بھی یہی تھا کہ وہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوہ کر رہ جائے۔

سو جہاں تک بہادر بادشاہ کی تخت وتاج کی بحالی کا معاملہ ہے ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں البتہ جس طرح سفاک انگرزی نے نہیں اپنے موروثی حق سے محرم کیا۔ان کی اولاد کے سر قلم کئے ان پر بغاوت کا جھوٹا مقدمہ قائم کرکے، بھر عدالت میں ان کی تذلیل کی اور ضعت وضیعفی کے باوجود انہیں اورانے خانوادے کو جلاوطن کیا۔اس حوالے سے ہماری پوری ہمدردی اور حمایت ان کے حق میں ہے نیز جس مقصد اعلیٰ کے لئے ان کے شاہانہ مرتبے کی بحالی کی تجویز زیرغور ہے اس کی ادائیگی،تاریخ اور انصاف کے تقاضے کو ملحظ خاطر رکھتے ہوئے صرف اور صرف انہیں کے ذمہ کی جاسکتی ہے۔

پس ہم نے جو عرض کرنا تھا غرض کردیا اس سے اتفقا یا اختلاف آپ کا حق ہے۔آپ جس طرح چاہیں اسے استعمال کریں۔

ادھر حضرت مجدد اپنی نشست پر تشریف فرمائے ہوئے ادھر حضرت نظام الدین نے امیر خسرو کو اشارہ کیا وہ کاغذ کا ایک پروزہ ہاھت میں لئے اجتماع کے سامنے کھڑے ہوئے۔بسم اللہ پڑھی،سورہ فاتح اور درود وسلام کا ورد کیا اور پھر یوں گویا ہوئے۔

اس بندہ عاجز کا آپ سب کو خدمت عالیہ میں سلام۔حضرت مجدد الف ثانی کا فرمان آپ سب نے سنا آخری تاجدار خاندان مغلیہ بہادر شاہ ظرف کی بحالی اور ان کے ذمہ ہندوستان کے روحانی ورثے کے تحٖظ کا جو فریقہ سونپا جارہا ہے اس کی تجویز آپ سب کے گوش گزار کردی گئی اور اس تجویز آپ کی رائے مطلوب ہے کہ اس بارے میں جو قدم بھی آئندہ اٹھایا جائے۔وہ نصرف بالاتفاق رائے ہو بلکہ اس کی کامیابی میں آپ سب کی دعائیں اور فیوض وبرکات شامل ہوں کہ بغیر ان کے اس عمل کا کامیابی سے ہمکنار ہونا تو بڑی بات ہے اس کی طرف پہلا قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔

جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی فرما چکے ہیں مسئلہ ہرگز بہادر شاہ کے تخت وتاج کی بحالی کا نہیں بادشاہی تو صرف خدائے بزرگ وبرتر کو سزاوار ہے۔جس فریضے کی ادائیگی کے لئے نہیں چنا گیا ہے اس کی دو وجوہ ہیں اول یہ کہ اصولاً انہیں وہ حق دلایا جائے جس سے فرنگی غاصبوں نے

انہیں زبردستی محرم کیا۔ دوئم یہ کہ وہ اپنی ذات میں اس تہذیب زبان اور تمدن کے جس کے تحفظ کے لئے اس اجتماع کا اہتما کیا گیا ہے واحد نشان اور مورث العلیٰ ہیں بندے کو بس یہی کچھ عرض کرنا تھا۔ اب رخصت کی اجازت چاہوں گا۔

اس کے بعد حضرت نظام الدین اپنی نشست سے اٹھ کر سامنے آئے اور کمال نا دب صرف دوالفاظ میں شرکاء محفل سے پوچھا کہ اس بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔

جواب میں صرف بسم اللہ، بسم اللہ کی آواز سنائی دی۔ آ از یں اگر چہ نرم اور دھیمی تھیں مگر انتہائی واضح اور ایسی جاندار کہ اس میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا سوال اور شک کا شائبہ تک نہ تھا۔

حضرت نظام الدین نے جواب میں سر ہلایا ارصدر محفل حضرت مجدد الف ثانی سے درخواست کی کہ وہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو طلب کریں اور اس کے بعد وہ خود اپنی نشست پر واپس تشریف لے گئے۔

حضرت مجدد اٹھے اور اعلان کیا کہ سراج الدین جدھر بھی ہوں، تشریف لے آیئے ان کی آواز اگر چہ دھیمی تھی مگر اس میں بلا کی کڑی تھی۔ چہرہ مبارک پر ایک ایسا جلال جس نے جلال الدین اکبر کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اگر چہ میں کافی گھبرایا، گھبرایا سا تھا مگر آخر ہمت کی کمر بستہ کی اور آہستہ آہستہ مگر مضبوط سے قدم بڑھا کر اس مسند عالیہ کی طرف بڑھا جہاں یہ سب بزرگ تشریف فرما تھے۔ بادشاہت کا تکبر اور جھوٹی شان وشوکت نہ تو خود ہمارے بس کی بات تھی اور نہ اس منصوبے کا حصہ جس کی تکمیل اولیاء اللہ کی اس مجلس شوری نے ہمارے سپرد کی تھی اس کے لئے جتنی بردباری کی ضرورت تھی اسے اپنے تیئیں پوری طرح نبھانے کی کوشش ہم پر لازم تھی اور اس میں اپنی جابن سے ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ حضرت مجدد ہمارے انتظار میں ایستادہ تھے۔ میں قدم بڑھا تا ان کے سامنے نگاہیں نیچے کھڑا ہو گیا۔

نگاہیں اٹھاؤ سراج الدین'' حضرت مجدد نے حکم دیا اور اسک ے ساتھ ہی دوقم آ گے بڑھ کر ہمارا شانہ پکڑا اور ہمیں مسند اعلیٰ پر لا کر تخت شاہی پر بٹھیا اجو ابھی تک خالی پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں

میں جھانک کر دیکھا تو مجے جلال کی جگہ جمال اور رعب کی جگہ شفقت کی ایک ایسی کیفیت نظر آئی جو شاذ ہی کبھی دیکھی ہو۔اس کے بعد وہ بغیر کچھ کہے اپنی نشست پر تشریف فرما ہوئے۔

اب اجلاس کی آگے آنے والی کارروائی حضرت نظام الدین نے خود سنبھال لی۔انہوں نے رب العزت کا شکرادا کرنے کے بعد فرمایا:

بہادر شاہ کے مدارج کی بحالی کا مسئلہ باالتفاق رائے خوش اسلوبی سے طے پایا مسئلہ غور طلب اب یہ ہے ہ جس کام کا بیڑاااٹھایا گیا ہے اس کی تکمیل کے بارے میں اب سب کا کیا مشورہ ہے کیا رائے ہے۔ملک کی تقسیم تو سر دست ایک امر واقع ہے اور نہ صرف اس سے روگردانی ممکن ہیں بلکہ اسے چھیڑنا بھی عین عقل نہیں کہ امکان غائب ہے کہ اس طرح مسئلہ حل ہونے کی بجائے مزید پیچیدہ ہوجائے اور سیاست میں الوہیت کا وہ عنصر بھی شامل ہوجائے۔جس کے بعد سیاست تو اپنی جگہ پر انہیں شاطرانہ چالوں اور شیطانی حرکتوں کا نام رہے گی جو سدا سے چلی آرہی ہے۔البتو الوہیت کو داغ لگ جائے جو کچھ سیاست کے کھلاڑیوں نے کرنا ہے سووہ کر بیٹھے۔ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کو وہ صرف نقشے پر لکیریں کھینچ کر پارہ پارہ کرسکتے تھے۔سوانہوں نے کرلیا وہ جانیں اوان کا کام،ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ قبروں کی تقسیم سے روحوں کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

س کے بعد انہوں نے حضرت علی ہجویری سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں اپنی گرانقدر رائے کا اظہار فرمائیں داتا صاحب ابھی تک خاموشی سے جلسے کی ککارروائی کو غور سے سن رہے تھے بلا تکلف فوراً کھڑے ہوگئے ان کی نگاہ پہلے مسند صدارت پر پڑی جس پر حضرت مجدد الف ثانی تشریف فرما تھے۔پھر تخت شاہی کی طرف اٹھی جہا میں بیٹھا تھا۔پھر انہوں نے پہلی بار مجھے صاحب عالم کہہ کر مخاطب کیا اور اپنا خطاب شروع کیا حضور کے کلام کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔فرمایا:

سب سے پہلے میں نظام الدین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے ہندستان کے مستقبل سے مربوط اس معاملے میں پیش قدمی کی کہ یہ انہیں کا حق اور مقام تھا۔وروس البلاد اور

دارالسلطنت دلی میں اپنے دائمی تکیے کی نسبس پے پورے ہندوستان کی نمائندگی کے وہی اہل ہیں اس میں کلام نہیں کہ دلی صرف ایک صوبہ یا ریاست کا شہر نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی جان اور مرکز دوئم میں حضرت مجدد الف ثانی کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر نظام الدین کے ساتھ مکمل تعاون اور حمایت کا یقین دلاای اس کے باوجود کہ مسلکا وہ ان کے حامی نہیں۔ ہر چند کے شریفعت اور طریقت متوازی خطوط کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور الحمد اللہ باہمی تضاد سے بالکل مبرا ہیں تاہم جہاں نظم الدین طریق اور تصوف پر زور دیتے ہیں حضرت مجدد کا تمام زور شریفعت اور صرفیف شریعت پر ہے جس اندازے سے نظام الدین ''ہمہ اوست'' کو وحدت الوجود کے فلسفے میں سموتے ہیں حضرت مجدد الف ثانی ہم از اوست فرما کر گویا کوزے میں دریا بند کر دیتے ہیں اور وحدت الوجود کو وحدت الشہو دقرار دے کر خالق اور مخلوق میں فرق مراتب اور امتیاز کو شریعت اسلام کا رکن اول قرار دیتے ہیؒ۔ منزل اگر چہ دونوں اوان کے ساتھ ہم سب کی ایک ہے لبتہ راستے مختلف ہیں ہمیشہ سے اسی طرح چلے آئے ہیں اوآگے چل کر اسی طرح رہیں گے کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ایست

مجھے یہ کہیں میں رال تامل نہیں کہ اگر چہ بند جناب مجدد سے دور نہیں البتہ لاہوری قیام کی نسبت سے میں دلی کے نظام الدین سے قریب تر ہوں کہ یہ دوسہر یکساں گرداب بلا میں پھنسے ہیں اور ہمیشہ سے پھنستے چلے آئے ہیں۔ نیز کہ یہ دلی اور لاہور ہی اس ہندی تہذیب کے مرکز رہے ہی۔ اگر ہم ان دوشہروں می اوران یک تہذیب کو بچا سکیں تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔

سید علی ہجویری کے بعد خواجہ فرید الین گنج شکر، بابا فرید، شاہ عبدالطیف بھٹائی، کلیر شریف کے صابر میاں آئے اور نانہوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

خواجگان میں آگے کے سلیم چشتی اور اجمیر کے معین الدین چشتی ہر چند کہ صف اول تشریف فرما تھے۔ مگر ابھی تک خاموش تھے۔ نظام الدین جو مجلس کے نقیب بھی تھے اور میزبان بھی انہیں صف اول کے آخر دو مقررین کی حیثیت سے مخصوص کر لیا تھا۔ دونوں خواجہ مسلک چشت

کے سرخیل تھے۔اور جنکے دست مبارک پر لاکھوں بندگان خدا نے بیعت کی اوران کی شمع ہدایت سے روشنی حاصل کی ،سراپا نور بنے اپنی نشستوں پرتشریف فرما تھے۔

نظام الدین نے پہلے خواجہ سلمی چشتی کو دعوت خطاب دی انہیں کے مزار مبارک پر اکبر اعظم شہزادہ سلیم کی پیدائش کے بعد ننگے پاؤں حاضر ہوئے تھے اور انہیں کے اسم مبارک پر شہزادے کا نام رکھا۔

واجہ سلیم چشتی کا خطاب انہائی مختصر تھا۔انہوں نے حضرت نظام الدین کی پیش قدمی اوحضرت مجدد الڑ ثانی اور حضرت علی ہجویری کی طرف سے اس مکمل حمایت کو سراہتے ہئے فرمایا کہ ہر چند کہ ہم دلی اور لاہر سے دور ایک طرف پڑے ہیں مگر ہر طرح سے آگے ساتھ ہیں اور اپنے حلقہ ارادت میں اس مقدس فریقے کی کامیابی کیلیئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے ۔انشاءاللہ!

آخر میں خواجہ معین الدین ک عدوت خاطب دی تو انہوں نے صرف یہ فرمایا کہ خو اجہ سلیم چشتی ان کے خلایلات کی جس طرح ترجمانی کر چکے یں میں اس اضافے کی گنجائش نہیں یقین کریں ہم آپ کے دائیں بھی ہیں اور بائیں بھی ،اگے بھی اور پیچھے بھی۔میرا آپ سے اور دیگر بزرگانہ دین سے صرف ایک سوال ہے کہ تقسیم کا عمل جس باہمی بیزاری اور بے اعتمادی کی بنیاد پر عمل میں آیا ہے اس کے نتیجے میں کم ازکم ائدہ نصف یا پوری صدر میں باہم یمنافرت بڑھے گی یا کم ہوگی؟ ہماری دعا اور کوشش تو یہی ہوگی کہ باہمی منافرت نصرف کم ہو بلکہ اس کی جگہ باہمی منافرت بڑھے گی یا کم ہوگی؟ ہماری دعا اور کوشش تو یہی ہوگی کہ باہمی منافرت نصرف کم ہو بلکہ اس کی جگہ باہمی الفت ومحبت پیدا ہومر سردست ایں خیال است و محال اس وجنوں پھر انہوں نے خطاب کو جاری رکھتے ہئے فرمایا، مجھے یہ بیل منڈھے چڑتھی نظر نہیں آتی۔

اتنا کہا اور اس کے بعد ایسے رواں ہوئے اور اتنا کچھ فرما گئے جو شاید شرکائے محفل ک دلوں میں ہوتے ہوئے بھی ہنوز ان کی زبانوں پر نہیں آیا تھا۔

آپ سب کے ملحوظ خاطر رہے کہ معاملہ اب دو فرقوں یا مذاہب کے پیروکار، ہندو اومسلمان کے بیچ نہیں بلکہ دو ممالک کے مابین ہے جن کی اپنی اپین افواج ہیں اپنے اپنے عزائم ہیں اگر چہ ایک طرف ہندو بھائیوں کی قطعی اکثریت ہے مگر اس میں مسلمانوں کی تعداد کم ہوتے ہوئے

بھی کم نہیں دوسری طرف مسلمان ہیں اور وہاں ہندو نہ ہونے کے برابر اور دوسری اقلیتوں کا وجود بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس طرح خط تقسیم کے نتیج می زمین سے بھی کہیں زیادہ انسانوں بالخصوص مسلمانوں کا بٹوارہ ہوا، جو ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی۔ گویا نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے ہم اور نظام الدین اور قطب الدین اور نصر الدین اور مجدد گویا ہندوستانی ٹھرے اور لعی ہجویری اور فرید الدین گنج شکر پاکستانی۔

استغفر اللہ! یہ کسی قسم کا بندوست ہے کہ قبر ایک طرف اور روح دوسری طرف۔ جسم ایک طرف اور جان دوسری طرف۔ بہر حال جو ہونا تھا سو ہو گیا ہنی سدنی مگر جہاں تک اپنی نگاہیں جاتی ہیں مجھے تو بربادی ہی بربادی دکھئیا دیتی ہے اور من سے کہیں زیادہ جنگ اور خونریزی کے آثار سامنے آتے ہیں خدا کرے ایسا نہ ہوا و انشاءاللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہندوستان اور پاکستان خود ہی تھک ہار کر ایک دوسرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے مگر اس وقت کا تعین کم از کم میرے لئے تو ممکن نہیں۔ نیز اس وقت کے آتے آتے کتنی تباہی، بربادی اور خونریزی ہو چکی ہوگی اس کا اندازہ بھی فی الحال ناممکن ہے۔

لہٰذا میری تو صرف یہی گزارش ہے کہ تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھے جائیں ارتہذیب وتمدن کے تحفظ کے فریقے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ جنگ وجدل کے امکانات بھی زیر غور رہیں۔ اگر ان سے مکمل طور پر چھٹکارا بھی ممکن نہ ہو تو انہیں کم سے کم رکھنے کی سعی جاری رکھنی چاہیئے کہ تہذیبی ورثے اور اس کے تقصد کا تحفظ صرف اس صورت میں مکن ہوگا جب امن کی بنیادیں مستحکم ہوں گ اور با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام، کی بنیاد پر صلح کل کا ورد شروع ہوگا۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا رو وہ جو عمل نفرت کے بیج شروع ہوتا ہے وہ نفرت پر ہی ختم بھی ہوگا خدانخواستہ جو ایسا ہوا اور یقیناً اللہ کی عنایت اور مدد سے ایسے ہونے بھی نہیں دیں گے مگر حقائق خواہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں ان سے روگردانی کسی حالت میں بھی موزوں اومناسب نہیں ہوگی۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے اجازت چاہی اور اپنی نشست پر تشریف لے گئے۔

ان کے خطاب کے بعد مجلس پر سناٹا سا چھا گیا۔ مسند پر متمکن اور فرش پر تشریف فرما کل شرکائے

کرام کے لبوں پر گویا مہر خاموشی ثبت ہوگئی۔ میں خود اپنی جگہ ہل کر رہ گیا تھا۔خواجہ معین الدین کا فرمایا پتھر پر لکیر سے کم نہ تھا۔ ہر چند کہ ہندو پاکستان کی باہمی آویزش اور جنگ کا دھڑکا خود مجھے بھی لگا تھا مگر میرے اپنے خیالات میں ایک قسم کا الجھاؤ تھا ابہام تھا، ژولیدگی تھی ۔حضرت خواجہ صاحب کے زبان مبارک سے نکلا ایک ایک لفظ ہیرے کی کنی کی طرف دل اور دماغ دونوں میں اترا جا رہا تھا۔

میں اسی طرح اپنے خیالات میں غلطاں و پیچان تھا، مسند پر تشریف فرما دوسرے بزرگان دین بھی اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے تھے کہ اتنے میں محفل کے بیچ سے بوعلی قلندر اور ایک اور بزرگ حضرت عثمان مروندی ایک ساتھ کھڑے ہوگئے۔ واضح رہے کہ محفل میں شریک تمام بزرگان دین کا فرداً فرداً تعارف امیر خسرو نے مجھ سے پہلے ہی کرا دیا تھا اس لئے مجھے معلوم تھا کہ کون کون ہے۔حضرت بوعلی قلندر اور عثمان مروندی دونوں کی نگاہیں ختم آ گین تھیں۔اتنی لال سرخ کہ ان سے انگارے برستے معلوم ہوتے تھے۔پھر دونوں بزرگوں نے مفحل کے میزبان حضرت نظام الدین اور ان کی معرفت مجھ سے مخاطب ہوکر خطاب کی اجازت چاہی۔

اجازت کیسی اور کس کی حضور جو چاہیں ،فرمائیں جو چاہے عنایت کریں نظام الدین نے جواب دیا ہم نے اپنی طرف سے صرف ''ضرور بالضرور'' پر اکتفا کیا۔

بوعلی قلندر نے عثمان مروندی کی طرف دیکھا گویا ان سے پہلے کرنے کی جا ازت کی درخواست کر رہے ہیں جواب میں عثمان مروندی نے سر مبارک ہلایا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے اب ہم سب ہمہ تن گوش تھے کہ دیکھیں بوعلی قلندر اپنی زبان مبارک سے کیا فرماتے ہیں انہوں نے حسب سابق پہلے نظام الدین اور اس کے بعد ہمیں مخاطب کر کے اپنا خطاب شروع کیا۔فرمایا:

سب سے پہلے تو میں ان خیالات اور خداشت کی مکمل تائید اور حمایت کرنا چاہوں گا جن کا اظہار ابھی ابھی حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے سامنے کیا ہے۔ظاہر ہے کہ جب دو بھئا ی، دو خاندان آپس میں بٹوارہ کر کے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو گویا ان کے مابین باہمی نفرت اور غصہ کا ایک ایسا خط فاضل، ایک ایسی لکیر کھنچی جاتی ے جو برسوں چلتی ہے اور برسوں

مٹائےنہیں مٹتی قبائل کی جنگ سے کون واقف نہیں پش در پشت چلتی ہےاور نہ صرف ختم ہونے کونہیں اتی بلکہ ایک مقدس میراث کی شکل اختیار کرلیتی ہےجس کی تحفظ ہرآنے والی نسل پر لازم ہوتا ہے۔

سو دوستوں اور بزرگوں یہ حال تو بھائیوں بھائیوں خاندانوں اوقبائل کے جھگڑوں کا ہے یہاں دوملکوں کا مسئلہ ہے دو ایسی جڑواں اولاد کا ہے کہ جنہوں نے بیک وقت نفرت کی کوکھ سے جنم لیا ہو۔لہٰذاان کے پاس سردست بلکہ آنے والے ایک طویل عرصے تک کسی نیک پیش رفت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بے معنی ہوگا۔

سب سے پہلے تو ہمیں تقسیم کی سنگینی حقیقت کوتسلیم کرنا ہوگا ساتھ ہی اس چکر میں پھنسے بندگان خدا پر جوگزری ہےاور گزر رہی ہے جو اتلاف جان و مال ہو چکا ہےاور جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہ یکچھ نہ کچھ مدوا کرنا ہوگا۔نفرت کے پرانے سوتوں کو بند کرنے کے ساتھ ساتھ تقسیم کے بعد نفرت کے جو نئے سوتے پھوٹے ہیں او پھوٹتے رہیں گے ان سب مسائل سے نمٹنا کسی طوران مسائل سے نمٹنے سے کم نہ ہوگا۔جن کے باعث نوبت بٹوارے تک پہنچی۔

اس کے بعد بوعلی قلندر نے توقف فرمایا شرکائے محفل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر مجھے ایک ایسی تیکھی نظر سے دیکھا کہ میرے لئے فیصلہ کرنا دشوار ہوا کہ ان کی نگاہی آخر کہہ کا ی رہی ہیں۔غصہ نگاہ ہے یا کرم کی البتہ تیر کی طرح میرے رگ و ریشے میں چبھتی جارہی تھی اس کے بعد فرمایا:

پانی پت یعنی جہاں ہم بیٹھے ہیں دلی سے قریب اور لاہرو سے زیادہ دورنہیں دونوں کے بیچوں بیچ ہے ہم نے وہاں سے قتل وغارت گری، انسان کی انتہائی بے بسی ومجبوری، عورتوں، بچوں اوبوڑھوں کی حالت زار کے جومناظر دیکھے اور ہنوز دیکھ رہے ہیں وہ بڑے سے بڑے ظالم کا دل ہلا کر رکھ دینے کے لئے کافی ہیں پھرانہوں نے ہماری طرف دیکھا گویا ہماری شہادت مطلوب ہو۔

حضور نے جوفرمایا قطعی درست فرمایا آپ پہ جوگزری سوگزرگئی کہ اللہ اوراس کے رسول کے مقربان خاص ہیں اس بندہ عاصی پر جوگزری اس کا بیان خود میرے بس سے باہر ہے۔

بوعلی قلندر نے خاموشی سے ہمارا بیان سنا اور پھر اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

مجھے یہ کہنے میں چنداں تامل یا عار نہیں کہ انسان کا بہایا ہوا خون خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہو دنیا او آخرت دونوں ہی میں بولتا ضرور ہے اور تقسیم اور آزادی کے جلو میں یہ جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کا خون خود اپنی کے ہاتھوں بہایا گیا او بے بس و لاچار خواتین کی بے حرمتی کی گئی یہ رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا اگر ہندوستان اور پاکستان کے قائدین ار کرتا دھرتا اپنے تیئیں یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا تو صاحبان ان کی اس سے بڑی بھول ہو نہیں سکتی۔

نیز یہ کہ میری اپنی او تجربہ کی روشنی میں یہ قیامت جو خود ہندوستانیوں کے ہتھوں او پاکستانیوں اور پاکستانیوں کے ہاتھوں ہندستانیوں پر ٹوٹی میری اپنی رائے اس میں ن معیشت ایزدی کا کوئی دخل تھا۔ نہ تاریخ کے مسی نالگزیر تقاضے کی شمولیت۔ ی صرف اور صرف ایک بیمار ذہنیت اور کوتاوبنیں کا نتیجہ ہے۔

ہر چند کے تاریخ کا بننا بگڑنا بھی معیشت ایزدی کا ایک شخاسانہ ہے مگر ای وقت ایسا آتا ہے ک ہقدرت انسانی معاملات سے گویا کنارہ کر لیتی ہے اور اس وقت تک کنارہ کئے رہتی ہے جب تک آنکھوں کے اندھے او عقل کے کورے مغلوم الغضب انسان خود تھک ہار کر اور سب کچھ کھونے کے بعد تھواڑ بہت جو باقی بچ جاتا ہے از خود اسے بچانے کی فکر میں نہیں پڑ جاتے ہیں۔

میرا اپنا یہ وجدان اور ذہن تو یہی کہتا ہے کہ فی الوقت آپ لاکھ صلح کا اور بھائی چارے کی سعی کریں اور پیام دیں یہ دونوں حریف اپنے اپنے طور پر اور اپنی قوت اور ذہنیت اور پدرت کے مطابق ایک دوسرے کے خلاف اپنی اپنی بھڑاس ضرور نکالیں گے اور ہر طرح کی مہم جوئی روا کریں گے۔

ہم بے شک اپنا کام جاری رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورا ہندوستان او ہندوستانی قوم نوح کی طرح غرق ہو کر نہ رہ جائیں۔

اس کے بعد بوعلی قلندر بغیر کسی قسم کی معذرت کے اور اجازت لئے جس طرح اپنی نشت سے خود اٹھ کر آئے تھے اسی طرح واپس جا کر بیٹھ گئے۔

وہ بیٹھے ہی تھے کہ عثمان مروندی کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہمیں نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا بس

حضرت علی ہجوری اور مجدد الف ثانی کی طرف دیکا اور آنمکھوں ،آنکھوں میں ان سے اجازت خاطب چاہی او شروع ہوگئے ان کی آواز اتنی گھمبیر اور زردار تھی ک جیسے نقارے پر چوٹ پڑ رہی ہو۔ بوعلی قلندکی والہانہ کیفیت ان پر بھی عاری تھی اور زبان میں بھی انہیں کا سا انداز تھا۔ ہر چند کہ وہ فارسی شاعر کے مستد استاد تھے۔ان کے کلام کا الہامی رنگ واح اور مستد تھا امگران کے خطاب کا انداز اوان کی زبان بالکل عوامی تھے۔انہوں نے فرمھایا:

بوعلی کے بیان کے مطابق پانی پت پرجکو گرزی اور گزر رہی ہے سواپنی جگہ اس قسم کی کوئی چیز ہماری طرف نہیں قتل او غارتگری کا خیر سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے وہاں تو آپس میں معمولی سی ہاتھا پائی بھی نہیں ہندوامن اوسلامتی کے ساتھ پانے اپنے شہراور گھوتھ سے رحد پارر کرر ہے ہیں اور آس پاس کے ان کے پوسی مسلمان بھیا۔یہی نہیں کہ ان کے مال ومتاع پر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے بلکہ اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لے کر جانے میں ان کی مدد کرتے ہیں ۔ جو جتنا لے کر جا سکتا ہے جتنا بار اٹھا سکتا ہے بڑی سہولت سے لے کر چلا جاتا ہے لوٹ مار کی ذرا سی بھی کوئی صورت نہیں۔

البتہ وہاں بھی جو کچھ بھی دیکھنے میں آرہا ہے دیکھا نہیں جاتا ادھر ہندو بھائیوں کی ٹولیاں ہندوستان چلی جار یہ ہیں ادھر یعینی ہندوستان سے لٹے ہوئے بداحل مسلمان قافلہ در قافلے سندھ پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں ان آفت کے مارے انسانوں کی حالت بس دیکھی نہیں جاسکتی سب کے سب کئی کئی دن کے فاقوں کے مارے،کھیل کا دانہ تک منہ میں نہیں گیا عورتیوں ہیں کہ سراور سینہ کھلے ہیں کسی کی گود میں زدہ بچہ کے کسی کے کاندھے پر ادھر مرا اپنے اپنے مردوں کے پیچھے گھسٹتی چلی آرہی ہیں۔

ایسی خادہ برباد ہ کا منظر بھلا چشم فلک نے کاہے کو کبھی دیکھا ہوگا بھائی مردہ انسان دیکھنا ایک بات ہے کہ جدائی کے صدمے اور غم کے باوجود صبر کر یت ہی بن پڑتی ہے مردے کو زندہ تو نہیں کیا جاسکتا مگر زندہ کو مردے سے بدتر حالت میں دیکھیں تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہوکیا اور کیوں ہورہ رہا ہے صبح شام برباد حال لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ۔ ہندو مسلمان ہماری درگانہ میں آتے ہیں رورو کر عافیت کی دعائیں مانگتے ہیں۔امن وامان کے قیام کی استدعا کرتے ہیں ہمارا بس نہی چلتا کہ ان کی دعائیں قبول ہوں مگر بھئا ی سچی بات تو یہ ہے ہ خود ہماری دعاؤں کی تاثر ختم ہورر کرہ گئی ہے عذالت الہٰی جب آتا ہے تو کسی کو نہی چھوڑتا۔اچھا،برا،مرشداور مرید سب ہی اس کی پکڑ میں آجاتے ہیں اواب یہی کھ ہرہا ہے۔

ایک طرف پنجاب ہے جہاں کشتوں کے پشتے لگے ہیں تو دوسری طرف سندھ کے بے آسرااور خانماں برباد زندوں انسانوں کا گویا گڑھ بن چکا ہے۔

پھر حضرت نے کچھ توقف کیا۔ان کے ہتھوں کی مٹھّیاں کھلنے اور بند ہونے لگیںؒ اوران کے پورے سراپے پر ایک وافتگی اپے بے خودکی سی کیفیت طری ہوتی دیکھائی دی پھراس طرح گویا ہوئے۔بوعلی نے جو کچھ بھی کیا ہمیں اس سے پورا اتفاق ہے ہندو، پاکستان کا ہر معاملہ ایسانہیں کہ عین ہماری خواہشات اودعاؤں کے مطابق حل ہو جائیہ تو چلے گا برسوں سر جوڑنے کی بجائے یہ ایک دوسرے کے سر پھوڑیں گے خون کے پیسے ایے دور سے کا خون پیئں ی گے اس طرح جو بربادی اور تباہی تقسیم ک دوان رہ گئی تقسیک کے بعد اسے پورا کریں گے تقسیم یس پہلے انگریزی راج میں جو ہندو مسلم جھگڑے،فساد گلی محلوں او بازاروں میں ہوتے تھے اب وہ سرحدوں پر ہوں گے۔سرحدیں ی بھی ایسی کے ادھر آندھی آئی ادھر ریت کے بگولے اورتودے اڑے اوسرحدویں بدل کررہ گئیں۔

ان حالانت کا یہی تقاضہ ہوگا کہ دونوں طرف سے اچھی طرح دل کی بھڑاس نکل جائے تو ہمیں یہ لگتا ہے کہ طلب جنگ ب بجا ہی چاہتا ہے اور یہ دونوں بدنصیب ملک اپنی لٹی ہوئی رعیت کی آبادکاری انکے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی بجائے اپنی توپوں اور بندوقوں کے دہانے کھول کر ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔

اس طرح صلح وآشتی کی جنت تک پہنچنے کے لئے ہمیں خونیریزی، تباہی و بربادی کے جہنم سے گزرنا ہوگا کہ مکافات عمل سے فرار ممکن ہیں ۔موت کا رقص ٹالے نہیں ٹلے گا پھر انہوں نے پاین نشتس پر جانے سے پہلے اپنی مشہور غزل کے یہ اشعار پڑھے:

بیا جاناں تماشہ کن کہ درانبوہ جانبازاں

بصد سامان رسوائی، سر بازار می رقصم

منم عثمان مروندی کہ یار خواجہ منصورم

ملامت میں کند خلقے و من بردآر می رقصم

حضرت عثمان ابھی بیٹھے تھے کہ تین بزرگ ایک ساتھ کھڑے ہوگئے ۔اگرچہ امیر خسرو ہمارا تعارف ان دونوں سے کرا چکے تھے تاہم انہیں فوراً پہنچانے میں ذرا سا تامل ہوا مگر پھر جلد ہی پہچان گئے ان میں سے ایک سائیں بلھے شاہ تھے دوسرے سلطان باہرا اور تیسرے مادھولال حسین تھے ۔بلھے شاہ گویا مست الست کا زندہ مرقع تھے ۔سلطان باہر کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔مگر کسی قدر کم کھوئے ان کی آنکھویں میں سلطانی جلال اور فقیرانہ جمال دونوں ہی کی ملی جلی کیفیت تھی ان دونوں بزرگوں کے مقابلے میں حضرت مادھولال حسین گویا گدڑی میں لعل تھے ۔ان کی فیقری میں بھی رنگینی کی آمیزت تھی ۔ان کی گدڑی بوسیدتھی مگر اس کی پیوندکاری اس طرح کی گئی تھی گویا قوس وقزح کے سارے رنگ میں اس سمود دیئے گئے ہوں ۔

مادھولال حسین کی آنکھیں قدرے چڑھی چڑھی تھیں جیسے ابھی سوتے ہسوتے اٹھے ہوں یا مراقبے سے باہر آئے ہوانہوں نے زور سے اپنے ناما کی تکرار کی ۔م آ دھ و ۔ل آل ۔ ح س ے ن ، اور پھر خود سوال کیا ۔ بتائیں یہ نام آیا کہاں سے کون کہتا ہے کہ راوی اور گومتی علیحدہ علیحدہ ان کا منبع اور سوتا جہاں سے پھولتا ہے وہ صرف اور صرف ذات باری ی تعالیٰ ہے بندے بس ان بہاؤں میں رکاوٹیں پیدا کر سکتے ہیں پھر انہوں نے مادھولال حسین ، کا نعرہ بلند کیا اوایک دم ساکت ہوگئے ۔

اب رہ گئے تھے بلھے شاہ اور سلطان باہر وان دونوں کے چہروں پر ایک عجیب قسم کی

روشنی اور مسکراہٹ تھی۔ پھران دونوں بزرگوں نے پانے برابر کھڑے مادھولال حسین کو دیکھا اپنے چاروں طرف نظر کر اللہ ہو اللہ ہو کا نعرہ لگایا۔آخر میں مادھولال حسین نے کہا۔

خدا کی زمین کو چاہے کتنا ہی کیوں نہ بانٹ لو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کردو زمین پھر بھی اسی کی رہے گی وہی اور صرف وہی آسمان اور زمین کا مالک ہے وہ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے اپنے بندوں کی ہر گناہ کو معاف کریدتا ہے۔

مجلس میں جسے جو کچھ کہنا تھا کہا جا چکا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی، علی ہجویری، حضرت قطب الدین اور فریدالدین گنج شکر سب گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔حتیٰ کہ حضرت نظام الدین اور امیر خسرو جیسے باغ و بہار بزرگ بھی گویا مراقبے میں چلے گئے تھے ہماری سمجھ میں تو صرف اتنا آیا تھا کہ ابھی تو ابتداء ہے آگے آگے دیکھےء ہوتا ہے کیا ہندوستان آنے والے جن خضرت کا ذکر کیا تھا سے بالکل ٹالنا بھی ناممکن ہوگا ہمارے سامنے جو نوشتہ دیوار تھا اس کا عنوان گویا خون سے تحریر کیا گیا تھا۔

نمی دانم حدیث نامہ چوں است

ہمی دانم کہ عنوانش بخوں است

تعجیب ہمیں اس پر تھا کہ نظام الدین اور امیر خسرو تو اپنی اپنی جگہ محفل کے روح رواں اور میز بان تھے ہی مگر خود دلی کے خواجگان کو کیا ہو گیا تھا کہ ان میں کسی نے بھی اپنی زبان نہ کھولی مانہ کہ رسم میز بانی کی نسبت سے ان کی چپ ہی مناسب تھی مگر ایسا بھی کیا کہ گویا چپ شاہ کا روزہ رکھ کر بیٹھ رہے ہوں۔

ابھی ہم سوچ رہے تھے محفل کے بیچ سے حضرت خواہ باقی باللہ کھڑے ہوئے اگر چہ ان کی شہرت نظام الدین کے برابر تھی مگر ان کے جلال، جمال اور کال سے کون دلی والا واقف نہیں تھا ان کی وضع گویا سب سے انوجھی تھی ان میں نظا مالدین کا عوام وخواص کا دل موہ لینے والے انداز، حضرت مجدد الف ثانی کا اجتہاد اور سید علی ہجویری کا علم گویا سب ایک ساتھ سموئے ہوئے تھے۔حضرت نظام الدین سمیت حضرت مجدد علی ہجویری، قطب الدین بختیار کا کی، خواجہ فرید سبھی نے ان

کا استقبال کیا۔انہوں نے ہماری طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی سمجھ میں نہی آ تا تھا کہ وہ ہمارے حال پر تمسخر فرما رہے ہیں یا رحم۔

ہم سب انہیں سننے کے لئے بےتاب تھے مگر چھ دیر وہ اسی طرح کھڑے رہے پھر یوں گویا ہوئے۔

سچ پوچھو تو اتنا سننے کے بعد ہمارے پاس کچھ کہنے کو کچھ بھی تو نہیں رہا آپ سب بزرگوں نے سب ہی کچھ فرما دیا۔

پھر انہوں نے نصیر الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت ہماری کیفیت عین ان کے اس شعر کی سی ہے:

گہہ شادم و گہہ غمگیں ازا حال خودم غافل

می گریم و می خندم چوں طفل بخواب اندر

ہنسی کی ہنسی اور دکھ کا دکھ بائیں خواجہ کی چوکھٹ کہلائے جانے کے باوجود دلی ہمیشہ کسی نہ کسی گرداب بلا کسی نہ کسی آفت اور آشوب کے نرغے میں رہتی چلی آئی ہے ان میں بلائے آسمانی گویا نہ ہونے کے برابر کہ اللہ کا کرم بہرحال اس شہر پر رہا ہے مگر انسان کے ڈھائے ہئے مظالم کی انتہا نہیں اور اس کے رحم و کرم سے یہ شہر آج تک آباد اور زندہ ہے اور آزاد ہند کا دارلسطنت قرار پایا۔

اس شہر پر جتنے بھی ظلم ڈھائے گئے۔ یہاں جتنا بھی کشت وخون ہوا جتنا بھی قتل عام ہوا سب اپنوں ہی کا کیا دھرا کیا نادر شاہ، کیا احمد شاہ، کیا مرہٹے کیا انگریز اور اب خود اہل ہند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں شہر کے گلی کوچوں میں اللہ کے معصوم بندوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے وحشی جانوروں کی طرح پھر رہے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا ک اس شہر کی بدنصیبی پر ہنسوں یا روؤں ہنسوں تو کیوں نہ ہنسوں اور روؤں تو کیوں روؤں۔ ہماری کیفیت نصیر الدین کے اس طفل کی سب ہے جو خواب میں کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے اور اسے خبر ہی نہیں کہ روتا کیوں ہے اور ہنستا کیوں ہے کاش کہ ہم اس معصوم بچے ہی کی طرح ہوتے جو کہ دوسروں کو رلائے بغیر خود ہی روتا اور خود ہی ہنستا ہے۔

نصیرالدین حضرت باقی باللہ کے کہنے پر جیسے کچھ آبدیدہ سے ہوئے پھر خنداں، بالکل اس معصوم بچے کی طرح جس کی تصویر انہوں نے اپنے صرف ایک شعر میں کھینچ کر رکھ دڑی تھی۔

کیوں نصیرالدین ہم نے ٹھیک کہا؟ حضرت خواجہ باقی باللہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا عین نوازہے حضور کی، ورنہ کیا بندہ اوک کیا بندے کی شاعری۔

بہت خوب چلئے اس حیلے بہانے سے آپ کے منہ سے دولفظ تو نکلے۔ چپ جکا روزہ رکھ وتو شاید ہم بھی آئے تھے کہ اچانک تمہاراشعر یاد آ گیا اور ہماراروزہ ٹوٹ گیا اس کا کعذاب تمھمارے سر۔

حضرت باقی بالااللہ کے جملے پر مسند نشین بزرگوں نے ذرا پہلو بدلا اوان کے سنجیدہ چہروں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔

ہماری جملہ کزوروں اور خوابیوں کی ایک بڑی کمزوراور خرابی یہ ہے کہ یا تو بولتے نہیں مگر جب بولنے پر آتے ہیں تو بس بولے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی آپ جیسے محترم دوستوں اور بزرگوں کے روبرو ہمارے پاس اپنا کہنے کو تو کچھ بھی نہیں بس جو سنا اور سمجھا اسے دہرا دیا۔ اس سے پہلے کیہ میں رخصت چاہوں نظام الدین اوحضرت قطب الدین بختیار کا کی کی خدمت میں انہیں کی جاجازت سے پسندیدہ دواشعار پیش کرنے کی جسارت کروں گا یوں لگتا ہے جیسے دونں اشعار حقیقت کا جامع پہنن کر ہمارے سامنے آئے ہیں پہلے قطب الاقطاب حضرت قطب الین کا محبوب اور پسندیدہ شعر دھراؤں گا:

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جان دیگر ایست

خواجہ نے شعر دوبارہ پڑھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ شعر سن کر حضرت قطب الدین کے جسد مبارک پر گویا ایک ارتعاش سا طاری ہوا۔ مگر انہوں نے فورً خود کو سنبھا اسب کے ساتھ انہائی متنات سے اس کی داد دی۔ اس کے بع دخواجہ نے نظام الدین کو تیکھی نظروس سے دیکھا اور فرمایا:

نظام الدین اب تم بھی اپنا پسندیدہ شعر سن لو

اے تماشا شہ گاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشہ می روئی

تو بزرگوں اور دوستوں آپ سب کو ہماری دعائیں اور سلام پہنچیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو آپ کے نیک عزائم میں کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے۔

کہاں تک اس فقیر کا تعلق ہے سو میا آج تک شہر کے جس دور افتادہ کونے میں پڑے ہیں وہیں پڑے، پڑے آپ کی کامیابی کے لئے اللہ کے حضور دعائیں کرتے رہیں گے اس سے بڑھ کر ہمارا بس نہیں چلتا۔ فی امان اللہ

اس کے ساتھ وہ جتنی آہستگی سے اٹھے تھے اتنی ہی آہستگی سے اپنی نشت پر دوبارہ بیٹھ گئے۔ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانی نے ہماری طرف دیکھ کر فرمایا۔ محفل برخواست ہونے کو آئی اب آپ کی باری ہے آپ بھی کچھ فرمائیں حضرت نظام الدین نے آنکھ کے اشارے سے مجدد صاحب کے حکم کی فوراً بجا آوری کے لےء کہا ، اب کسی قسم کے تامل اور تکلف کا سوال ہی کیا پدیا ہوتا تھا۔ لہذا میں کھڑا ہوا اور سب بزرگوں کو درجہ بدرجہ مخاطب کر کے عرض کیا۔

آپ کے حکم کے مطابق اور اللہ کی حمایت اور مہربانی پر تکیہ کترے ہوئے انشاء اللہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ تقسیم شندہ ہندوستان کی غیر منقسم تہذیب اور زبان کے تحفظ کا جو فریضہ اس خاکسار خطا کار کے سپرد کیا گیا اس کی تکمی میں کسی طرح سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔

مجھے احساس ہے کہ فردوس پہنچنے کے لئے دوزخ کے راست گزرنا ہوگا مگر ہمت مرداں مدد خدا منزل تک پہنچتے پہنچتے کتنا اور قتال ہوگا اور کتنا اور خون بہے گا اس کے خیال ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ مگر بقول مرزا نوشہ:

وام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جس تہذیب کے تحفظ کا آپ کے فرمان کے مطابق میں نے بیڑا اٹھایا کسی ہندومستان کی تہذیب نہیں بلکہ اس میں دونوں کا میں برابر، برابر کا کردار برابر، برار کا حصہ ہے ہند کے مسلمان عربی

اور عجمی نہیں بلکہ کلیتاً ہندی اپنی جگہ پر وہ اتنے ہی مسلمان تھے جتنے ہندو اپنی جگہ۔ ہندو۔ دونوں کے دونوں ہندی۔ زبان دونوں کی ایک۔ تہذیب دونوں کی ایک۔ تہذیب ایک رہا مذہب کا تو صاحب مسلمان کو اپنا دین اور ہندو کو اپنا دھرم مبارک ہو۔

کُفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا

عاشقان آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

''سو ہم سب تو ہندی اور عاشقان ہند ہیں۔ ہمارا انگریز کے لائی ہوئی ہندو مسلم فرقہ پرستی کی سوغات سے کیا واسطہ۔ اسے جو کرنا تھا سو وہ کر کے چلا گیا۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے پرکھوں کی میراث کو کس طرح بچاتے ہیں۔''

اس کے بعد بہادر شاہ نے صدر محفل سے رخصت چاہی اور تخت شاہی پر متمکن ہو گئے۔ دیکھنے والی آنکھ نے دیکھا کہ ہر چند کہ وہ روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ مگر ان کا سراپا ایسے رعب شاہی کا مظہر تھا جو خلعت شاہانہ کا ہرگز محتاج نہ تھا۔

اس کے بعد اولیاء اللہ کی مجلس شوریٰ برخواست ہوئی۔ بس حضرت مجددؒ علی ہجویریؒ قطب الدینؒ فریدالدینؒ نظام الدین اور امیر خسرو رہ گئے۔ حضرت علی ہجویری نے پہل کرتے ہوئے کہا ''انہیں حضرت بوعلی قلندر اور معین الدین چشتی نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے اختلاف ممکن نہیں یہ حقیقت ہے کہ اتنے خون خرابے کے بعد جو تقسیم کے جلو میں ہوئے اور آج تک ہو رہے ہیں۔ ہندو پاکستان کے کرتا دھرتا حضرات سے یہ توقع کرنا کہ وہ فوراً ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے سے دوستی کا اعلان کر دیں گے نہ صرف عبث بلکہ حقیقت پسندی کے عین منافی ہوگا۔ انگریزی دور میں باہمی خوف' منافرت اور نفرت کی جو آگ دلوں میں لگی ہے اس کو فوری طور پر بجھانا نہ تو ممکن ہوگا اور نہ قرین عقل۔ لہذا عملی نکتہ نگاہ سے غالباً یہی بہتر ہوگا کہ دلوں کی آگ لگی رہی اور خود ہی نفرت کے اس انبار کو راکھ کر کے رکھ دے کہ اس کے خاکستر سے جو ہندی پیدا ہوگا وہ اس عنقا کی طرح ہوگا جو پہلے اپنی لگی ہوئی آگ میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کی خاک سے دوبارہ پیدا ہوتا ہے ایک بار دلوں کی بھڑاس نکل جائے سو یہی بہتر۔

پھر حضرت مجدد الف ثانی نے مجھے مخاطب کر کے کہا:

''سراج الدین اب بادشاہ کی حیثیت سے اس عمل کی نگرانی کی بڑی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے البتہ ہماری دعائیں اور مشورے تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تم ہوئے نظام الدین ہوئے امیر خسرو ہوئے تم سب ٹھہرے دلّی والے اور دلّی میں فی الوقت جو بھی رہا ہے اور آئندہ جو بھی ہوگا اس پر ہند اور ہندی تہذیب کی بقاء کا دارومدار ہوگا۔ دلّی کے ساتھ ساتھ لاہور کا نام آتا ہے۔ سید علی ہجویری اور فریدالدین ادھر کا کنارہ سنبھالیں گے۔ نگران کا مقام درگاہ اور مسجد ہے۔ جبکہ تمہارا مقام قلعہ معلیٰ ہے۔ دلّی میں بھی اور لاہور میں بھی بس اللہ کا نام لو ہمت کی کمر بستہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے کام میں لگ جاؤ''۔

حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھ ہی علی ہجویری اور خواجہ فرید اس کے بعد تشریف لے گئے اب ہم رہ گئے ہم تین دلّی والے یعنی حضرت نظام الدین، امیر خسرو اور میں۔ حضرت نظام الدین نے قدرے توقف کے بعد فرمایا:

''کیوں صاحبِ عالم سمجھ گئے۔ کام میں تاخیر کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔ ہماری درگاہ کی بغل میں دلّی کا جو نیا شہر بسا ہے۔ وہاں جاؤ اور دیکھو کہ کیا کچھ ہو رہا ہے لاہور جاؤ اور یہ جو پاکستان کا دارالحکومت کراچی بنا ہے وہاں جا کر حالات کا بغور مطالعہ کرو اور ہمیں بتاؤ کہ کیا کچھ ہو رہا ہے کہ اقتدار کے اعلیٰ مراکز یہی تین شہر ٹھہرے۔

طبلِ جنگ تو اب بجا ہی چاہتا ہے۔ ہمارے کانوں میں تو اس کی آواز بھی آنا شروع ہو گئی ہے تم جاؤ دیکھو کون کس کے در پہ ہے۔

''میں ہر قدم اور ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔ اتنے دور دیکھے۔ اتنے بادشاہوں کا سامنا کیا۔ ایک کا اور کریں گے۔ رہا امیر خسرو کا تو انہیں سر دست تنہا چھوڑ دو انہیں اپنے تئیں جتنا سوچنے اور سمجھنے کا وقت دو گے اتنا ہی بھلا ہوگا کہ انجام کار پیش قدمی انہیں کرنا ہوگی۔ آخر اس پوری تہذیب اور زبان کے باوا آدم جو ٹھہرے جس کے تحفظ کا فیصلہ اور تہیہ کیا گیا ہے۔ جاؤ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو''

پانچواں باب

آزادی

ہمارے اجداد نے لگ بھگ چار سو سال پورے ہندوستان یعنی ہندوکش سے لے کر راس کماری تک حکومت کی مگر زندہ باد، مردہ باد کے نعرے کبھی کان میں نہیں پڑے۔ مگر اب صورت حال کچھ ایسی ہو چلی کہ گویا صرف ان دو لفظوں نے نعوذ باللہ، بسم اللہ اور الحمدللہ کی جگہ لے لی ہے۔ جسے سنو بس یہی بولتا بلکہ چیختا سنائی دیتا ہے۔ پاکستان زندہ باد، ہندوستان مردہ باد۔ ان دو نعروں میں ایک نعرہ اور شامل ہو چلا ہے یعنی 'جے ہند' پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے مگر ہندوستان کے عین یوم آزادی کے موقع پر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سے جب ہم نے قلعہ معلّٰی پر نظر ڈالی تو ایک جم غفیر نظر آیا۔ تھالی پھینکو تو سر ہی سر چلی جائے۔ ظاہر ہے یہ لوگ یوم آزادی منانے قلعہ کے باہر اکٹھا ہوئے تھے وہ بے تابی سے کسی کا انتظار کرتے معلوم ہوتے تھے۔ اتنے میں ایک دبلے پتلے، میانہ قد، چمپئی رنگ والے صاحب قلعہ کے صدر دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ ہم نے انہیں بھلا پہلے کاہے کو دیکھا ہوگا کہ ہم ہندوستان سے باہر جلا وطنی کی حالت میں رنگون پڑے تھے۔ ہمیں کیا خبر کہ ہندوستان اور ہماری دلّی میں کون کیا ہے۔ پھر 'جواہر لال نہرو جی کی جے' کے فلک شگاف نعرے فضا میں بلند ہوئے۔ سمجھ گئے کہ یہی ان کے بڑے قائد ہیں۔ جواہر لال نہرو نے بڑی دھواں دھار تقریر کی۔ اسی زبان میں جو ہماری تھی۔ ہم سب کی تھی۔ وہ اردو بول رہے تھے۔ کپڑے بھی ہندوستانی اشرافیت کے پہن رکھے تھے۔ البتہ وہ پاکستان کے

مقابلے میں بھارت... جی ہاں اب بٹوارے کے بعد پاکستان کی حیثیت تو خیر ایک علیحدہ مملکت کی تھی... خود ہندوستان کے دو نام ہو چکے تھے۔ بھارت بھی اور ہندوستان بھی۔

تقریر ختم کرنے کے بعد جواہر لال نہرو نے بڑے زور سے 'جے ہند' کا نعرہ بلند فرمایا۔ جواب میں یہی نعرہ پورے مجمع نے مل کر لگایا۔ ایسا فلک شگاف کہ تھوڑی دیر تو ہمیں جامع مسجد کے گنبد و مینار ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تقریر کے فوراً بعد مجمع ایک دم سے گویا بھیڑوں کا ایسا ریوڑ بن گیا جس کا جس طرف منہ اٹھا چل دیا۔ جواہر لال دیر تک بکھرتی بھیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلاتے رہے۔ مگر اب ان کی طرف کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ کم از کم ہمیں یوں لگا کہ جو کچھ بھی انہوں نے کہا اور لوگوں نے سنا۔ وہ سننے والوں کے سر سے گزر کر رہ گیا۔

جامع مسجد کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر ظہر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد سوچا کہ ذرا نئی دلّی کا رخ کیا جائے۔ دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ پرانی دلّی کی پتا دیکھ دیکھ کر تو اب آنکھوں کا پانی بھی خشک ہو چکا تھا۔ انہیں تو بس اللہ کے حوالے کرتے ہی بن پڑی کہ حضرت نظام الدین کے فرمان کے مطابق تمام سرکاری فیصلوں کا مرکز پرانی دلّی سے اٹھ کر کب کا نئی دلّی جا چکا تھا۔ انگریز دارالحکومت کلکتہ سے اٹھا کر دلّی سے آئے۔ مگر شاہ جہاں آباد نہیں بلکہ اس کے حدود کے باہر نیا شہر آباد کیا اور حکومت کے سارے دفاتر سارے محکمے ادھر ہی اٹھا کر لے گئے۔

انگریز نے نئی بستی اسی بھلاوے میں آباد کی تھی کہ اب وہ گویا سدا کے لئے ہندوستان پر قابض ہو گیا ہے اور وہاں سے اسے کوئی بے دخل کرنے والا نہیں۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیں کہ ابھی اسے وہاں صحیح معنوں میں پیر جمائے پورے بیس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اوپر سے بے دخلی کا پروانہ آ گیا۔ صرف نئی بستی سے نہیں بلکہ پورے ہندوستان سے۔

کسے خبر کہ وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟

نئی دلّی پہنچے' ایک انتہائی صاف ستھرا مگر شہ لطیف اور فن تعمیر سے عاری شہر۔ سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر کے لئے مناسب سہی مگر بالکل سپاٹ' زیبائش سے قطعی مبرا۔

بھلا اب سے سو دو سو برس بعد آنے والی نسلوں کے لئے نئی دلّی کے در و بام کی کیا اہمیت رہے

گی۔ کیا وہ اسے فخر کی اسی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس طرح صدیاں گزر جانے کے بعد آج تک قلعہ معلّٰی اور قطب مینار کو دیکھتے ہیں اور جنہیں دیکھ کر انگریز کی غلامی کے باوجود ہندوستانیوں کے سر بلند ہو جاتے ہیں۔

البتہ نئی دلّی کی جو چیز ہمیں پسند آئی وہ وہاں کی سادہ اور صاف ستھری سڑکیں تھی، دو رویہ درخت، بیچ میں سرسبز باغات، تانگے، بگیاں اور موٹر گاڑیاں بڑے نظم وضبط کے ساتھ سڑکوں پر رواں دواں، وسیع برآمدہ کے نیچے بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ایک طرف ایک وسیع وعریض سرخ پتھر سے تعمیر شدہ محل تھا۔ مغل طرز تعمیر کی انتہائی بھونڈی نقل، معلوم ہوا کہ ملک کے سربراہ حکومت یہیں پر قیام رکھتے ہیں۔

یہ جان کر بڑے حیرت اور خاصی کوفت ہوئی کہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان کا سربراہ ابھی تک کوئی انگریز لاٹ ہے۔ ہمارے لئے یہ بات بالکل ناقابل فہم تھی۔ بادشاہ یا سربراہ حکومت خواہ ہماری طرح بے بس اور بے اختیار کیوں نہ ہو پھر بھی ملک کی آزادی اور شان وشوکت کا نشان ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہوتے ہوئے حکومت اگر چہ کمپنی بہادر کی تھی اور دلّی میں حکم مٹکاف صاحب اور ان کے حواریوں کا چلتا تھا مگر سکہ ہمارے ہی نام کا تھا۔

اس کا کیا مطلب کہ اتنی قربانیوں اور خون خرابے کے بعد آزادی تو حاصل کر لی مگر شاہی محل میں ہنوز فرنگی ہی بیٹھا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ جب جلاوطنی کے حکم کے بعد شہر سے نکل رہے تھے تو راستے میں ایک گرجا گھر پڑا اور ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا:

الٰہی خانۂ انگریز گرجا
یہ گرجا گھر، یہ گرجا گھر، یہ گرجا

مگر بھائی زندگی میں ایسے کون سے نیک کام کیئے تھے جو ہماری دعا مستجاب ہوتی۔ الٹی اپنے گلے پڑ گئی ہماری جلاوطنی کے بعد انگریز نے پورے نوے سال جم کر حکومت کی اور جاتے جاتے ہندوستان میں ایسا نفرت کا بیج بویا جس نے گویا بڑ کے درخت کی صورت اختیار کر لی جس کے سائے تلے کوئی چیز نہیں پنپتی۔ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، پورے ملک کے حصے بخرے

کر کے رکھ دیئے۔ مگر نہ صرف یہ کہ اس کے بعد بھی چین نہیں آیا۔ بلکہ جو جھگڑے فساد پہلے گلی، کوچوں میں ہوتے تھے اب باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

لاٹ صاحب کے محل میں جھانک کر دیکھا تو وہی انگریزی ٹھاٹھ باٹھ، وہی میز کرسی، وہی رنگ ڈھنگ، لاٹ صاحب اور ان کی میم صاحبہ تو خیر تھے ہی فرنگی مگر ان کا ذاتی عملہ بھی انگریز بیرے خانسامے، خدمت گار البتہ سارے کے سارے اور ہندوستانی جس طرح آزادی سے پہلے ان کے آگے جی حضوری کرتے تھے بالکل اسی طرح اب بھی۔

ہماری بڑی آرزو تھی کہ مہاتما گاندھی کو کم از کم ایک آنکھ تو دیکھ لیں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ جشن آزادی میں شرکت کے لئے بھی دلّی نہیں آئے اور یوم آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کلکتہ میں جو ہندو مسلم فساد برپا ہوئے تھے ان سے نمٹنے میں لگے ہیں۔

دلّی کے پرانے قلعے سے گزرا ہوا اور جو نقشہ وہاں دیکھا اسے دیکھ کر لرز گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دلّی کی پوری خانماں برباد آبادی ادھر آ پڑی ہو۔ عورت، مرد، بچے سب کے سب کھلے میدان میں پڑے تھے اور اس پہ یہ موسم برسات، ایسی دھواں دھار بارش کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ گویا یہ بھی عذاب الٰہی ہی کی ایک نشانی تھی۔ گیہوں کے ساتھ تو گھن ہمیشہ ہی سے پستے چلے آئے ہیں اور جب بھونچال آتا ہے، آفات آسمان سے نازل ہوتی ہیں تو نیک و بد میں تمیز نہیں رہتی۔ عورتیں، مرد، بچے سب کھلے میدان میں پڑے تھے۔ اس انتظار میں کہ پاکستان کے لئے جو خصوصی ریل گاڑیاں چل رہی تھیں ان میں جگہ مل جائے۔ ایسے آفت زدہ ماحول میں بھی انسان بہر حال نہ صرف زندہ تھے بلکہ مزید زندگی کے آرزومند ہیں۔

برسرِ اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد

مصیبت اور آفت کے یہ دن بھی کسی نہ کسی طرح، کبھی نہ کبھی کٹ جائیں گے۔ ان اللہ کے بندوں کو کوئی جا کر پوچھے کہ بھائی جس آزادی کا سنہرا خواب تم نے دیکھا تھا کیا یہی اس کی تعبیر ہے۔ چلے تھے آزادی لینے، بربادی سے گلے پڑ گئی۔ گھر سے بے گھر ہوئے اور اب شہر سے شہر بدر ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ جو کچھ اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے تھا اس کے آگے تو غدر

بھی پیچ معلوم ہوا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر بیک وقت افسوس بھی تھا اور غصہ بھی۔ افسوس یوں کہ ہم آفت زدہ بندگان خدا کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے اور غصہ اس پر کہ صاحب عالم تم نے پہلے کیا کر لیا جواب کر دکھاؤ گے۔ تماش بین تھے تماش بین رہو گے۔ ہندوستانی جو ٹھہرے۔ مٹھی بھر سوداگروں کو ہندوستان مفت بخش دیا۔ کیا کہنے ہیں تمہاری سخاوت کے۔ حاتم طائی تمہارے سامنے پانی بھرے۔

اپنے حال زار پر اسی طرح پیچ وخم کھاتے دلّی سے گزر کر ایک بار پھر عازم لاہور ہوئے۔ گویا جو کام زندگی میں اور دور اقتدار... بھلے جیسا بھی تھا مگر نام کو تھا... میں نہ کر پائے اب عالم ارواح میں بار بار کر رہے ہیں ورنہ بھائی ہم کہاں اور لاہور کہاں۔ ہماری پوری مملکت تو بس ہماری خواب گاہ اور دو دیوانوں میں سمائی ہوئی تھی۔ خلعت شاہی پہنی تو ذرا کی ذرا۔ دیوان میں جلوہ افروز ہوئے۔ خلعت اتاری تو واپس خواب گاہ میں۔ اور پھر گویا وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مگر اب تو پورا ہندوستان ہمارے سامنے تھا۔ اولیاء اللہ نے ہمارے ذمہ وہ فرض کیا تھا۔ جسے ہم چار روزہ زندگی میں ادا نہیں کر سکے۔

راستے میں سرہند شریف اور پانی پت تھے۔ سرہند کے حضرت مجدد کی طرف جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صرف اشد ضرورت کے وقت آؤ۔ وقت بے وقت آنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ پانی پت میں بوعلی قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضور تخلیے میں ہیں اور کسی قسم کی مداخلت کا حکم نہیں۔ میں بے مراد وہاں سے لوٹنے ہی والا تھا کہ گویا خود میرے سامنے آ کر کھڑے ہوئے اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ میں نے سلام عرض کیا پتہ نہیں اس کا جواب بھی دیا کہ نہیں۔ جنبش لب البتہ دیکھی آواز نہیں سنی۔ ان کی تیز نگاہیں تیر کی طرح ہمارے رگ و پے میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

''سراج الدین تم نے بھی کچھ سنا؟ اتنا کہا اور ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے جواب ہوتا تھا تو دیتا۔ بس یونہی بت کا بت بنا کھڑا رہا۔

''اگر نہیں سنا تو پھر اب سن لو۔ شمال میں طبل جنگ پہ تھاپ پڑ چکی ہے۔ توپوں کے دہانے کھل

گئے ہیں۔ لاہور جا کر خود ہی دیکھ لینا کہ ان دنوں سب ادھر ہی جمع ہیں۔ اتنا فرمایا اور غائب۔ عجیب کشش و پیچ کی کیفیت تھی۔ ابھی آزادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ جنگ کی نوبت آ گئی۔

لاہور جا کر سیدھا داتا صاحب کے دربار پہنچا۔ وہاں خلق خدا کا ویسا ہی ہجوم تھا جیسا پہلے دیکھا تھا۔ دائیں بائیں دیکھا تو درگاہ کے کونے میں ایک پردہ سا کھنچا تھا جیسے ہی میری نگاہ پردے پر پڑی' آواز آئی۔

''اندر آ جاؤ سراج الدین۔ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔'' میں نے سلام عرض کیا۔ بوعلی قلندر کا سلام و پیغام پہنچایا اور پھر صورت سوال بن کر حضور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس طرح گویا ہوئے:

''پاکستان کے محمد علی جناح' لیاقت علی خان اور ان کے دیگر نائبین ادھر لاہور میں موجود تھے۔ دلّی سے انگریز لاٹ اور سپہ سالار بھی دونوں آج ہی ادھر آئے ہیں۔ باتیں باہمی امن کی تھیں اور تیاریاں جنگ کی۔ کشمیر اب جہنم بننے ہی والا ہے۔

''طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہندوستان تو گویا بادشاہ بھی انگریز اور سپہ سالار بھی انگریز۔ پاکستان کا بادشاہ مسلمان ضرور ہے مگر افواج کے سپہ سالار ادھر بھی سارے کے سارے انگریز۔

''جنگ اب ٹالو نہیں ٹلتی۔ جنگ ہوگی اور عین اس طرح جیسے آزادی سے پہلے ہوا کرتی تھی یعنی سپہ ہندوستانی' ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب اور سالار انگریز۔ عجیب ستم ظریفی ہے۔ بہرحال جو بھی ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔ اللہ کی زمین پر جب اللہ کے بندے اس طرح ظلم کریں جس طرح اہل ہند نے کیا ہے تو پھر زمین بھی بولتی ہے اور جب بولتی اور کروٹ بدلتی ہے تو پھر بھونچال آتا ہے۔ گویا زمین چیخ چیخ کر یہ کہہ رہی ہو کہ تم نے میرے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ میرا تہس نہس کیا اب میں تمہارا تہس نہس کر کے ہی چھوڑوں گی۔

''تم جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھو اور کانوں سے سنو کہ کیا ہو رہا ہے۔ کہنے کو تو انگریز جا چکا ہے مگر عملداری ہنوز اسی کی ہے' حکمت عملی اسی کی ہے۔ صرف شطرنج کی بساط کی دونوں طرف ہندوستانی یعنی ہندی و پاکستانی بٹھا دیے گئے ہیں۔ شاطر وہی انگریز' چالیں اسی کی ہیں۔

اتنا فرمایا اور پھر حضور گویا تخلیے میں چلے گئے۔ میں نے جھک کر خاموشی سے سلام کیا اور الٹے

پاؤں پردے کے باہر آ گیا۔ باہر قوالوں کی ٹولی امیر خسرو کی وہی غزل سرا تھی۔

ستم کم کن کہ فردا روزِ محشر
با پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی
منِ بیچارہ را کُشتی بہ غمزہ
کرم کردی الٰہی زندہ باشی

قوال خوش گلو تھے اور ایک ایک لفظ اس طرح ادا کر رہے تھے کہ ہیرے کی کنی کی طرح دل میں اترا جا رہا تھا۔ سماع کا سماں بندھا ہوا تھا۔ بہت ہی چاہا کہ ذرا کی ذرا وہیں قیام کروں مگر مجھے دماغ نہیں خندا ہائے بیجا کا' وہاں سے گزرتے ہی بنی۔ لاہور شہر کی حالت پہلے سے بھی کہیں بہتر تھی۔ سڑکوں پر خاص چہل پہل تھی۔ مگر فضا شاید پہلے سے بھی کہیں زیادہ بوجھل واقعی ہوئی تھی۔ یہ صرف مجھے لگ رہی تھی اس کا فیصلہ کون کرے۔ معلوم ہوا کہ لاہور کا لاٹ صاحب بھی انگریز ہے اور اپنے اسی محل میں ڈٹا ہوا ہے۔ جہاں آزادی سے پہلے تھا اور خود جناح صاحب اور لیاقت علی قریب ایک دوسرے درجے کے محل میں قیام پذیر ہیں۔

اس روز اپنے انگریز سربراہ حکومت اور افواج کے سپہ سالار کے ساتھ ساتھ جواہر لال بھی جناح اور لیاقت علی صاحبان سے بات چیت کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے۔ مسئلہ وہی کشمیر کا تھا۔ بظاہر تو ان صاحبان کی یہی کوشش تھی کی جنگ کی نوبت نہ آئے اور مسئلہ باہمی گفتگو سے طے ہو جائے مگر اندرخانے جنگ کا نقشہ تیار تھا۔ سرحدی قبائل کشمیر پر ہلہ بول چکے تھے اور ان سے نمٹنے کے لئے ہندوستان کی فوج تیار کھڑی تھی۔ صرف والئی ریاست جموں اور کشمیر کے ضروری کاغذات پر دستخطوں کی دیر تھی۔ جن کے تحت ریاست ہندوستان کے حصہ بن جائے گی اور پاکستان اس سے محروم ہو جائے گا۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

لو صاحب ابھی بنگال اور پنجاب کا مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کشمیر کا قضیہ کھڑا ہو گیا اور وہی

انگریز۔ جناح اور لیاقت علی صاحبان کی قیام گاہ پر پہنچا تو یہ دونوں حضرات معہ جواہر لال اور دو انگریزوں کے باہر صحن میں چہل قدمی کرر ہے تھے۔ ان تینوں یعنی جواہر لال' جناح اور لیاقت علی صاحبان کے چہرے لٹکے لٹکے سے تھے جبکہ دونوں انگریز انتہائی ہشاش بشاش' ایک وردی میں اور دوسرا ولایتی سوٹ میں ملبوس' خوبصورت اور جوان' یہی لاٹ صاحب آزاد ہندوستان کے سربراہ مملکت تھے۔ باوردی جنگی لاٹ کے چہرے پر البتہ ویسی شکنیں جو پرانے سپاہیوں کے چہروں پر ہوتی ہیں۔

جناح صاحب کو پہلی بار دیکھ کر بیک وقت خوش بھی ہوئی اور فکر بھی' عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد مگر اتنے دبلے پتلے بلکہ لاغر کہ برسوں کے بیمار لگتے تھے۔ لیاقت علی خان البتہ فربہ اندام اور میانہ قد' جناح اور جواہر لال کے مقابلے میں ان کے چہرے پر سکون تھا۔ سگریٹ کا دھوئیں پہ دھواں اُڑا رہے تھے۔ جناح صاحب نے ذرا نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک نظر آئی' ایک ایسی چمک جو اکثر پہنچے ہوئے اولیاءاللہ کی آنکھوں میں ہی نظر آتی ہے۔ جواہر لال کو جیسے پہلے قلعہ معلیٰ کے صدر دروازے پر تقریر کرتے دیکھا اور سنا تھا تو وہ ویسے ہی تھے۔ البتہ ان کے چہرے پر بھی فکر اور پریشانی کی جیسے گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔

ان صاحبان کی شکل دیکھنے کے بعد یہ اندازہ کرنا قطعی دشوار نہ تھا کہ ان کا باہمی صلاح ومشورہ بے نتیجہ رہا۔ چہروں پر کشادگی اور اطمینان کی ذرا سی جھلک بھی تو نہ تھی۔ اعلان جنگ کے بغیر ہی اب یہ سب حضرات گویا طے کر چکے تھے کہ اب بجز جنگ چارہ نہیں۔ دلوں کی بھڑاس نکلا ہی چاہتی تھی۔ توپوں کے دہانے کھلنے والے تھے۔ جس آزادی کی یہ ابتداء تھی اس کی انتہا کیا ہوگی۔ اس کے تو خیال ہی سے دل کانپ اٹھتا تھا۔

لاہور میں جو کچھ دیکھا اس کے بعد دل ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ بس ایک سوال ذہن میں بار بار اٹھتا تھا کہ اتنی تباہی جو پہلے ہی ہو چکی ہے اور اب آئندہ جنگ کی صورت میں ہونے والی ہے اس کے بعد اس تاریخی اور تہذیبی ورثے کے تحفظ جو ہمارے ذمے کیا گیا ہے۔ بھلا امکان ہی کیا رہ جائے گا۔ جنگ کی کوکھ سے تو صرف تباہی اور بربادی ہی نکلتی ہے۔ ایسے میں تہذیب کے تحفظ کی کیا بات

کی جاسکتی۔ مگر شاید ہندوستان کی یہی تقدیر تھی اور بزرگوں کا فرمان بھی اٹل تھا۔ جو گناہ اہل ہند نے اپنی دھرتی کے ساتھ کیا اس کا عذاب تو انہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔

لاہور سے نکلے، دریائے سندھ کا کنارہ پکڑا اور حضرت عثمان مروندی اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوا' دریائے سندھ تو بڑی بات ہے۔ ہم نے جمنا کے آگے گنگا بھی نہ دیکھی تھی اور جمنا کا بھی بس وہ کنارہ جو قلعہ کے مشرقی کنارے سے ملتا ہے۔ زبردست دریا تھا۔ موج در موج ٹھاٹھیں مارتا ہوا۔ سندھ پہنچ کر دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا دونوں کا یہی فرمان تھا کہ خدا کی مخلوق پر ادھر جو گزر رہی ہے اسے ہم سنبھال لیں گے کہ یہ علاقہ فی الحال جنگ کی زد سے باہر ہے۔ تم واپس جاؤ اور پنجاب اور دلّی کی فکر کرو کہ سردست جنگ کی منصوبہ بندی ادھر ہی ہو رہی ہے۔ پنجاب ہی کا شہر راولپنڈی افواج پاکستان صدر مقام ہے۔ وہاں جا کر دیکھو کہ کون کیا کر رہا ہے۔ آئی کو تو ٹالا نہیں جا سکتا۔

پھر انہوں نے ذرا توقف کے بعد فرمایا ''اب ادھر آئے ہو تو ذرا سندھ کے صدر مقام کراچی پر بھی نظر ڈال لو کہ ہندوستان سے تباہ حال خلق خدا کا ریلا اور ادھر ہی آیا ہے اور انہوں نے اس شہر میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ جاؤ اور جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ اللہ مالک ہے ان کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔''

کراچی کی حالت بظاہر بالکل پرسکون تھی۔ اس فضا کا جو دلّی اور لاہور اور ایک طرف سے دوسری طرف دوران سفر نظر آتی تھی اس کا تو شائبہ تک یہاں نہیں تھا۔ شہر کے چاروں طرف ریت کے ٹیلے پڑے نظر آئے۔ سڑکیں البتہ بڑی اور کشادہ' درخت بس برائے نام' پناہ کی تلاش میں آئے ہوئے خدا کے بندے کھلے میدانوں میں پڑے تھے۔ لگ بھگ دلّی کے پرانے قلعہ کا نقشہ تھا۔ ہوا اس شہر میں بہت تیز چل رہی تھی۔ دھوپ شدید اور تیز اور سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے رہا تھا مگر شہر بالکل خشک۔

پناہ گیروں کی بستیاں کیا تھیں۔ بس ایک طرف سے دوسری طرف پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کی ٹیڑھی' سیدھی قطاریں تھیں اور جھونپڑیاں بھی ایسی جیسے محرم کی سبیلیں' بس دو چار کھچیاں کھڑی کیں

اور بس اوپر کپڑا تان دیا البتہ ایسے میں کسی قسم کی زیبائش کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا۔ شوق اور عقیدت سے لگائی سبیل اپنی جگہ اور بے گھر بے آسرا انسانوں کے ٹھکانے اپنی جگہ۔

کپڑے اور ٹین کے سائبانوں والی جھونپڑیوں کے باہر عورتیں بیٹھی چولھا جھونک رہی ہیں۔ بچے ریت میں لوٹ رہے ہیں۔ مرد پریشان حال منہ اٹھائے کبھی اِدھر کبھی اُدھر پھر رہے ہیں۔ یہ جان کر البتہ یک گونہ اطمینان ہوا کہ سرکار پاکستان خود اپنی بدحالی کے باوجود جو کچھ بن پڑ رہا ہے۔ ان کے واسطے کر رہی ہے۔ مگر بھائی کب تک۔ سرکار کا خزانہ خالی۔ پناہ گیروں کی بحالی کا مسئلہ اور ان سب سے بڑھ کر جنگ کا خوف جو سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر اِدھر سے اُدھر سے نگاہیں دوڑاتے رہے پھر کراچی اور والوں کو اللہ کے حوالے کیا اور واپس لاہور چل پڑے۔ ادھر پورے شہر میں بس کشمیر، کشمیر کی آوازیں لگ رہی تھیں۔ دلی اور کشمیر کے ہندو راجہ کے مابین گویا انتقال اراضی کے قبالوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اس طرح بس ایک جنبش قلم سے پورے جموں اور کشمیر اور اس کے عوام اور ان کی آنے والی نسلوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ادھر ہندوستان نے اپنی فوج کشمیر میں اتار دی۔ ادھر پاکستان کی فوج نے صفیں سیدھی کیں اور اپنی چوکیاں سنبھال لیں۔ لیجئے صاحب جنگ شروع ہوگئی۔ پوری تاریخ میں سرزمین ہند پر ہونے والی وہیں کے دو پڑوسیوں کے مابین پہلی بین الاقوامی جنگ۔

لاہور سے ذرا کی ذرا راولپنڈی گیا (سچ بات تو یہ ہے کہ اس شہر کا نام ہی پہلی بار سنا تھا حالانکہ یہ بھی سلطنت مغلیہ ہی کا ایک حصہ تھا۔) اپنی نادانی پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا، وہاں بھی بعینہ وہی نقشہ تھا جو دلّی میں دیکھا تھا فوج پر یہاں بھی انگریز ہی کی مکمل عمل داری تھی۔ فوجی صدر مقام پر انگریز چھائے ہوئے تھے۔ یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ ہرچند کہ کشمیر کی لڑائی میں ہندوستان کی افواج برسرپیکار ہیں۔ مگر پاکستان کا انگریز سپہ سالار اعلیٰ جنگ سے متعلق چپہ چپہ کی خبر دلّی میں بیٹھے انگریز فوجی لاٹ کو پہنچا رہا ہے جو عہدے میں اس سے بڑا ہے اور جنگ چھڑ جانے کے باوجود ہنوز ہندو پاکستان کا مشترکہ اور اعلیٰ ترین فوجی کمانڈر ہے۔ گویا ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا۔

راولپنڈی ایک چھوٹا سا شہر، پر چھاؤنی بہت بڑی ہے۔ یہاں فوج کے اعلیٰ ترین حکام نظر

آ ئے۔ گھر اور دفتر کے باہر ان کا سب سے بڑا ٹھکانہ ایک خوبصورت عمارت میں واقع ہے اسے یہاں کی زبان میں پنڈی کلب (ہاں یاد آیا دلّی میں بھی تو ہمارے ہی وقتوں میں ہمارے جدامجد حضور شاہ جہاں جنت مکان کی ایک صاحبزادی روشن آرا بیگم کے نام پر بھی تو انگریز کا کوئی کلب گھر بن گیا تھا) کے صدر دروازے کے عین سامنے ایک وسیع وعریض سبزہ زار تھا۔ وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک انتہائی قرینے سے میز کرسیاں لگی تھیں۔ ہم جب پہلی بار پنڈی کلب گئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ جاڑے کی روپہلی دھوپ چٹکی ہوئی تھی۔ سبزہ زار کی ایک طرف بینڈ باجا' انگریزی دھنیں بجا رہا تھا۔ باقی چاروں طرف افسران والا شان سے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایک طرفہ تماشہ تھا۔ ادھر کشمیر میں جنگ برپا ادھر فوج کے صدر مقام پر صبح صبح یہ محفل نوائے شوق۔ ہمارا فرداً فرداً ہنوز کسی سی تعارف نہ تھا۔ البتہ کالے اور گورے صاف پہچانے جاتے تھے اور ایک جگہ اور ایک کلب میں اکٹھا ہونے کے باوجود گورے گوروں میں اور کالے کالوں میں اپنی اپنی ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے۔ اگرچہ اب گوروں کی حیثیت کالوں کے نوکروں سے زیادہ نہیں تھی مگر رعب انہیں کا تھا حکم انہیں کا چلتا معلوم ہوتا تھا۔

لو صاحب پورا پاکستان دیکھ لیا۔ جہاں تک پاکستان کے دورافتادہ مشرقی حصہ کا تعلق تھا سو وہ بس اللہ کے حوالے وہاں جنگ اور افراتفری کی وہ کیفیت کا ہے کو ہوگی جو ادھر مغرب میں تھی۔ شنید ہے پناہ کی تلاش میں آنے والے بے خانماں لوگ ادھر بھی چلے آرہے تھے مگر اس سیلاب کی طرح نہیں جو مغرب میں آیا تھا۔ ہر چند کہ آبادی کے لحاظ سے وہ مغربی پاکستان سے بڑا تھا مگر رقبہ کے لحاظ سے چھوٹا اور ترقی کے میدان میں پیچھے۔

اتنا کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد دلّی کا رخ کیا۔ حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضری کے لئے درگاہ پہنچا۔ وہاں بھی خلق خدا کا ویسا ہی ہجوم تھا جیسا داتا صاحب کی درگاہ میں دیکھا تھا۔ یہاں بھی قوالوں کی ٹولیاں بیچ صحن میں باجے گاجے سے لیس بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک انتہائی دلنشین انداز میں امیر خسرو کی غزل کا مطلع اٹھا رہا تھا

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

واہ واہ سبحان اللہ بے اختیار منہ سے نکلا۔ پھر خود ہی دل نے کہا: یا الٰہی خیر ہو شاعری کی حد تک تو 'رقص بسمل' کا جواب نہیں مگر اگر یہی رقص شہر کے گلی کوچوں میں برپا ہو اور اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنوں کے خون کی ارزانی ہو تو پھر تو اس کے خیال ہی سے دل لرز جائے گا۔

دبے پاؤں درگاہ کے اس گوشے میں گیا جہاں دونوں حضرات سر جوڑے بیٹھے تھے۔ بس سامنے ایک پردہ سا پڑا رہتا تھا جو اس وقت اٹھا ہوا تھا۔ دونوں کی نگاہیں گویا بیک وقت مجھ پر پڑیں۔ حضرت نظام الدین نے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ ان کے چہرے پر کشیدگی اور کشادگی، فکر اور ایک قسم کی بے فکری کی ایک عجیب سی ملی جلی کیفیت تھی۔ اس کیفیت کی جھلک امیر خسرو کے چہرے پر نظر آئی۔

پھر حضرت اس طرح گویا ہوئے'' کیوں خسرو کی غزل سنی۔ اچھا قوال ہے، اجمیر سے آیا ہے۔ رونا دلّی کا گا رہا ہے۔ معین الدین کا ایلچی جو ٹھہرا۔''

''حضرت کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ خدا خیر کرے'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ٹھیک ہی سمجھے چند روز سے دلّی پھر مقتل بن گئی ہے۔ بس دیوانگی کا عالم ہے۔ چار سو بس رقص بسمل ہے۔''

میرے پاس بجز ایک آہ سرد کے اس کا اور کیا جواب ہو سکتا تھا۔ اسی طرح زانوئے ادب طے کیے بیٹھا رہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔

''خیر یہ تو ہونا ہی تھا۔ اور ہوتا رہے گا۔ تم بتاؤ وہاں پاکستان میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔'' جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس کا مفصل حال ان کے حضور پیش کیا۔

''بچارے کشمیری خواہ مخواہ مفت میں مارے گئے۔ واللہ' ان بچاروں کا یہ حشر ہوگا۔ یہ تو ہم نے بھی نہ سوچا تھا۔ بہر کیف بوعلی اور معین الدین کا کہا حرف بحرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔ البتہ...''

پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا۔

''البتہ یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے کہ شہر کے گلی کوچوں سے لے کر کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں تک جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس طرح دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے یا وہ ارمان نکالے جا رہے ہیں جو دلوں میں ایک مدت سے پروان چڑھ رہے تھے۔

''ایک طرف ہندو کہ مسلمانوں سے محمود غزنوی' شہاب الدین غوری اور خود تمہارے جد امجد ظہیر الدین بابر کے حملوں اور فتوحات کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب اور موقع کے منتظر اور دوسری مسلمان جو ماضی میں اپنی فتوحات اور اقتدار کے زعم میں ایک بار پھر تاریخ دھرانے اور ہندوؤں کو سبق سکھانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ دونوں ہی اس خوش فہمی کا شکار ہیں گویا ماضی کو مستقبل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ کیا طفلانہ خواب ہے۔''

امیر خسرو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے کان شاید غزل پر لگے تھے جو باہر صحن میں بیٹھا لہک لہک کر گا رہا تھا۔ اب وہ غزل کے مقطع پر آ چکا تھا:

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکان خسرو
محمد شمعِ محفل بودٔ شب جائے کہ من بودم

امیر ایک دم سے آبدیدہ ہو گئے۔ ''حضرت اس بھری محفل میں آخر ہو کیا رہا ہے'' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ خود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نظام الدین کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''آخر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ اس کا اندازہ تو ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس میں تعجب کا تو دخل نہیں۔ البتہ جہاں تک پریشانی کا تعلق سو وہ اپنی جگہ ہے۔''

''حضرت قطع کلام کی گستاخی معاف۔ مرزا نوشہ کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ رہا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔'' نظام الدین اور امیر خسرو بغیر کچھ بولے ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے مرزا کا یہ شعر پڑھا:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

نظام الدین اور امیر نے بار بار شعر کی تکرار کی۔ اس کے ایک ایک لفظ کی خود ہی تشریح کی اور جی بھر کر داد دی۔

''کمال ہے اتنے قرب کے باوجود آج تک اس بندہ خدا نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آخر آپ ہیں کون۔ عجب مرد آزاد ہے۔

''ایک دفعہ شاید ان سے کہیں آمنا سامنا ہوا تھا یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی حضرت تھے جن کا شعر آپ نے ابھی پڑھایا کوئی اور...''

مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ دونوں بزرگ ٹھیک ہی تو فرماتے ہیں۔ مرزا کا پورا کلام پڑھ لیں۔ ان کی نثر چھان لیں۔ کم از کم ہمیں یاد نہیں جو انہوں نے کہیں بھی نظام الدین یا خسرو کا ذکر ہو۔ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ ورنہ ان کی بھی وہی درگت بناتے جو حضرت خضر علیہ السلام کی۔ مرزا بھی عجب تھے بالکل یگانہ روزگار۔ ملاحظہ ہو

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

ہمارے اوپر اس وقت چونکہ ہند کی تاریخ اور سیاست چھائی ہوئی تھی اس لئے مرزا کے شعر کا مطلب بھی اس کی روشنی میں سمجھ میں آیا۔ اگر کہیں اہل ہند اس کا صحیح مطلب سمجھ کر اس آزادی یعنی عزت نفس اور خود بینی کا مظاہرہ کرتے جو اس شعر کی اصل جان ہے تو شاید آزادی کے بعد وہ حشر نہ ہوتا جو اب ہو رہا ہے۔

ہم اسی طرح ایک ساتھ بیٹھے بیٹھے مرزا نوشہ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ نظام الدین اور امیر خسرو استادہ ہوئے۔ میں بھی ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

''اچھا پھر خدا حافظ۔ دینا نہ دینا تو اس خالق حقیقی کے ہاتھ میں ہے جس نے دونوں جہانوں کو پیدا کیا جہد اور کوشش البتہ بندے کا کام ہے۔ سو ہم سب مل کر کر رہے ہیں۔

''باقی یہ بیل کب منڈھے چڑھے گی۔ اس بارے میں تو ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ تمہاری روحانی بادشاہت مسلم ہوئی۔ اہل ہند اس طرف لوٹیں گے جہاں مغلیہ خاندان کا چراغ گل ہوا کہ

اس وقت تک ہندو، مسلمان علیحدہ ہوئے بھی ایک تھے، نہ کسی نے تقسیم کا شوشہ اٹھایا نہ ہندو نے مسلمان کی داڑھی پکڑی نہ مسلمان نے ہندو کی چوٹی پر وار کیا۔

کہنے والے چاہیں جو کہیں مگر جس نظام کو ان دنوں سیاسی یا لادینی نظام کہا جا رہا ہے اس کی اصل تو اس نظام میں ملتی ہے جو مغلوں کا تھا، با مسلمان اللہ اللہ با بار ہمن رام رام، اگر وہ چاہتے تو ہندوستان کا نام بدل کر اسلامستان یا ظہیر الدین بابر کی نسبت سے بابرستان رکھ سکتے تھے۔ کسی کی مجال تھے جو ان کے سامنے چوں بھی کرتا۔ مگر انہوں نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں۔ تو پھر جاؤ اور اپنا کام جاری رکھو انشاءاللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی کہ ہندوستان بالخصوص ہندوستان کا وہ حصے جسے وادی گنگا و جمن کہا جاتا ہے اس کی نجاب باہمی صلاح و آشتی کے اس ماحل کی بحالی میں ہے جس کے کرتا دھرتا تمہارے اجداد تھے

اس کے بعد وہ ہارے سر پر از رکاہ شفقت ہاتھ پھیرنا ہی چاہتے تھے کہ مسکرا کے اچانک رک گئے اب تو تمہیں سلامی دیتے ہی بن پڑی گی۔ آخر صاحب عالم جو ٹھرے

اس کے بعد وہ اپنی منزل کی طرف اور میں ذرا شہر کی طرف کہ وہاں چل کر تو دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے سکب سے پہلے قلعہ معلیٰ پہنچا قلعہ اپنی جگہ تھا بس پہرے دار بدل گئے دو خونخوار سے پستہ قد نیپالی صدر دروازے پر کھڑے تھے۔ مرد عوتوں اور بچوں کی خاصی تعداد نظر آئی۔ سیلانی معلوم ہوتے تھے۔ بھلا ان کے علاوہ اب ادھر آئے گا کون اور کیوں۔ ان کے آگے آگے ہاتھ میں نیلے رنگ کی جھنڈی لئے ایک صاحب دیوان خاص کے سامنے کھڑے سیلانیوں کو وہاں کی تاریخ بتا رہے تھے۔ یہ دیوان خاصل ہے یعنی وہ مقام جہاں کمعٓ ل بادشاہ خواش کے ساتھ بیٹھ کر امور سطلنت پر مشوہ کرتے۔ اس کے در و دیوار پر جو جڑاؤ کام آپ دیکھ رہے ہیں اس میں بجائے اصلی ہیرے جواہرات کی جگہ اب نقلی پتھر لگے ہیں۔ اصلی ہیرے جواہرات حملہ آوروں نے لوٹ ئے۔ مسلمان بھی اور دوسرے بھی جو آیا اور اس کے جو بھی ہاتھ پڑا بس لوٹ کر لے گیا ان میں ایران

کے نادرشاہ نے سب سے زیادہ لوٹ مار کی جہاں ہاں یہ وہی نادرشاہ ہے جس نے دلی میں پورے تین روز کیلئے قتل عام کا اعلان کیا اوراس دوران کسی کو نہیں چھوڑا ے کیا مرد کیا عورت کیا بچہ۔

پھر وہ صاحب سیلانیوں کو قلعے کے صدر دروازے کی رف لے گئے اور کچھ اس طرح گویا ہوئے:

کیہ ہے وہ جگہ جس کے باہر ہندستوان کی پہلی جنگ آزادی کے سپاہی میرٹھ سے فتح کے جھنڈے کلھراتے دلی آئے اور انہوں نے بادشاہ بہادرشاہ کو پکارا کہ بادشاہ سلامت آئیں او ہماری کمان سنبھالیں۔مگر بادشاہ سلامت کو بھلا جنگ آزادی اواس کے سپاہیوں سے کیا واسطہ۔وہ تو خواب گاہ میں پڑے اپنی بیگم زینت محل کے ساتھ استراحت فرمارہے ہیں۔

سیلانیوں نے بادشاہ یعنی ہم پر لعنت بھیجی اور بالکل صحیح کہ ہم اس کے مستحق بھی تھے۔کہا اس کا کہ ہم اس قت نواب زینت محل کے ساتھ خوابگاہ می استراحت فرمارہے تھے تو خدا گواہ ہے اور حقیقت یہ بھی کہ ہم اپنی سوچوں میں غلطاں پیچاں لاکھ آنکھیں بند کرتے کہ ذرکا کی ذرا نیند آجائے۔مگر نیند آتی بھی تو کیسے اب تع حکیم احسن اللہ صاحب کے افیونی نسخے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

خدا گواہ ہے نجانے کتنی راکتوں سے بےخوابی کی یہی کیفیت تھی۔آنکھ بند کرتا تو لگتا جیسے آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہیں ہیں۔کھولتا تو چاروں طرف اندھیر کا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔نواز زینت محل کے پہلو میں سونا تو کجا ہم نے تو اپنا بستر بوریا ہی لپیٹ کرایک کونا سنبھال لیا تھا۔بارہا مرزا نوشہ کا شعر دھرکاتے اورسونے کی کوشش میں جاگتے رہتے:

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

ایسی حالت میں کبھی مرزا کو دعائیں دیتا کبھی جی بھر کے کوستا کہ آخر تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ اپنے اشعار سے ہماری راتوں کی نیندیں حرام کردو۔

سو جناب ہم تو پر تو قیامت گزر رہی تھی اور نیلی جھنڈی والے صاحب سیلانیوں کو بتا رہے تھے کہ ہم نواب زینت محل کی بغل میں پڑے محو استراحت تھے۔ لاحول ولا

رہا میرٹھ کے پوربیوں کا تو، میرے بھائی اس بے سری فوج کی کمان سنبھالنا چاہتا بھی تو کیسے اول تو ضعفی کا بوجھ کہ سنبھالو نہیں سنبھلتا۔ دوسرے ہمیں تو صرف اتنا معلوم تا کہ یہ سب کمپنی بہادر کے تنخواہ دار سپاہی تھے۔ اپنے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کر کے انہیں اوران کے بیوی بچوں کو تہ تیغ کر کے اب دلی کی طرف نادر شاہی کرنے آئے ہیں۔ یعنی صرف لوٹ مار اور قتل عام، اسے آپ بے شک ہماری نادانی، حالات سے بے خبری سمجھیں اور سلطنت سے نا قابل لاتعلقی قرار دیں۔ جتنی چاہیں لعنت ہم پر بھیجیں۔ ہمیں منظور۔ مگر خدارا ایسے وقت میں جب کہ معافی پوری دلی بلکہ پورا کہند وستان نرغہ میں آئے ہس اوران پر بلاؤں کا نزول ہو عیش وآرکام کی تہمت تو مت لگائیں۔

و لے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

اب تو افیون بھی ساتھ چھوڑ ی چکی تھی۔ بہر حال تاریخ تو اسی کا نام ہے واقعہ اگر سچ بھی ہو تو بیان میں زیب داستان کا دخل اسے پلٹ کرر کھک دیتا ہے بھلا کہاں ہماری تلاش خواب کی کوشش نا کام اور کہاں ان نیلی جھنڈی والے صاحب کی لگائی ہوئی تہمت پھر بے اختیا میر تقی صاحب کے یہ اشعار یاد آئے:

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے

کس لئے ائے تھے اور کیا کر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں

چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

سبحان اللہ کلام میر ملکوک الکلام میر صاحب کے یہ دو اشعار گویا اس دور ابتلا کی جیتی جاگتی تصویر تے جس کا آغاز حضرت اورنگزیب کی وفا کے بعد ہوا اچھا ہوا جو ایسے وقت قلعہ معلیٰ پہنچے جب نیلی جھنڈی الے صاحب سیلانیوں کے سامنے خود ہماری دھجیاں بکھیر رہے تھے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

کہتی ہے تجھے خلق خدا غائبانہ کیا

قلعہ معلیٰ سے نکلے تو سوچا ذرا ک کی ذرائع دلی کی طرف بھی ہو لیں دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے کون کیا کر رہا ہے جب سے اخبارکات میں ان کی تصاویر اور بڑی تقطیع والے عنوانات تلے چھپی خبریں دیکھی تھیں ۔اس کے بعد ارباب بست وکشاد پہنچاننا آسان ہو گیا تھا۔

جواہر لال اور گاندھی جی کو تو پہلے ہی دیکھ لیا اور پہچان لیا تھا۔ بڑے لاٹ صاحب کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔ البتہ نام ابھی معلوم ہوا۔ لارڈ مونٹ بیٹن، انگریزوں سے چونکہ تمام عمر واسطہ رہا اس لئے ہمیں لاٹ صاحب کا نام دہرانے میں خاص دقت نہیں ہوئی۔ جنگی لاٹ جنرل آکنلیک صاحب بہادر کا نام لینے میں ذرا قباحت نہیں ہوئی۔

ہندوستانی قائدین میں نہرو اور گاندھی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد سردار ولبھ بھائی پٹیل اور دیگر حضرات کا اخبارات کے ذریعے غائبانہ تعارف ہوا۔ مولانا آزاد بڑے تیکھے خدوخال کے مالک تھے خوش پوش اور جا کہ زیب، خالص دلی والی گھٹنوں سے سے نیچی سادہ شیراوانی اور چھوٹی موری کا پاجامہ، آنکھوں پر کالا چشمہ، آشوب چشم کا غماز تھا۔

سردار ولبھ بائی پیٹل کی تصویر ہی دیکھ کر ایک دفعہ تو دہل کر رہ گیا۔ جب انہیں اپنے دفتر کی میز پر بیٹھے اور دوسرے مواقع پر چلتے پھرتے دیکھا تو رعب نے گویا ڈر اور خوف کی صورت اختیار کر لی۔ وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں شاید ہی کبھی ہنسے ہوں۔ ان کی شہرت بھی ہندوستان کے مرد آہن کی تھی اور وہ واقعی ایسے لگتے تھے ماتھے پر شکنوں کا جال۔ تیوری چڑھی ہوئی آنکھیں غصے میں لال پیلی، ناک چپٹی نتھنے فراغ، قد وقامت اور حبثہ درمیانہ، چال ڈھال کا انتہائی فیصلہ کن انداز۔

نہرو کیا ان کے سامنے تو گاندھی جی کی بھی صرف اس قت چلت کجب وہ بھوک ہڑتال یا مرن برت کا اعلان کرتے۔ سنا ہے کہ بٹوارے کے بعد ہندوستان کی طرف سے پاکستان کے حق میں کچھ رقم نکلتی تھی۔ کشمیر کی لڑاء چونکہ چھڑ چکی تھی۔ اس لئے پٹیل صاحب نے پاکستان کو دشمن ملک قرار دے کر رقم لوٹانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر گاندھی جی مچل گئے اور

انہوں نے اپنی بیاض خاص سے نسخہ خاص بعدمرت برت کا اعلان کر دیا جس کے بعد پٹیل صاحب کو ان کی بات ماننے کا اور پاکستان کو اس کی رقم لوٹتے ی بن پڑی۔

ذرکا آگے بڑکر چاندنی چوک آئے۔ یہاں امی جمی تھی۔ البتہ ھنٹہ گھر کے آس پاس پا ولیس فوجی کی چوکی لگی تھی دوکانیں آدھی کھلی اور آدھی بندے معلوم ہوا کہ بند دکانیں کساری کی ساری مسلمانوں کی ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو دلی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے او وہ بھی جو کمارے خوف کے ابھی تک اپنے اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ ویسے ان حالات میں دھندا بھی نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔

آزادی کے بعد گاندھی جی جیسے کچھ بجھ سے گئے تھے۔ زندگی می جس ایک ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اور جس کے تحفظ ا بقاء کیلئے اپنیپوری توانائی وقف کر دی تھی وہ خواب تو کب کا چکنا چور ہو چکا تھا ہندوؤں کا ہندوستان بلکہ بھارت الگ اور مسلمانوں کا پاکستان الگ۔ تاہم اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اب بھی ہندو۔ مسلم اتحاد کسی نکسی شکل میں قائم تھا۔

دلی سے پرانی دلی کے ایک راستے ایک کللکھلے میدان میں لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ میدان کے بیچ گاندھی بیٹھے لوگوں سے خطاب فرمارہے تھے اور سب انئ صبر وسکون سے انہیں سن رہے تھے۔ گاندھی جی کی زبان تو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

پاکستان اور ہندوستان کی باہمی دوستی اور امن، کشمیر میں جنگ بندی اور اس کے پرامن تصفیے سے کہیں زیادہ اب ہندوستانی ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد، محبت اور آشتی کی زیادہ بات کرتے کرے، ایک ہی سانس میں دونوں کو لتاڑ دیتے۔

اگر چہ وہ بہت زیادہ کمزور اور لاغر نظر آتے تھے مگر چہرے پر جھریاں نہیں تھیں۔ بدن کی کھال کہیں بھی لٹکی نہ تھی اور اس میں بلا کی چمک۔ گاندھی کی پراتھنا میں کئی بار بطور خاص گئے۔ ان کی باتوں میں الجھاؤ بڑھا معلوم ہوتا۔ انگریز کے زمانے میں ان کیک طاقت کا منبع انگریز سرکاری کی مخالفت سے پھوٹتا تھا۔ مگر اب انگریز کی سرکار تو جا چکی تھی اور ہندسرکار کی مخالفت کا کوئی جوازن بن کتھا کہ ٹوے پھوٹے ہندوستان ہی کیوں نہ ہو۔ کبھر حال اپنی سرکار تھی۔ اب ان کی حیثیت محض ایک عمر رسیدہ ناصح کی رہ گئی ھی اور وہ بھی ایسا نصح جس کے مشورہ کی ارباب بست وکشاد کو

نصرف چنداں ضرورت نہ تھی بلکہ وہ انہیں دخل او معقولات سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔
کا یک روز حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضور خلاف عادت بہت چپ چپ اور کھوئے کھئے ظرآئے۔
انہیں ٹوکنا ہرگز مناسب نہ تھا لہذا چپ سادھے بیٹھا رہا۔ پھرانہوں نے ذرا گردن اٹھائی اور مجھے جیسے گھور کر یکھا اور امیر خسرو کا وہی مصرعہ پڑھا۔
بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
سراج الدین، انسان ہو یا حیوان موت سے کسی ذی نفس کو مفر نہیں مگر مر کنے اور مار دیئے جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ قتل بھی اگرچہ موت کا ہی نقیب اور اس کا دوسرا نام ہے۔ مگر قتل پھر قتل ہے۔ ہابیل نے پانے بھائی قابیل کو قتل کیا تو دنیا میں فساد اور قتل وغارتگری کی بناء پڑ ؒ۔ ایک فرد کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔
نمی دانم حدیث ناہ چوں است
ہمی دانم کہ عنوانش بخون است
سراج الدین جلد بہت کچھ ہونے والا ہے۔ بہر حال ہو کر رہے گا اسے ٹالنا نہ میرے اختیار میں نہ تمہارے بس میں بہر حال اپنی آنکھیں کلکھلی رکھو دیکھتے رہو اور سوچتے رہو کہمت کر کے پچو چھا: حضرت کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ حضور کا اشارہ کس طرف ہے؟
گادھی کی طرف، ان کی جان کو بڑا خطرہ لاحق ہے کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔
اس کیک بعد وہ خاموش ہو گئے اور منہ قبلے کی طرف کر کے نیت باندھ لی میں نے خاموش سے اازت چاہی اور ہجرے سے باہر نکل آیا۔
گاندھی جی کی جان کو خطرات کے بارے کیں افواہیں ہم نے بھی سنی تھیں۔ یقین نہیں ہوتا کہ بھلا گاندھی جی جیسے بھلے انسان پر کون ہاتھ اٹھائے گا انہیں کون مارے گا مگر بھائی گر ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کر سکتا ہے صرف اس بات پر کہ اس کے نزدیک خدا، یعنی جس ہستی کو وہ خدا سمجھتا تھا اس کے پھل پھول کے نذرا کنؒ ے کے مقابلے میں اس کے بھائی کے قربانی کے جانور کی پیشکش کو

قبول کرلیا تو پھر گاندھی جی کس کھیت کی مولی ہیں۔غور فرمائیں بھلا خدا کا سبزی ترکاری اور گوشت پوست سے کیا واسطہ ۔ لاحول ولا تا ہم انسان پھر انسان ہے۔حماقت اوک خطا کا پتلا۔

گاندھی جی کے دعائیہ اجلاس کا انعقاد کھلے میدان سے ہٹ کرنئی دلی کی ایک پرشکوہ عمارت میں ہونے لگا۔اس کی وجہ بھی شاید وہی افواہ تھی جس کے مطابق گاندھی جی کی جان کو زبردست خطرلاحق تھے۔کھلے میدان کے قابلے میں بند عمارت میں حفظاتی اقدامات کا بہتر بندوبست کیا جاسکتا ہےلہذا اب اجلاس باقاعدگی سے وہیں ہن گلے گاندھی جی ہر روز اپنے مقرر وقت پر دوخواتین کے شانوں پر ہاتھ رکھے آہستہہ آہستہ قدم اٹھاتے ہئے جلسہ گاہ میں آتے۔ان کے ہونوٹوں پر ہمیشہ کی طرح معصوم بچوں کی سی مسکراہٹ رہتی۔وہ اپنی نشست پر تشریف رکھتے۔لوگوں کو پرنام کرتے اوراپنے واکھیان (جی ہاں اس لفظ کا اضافہ ہماری لغت میں آزادی کے بعد ہوا) شروع کردیتے۔

ایک شام حسب معمول جلسہ گاہ میں آئے اس رکز معمول سے زایدہ لوگوں کا ہجوم تھا۔بیچ میں جو راستہ ان کے گزرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ اتنا تنگ تھا کہ ہجوکم کے کھوے سے گاندھی جی کا کھوا چھل رہا تھا۔وہ راستہ طے کرکے جیسے ہی اپنی نشست گاہ تک پہنچے کہ ایک نوجوان کی جانب بڑھا انہیں پرنام کیا۔ان کے پیر چھوئے پھر کھڑے ہوکر اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اورداغ دیا۔عین گاندھی جی کے سینے پر۔ان کے منہ سے ہائے رکام نکلا اور وہیں ڈھیر ہوگئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جلسہ گاہ میں کہرام مچ گیا۔ہمارا دل توک سچ مچ دھل کررہ گیا۔یااللہ یہ موذی کون تھا جس نے گاندھی جی پر گکلی چلائی۔ خدانہ کرے جوکوئی مسلمان ہوورنہ ہندوستانی مسلمانوں کے سرپر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔جلسہ گاہ سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، ہندوستان کے مرد آہن سردار پٹیل اوران گنت دوسرے بڑے لوگوں کو آتے دیکھا۔سب انتہائی سوگوار اور پریشان لگتے تھے جیسے سب کی کمرٹوٹ گئی ہو۔ظاہر ہے گاندھی جی تو پورے ہندوستان کے باپ تھے۔ان کا اس طرح دنیا سے اٹھاجانا اوروہ بھی ایک بدبخت موذی ہندوستانی کے ہاتھوں قیامت سے کم تو نہ تھا۔

ابھی تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہات ھا کہ آخر سفاک قاتل ہندو تھا کہ مسلمان۔ کہمارے اپنے دل کو دھڑ کا لگا تھا۔ ہم اللہ تعالی سے مستقل یہ دعا کرر ہے تھے کہ مسلمان نہ ہو۔ پہلے سب کا دھیان مسلمان پر ہی لگا تھا۔ مگر جلدی معلوم ہو گیا کہ قاتل ہندو ہے۔ یہ جان کر ذرا جان میں جان آئی۔ گاندھی تو وہاں چلے گئے۔ جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔ پریشان تو پسماندگان کی طرف سے ہوتی ہے اور ادھر ان لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں کی زیست وموت کا سوال تھا جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ یہ کس کا بٹوارہ تھا کہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور الجھ کر رہ گیا۔

قاتل کا نام پتہ، مذہب معلوم ہو جانے کے بعد بھی سلمان انتہائی سہمے سہمے تھے ک گاندھی جی کا سایہ ان کے سروں پ بھی تھا جواب ہمیشہ کیلیئے اٹھ گیا تھا۔ جواہر لال اچھے انسان تھے، مسلمانوں کے ہمدرد بھی، مگر سردار پٹیل کے آگے خاصے بے بس ہو کر رہ گئے تھ گاندھی کجی کے خود ایک ہندو جنونی کے ہاتھوں قتل کے بعد سردار صاحب مسلمانو کے سلسلے میں ذراء سنبھل گئے تھےؔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ حقیقت تو کھل کر سامنے آ گئی تھی ک پاگل کی کوءذات کوئی مذہب نہں ہوتے۔ کوئی بھی کسی وقت پاگل ہو سکتا ہے۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہیں۔

گاندھی جی کا قتل کشمیر کی جنگ کے آغاز کے بعد آزاد ہندوستان کا اہم ترین سانحہ تھا ہم نے خود اپنے کانوں سے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ اس سے تک انگریز رکاج ہی بھلا تھا۔ بھیڑار بھیڑیا ایک گھٹا پانی پیا کرتے تھے۔ میاں سچ تو یہ ہے کہ شاید ہندوستان اور آزادی دونوں ساتھ ساتھ چل کہی نہیں سکتے۔ برسوں سے غلام چلے آرہے تھے۔ اب آزادی ملی ہے تو بس آپے سے باہر، مادر پدر آزاد۔

گاندھی کجی کے سفا کانہ قتل پر بھلا کس کو صدمہ نہ تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حودان کی زندگ یمیں ہندوستان کی قومی اور سیاسی تاریخ میں ان کا موثر کردار ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ صرف پراتھنا کرتے تھے لوگوں کو ڈانٹ پلا سکتے تھے۔ برا بھلا کہہ سکتے تھے مگر ان کا حکم کسی پر نہیں چلتا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اور بھی غیرمؔ ولا اور لاچار ہو کر رہ جاتے۔

امکان تو غالب تو یہی تھا۔ بہر حال ایک بڑے طبقے کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر وہ رہتے تو کشمیر کی

لڑائی ختم کرانے اور ہندوستان پاکستان کے مابین دوستانہ تعلق قائم کرے میں وہ یقیناً موثر کردار ادا کر سکتے تھے۔ اپنے قتل سے نہ صرف چندروز پہلے انہوں نے اپنے دورہ پاکستان کا اعلان کیا تھا۔ جناح صاحب بیماری کے باوجود ابھی پوری طرف فعال تھے۔ اور اگر گاندھی کا دورہ پاکستان کا منصوبہ پورا ہو جاتا اور ان کی ملاقات جنگ آزادی میں پرانے ساتھی اور حریف محمد علی جناح صاحب سے ہو جات تو ہو سکتا تھا کہ وہ بلائیں جو آگے چل کر ہندوستان او پاکستان پر نازل ہوئیں۔ نازل نہ ہو پاتیں مگر اس کا تعلق تاریخ کے اس اگر سے ہے جس کا جواب اور توڑ کسی کے پاس نہیں۔

کشمیر کی لڑائی پورے زور وشور سے جاری تھی دونوں طرف انگریز سپہ سالار اور سپہ ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف پاکستان۔ معلوم ہوا کہ اب انگریز باہر سے ثالثی کیلئے آ رہے ہیں بہت خوب انگریزوں کے ساتھ ساتھ اب امریکیوں کا نام اخبارات میں نظر آنے لگا۔ یہ امریکی کون ہیں؟ ہمارے وقتوں میں ان کا چرچا نہ تھا اور را گر ہوگا بھی تو ہمیں کیا معلوم۔ انگریزوں سے فرصت ملتی، ان سے جان چھٹتی تو امریکیوں پتہ پوچھتے۔ مارے بھی وہ چلائے بھی وہ بہت خوب۔

ادھر پاکستان سے جو خبریں مل رہی تھیں حوصلہ شکن تھیں سنا ہے افغانستان پاکستان کے شمال مغربی علاقے کا مطالبہ کر رہا ہے بالفاظ دیگر ایک پرانا اور تاریخی مسلم ملک پاکستان کی نوزائدہ مملکت کے درپے ہے مذہب اور سیاست کی آمیزش اوک آویشن دونوں بری ان دونوں کے منصوبے سے اگر دور ہی رہا جائے تو بہتر ہوگا کم از کم ہم نے اور پرکھوں نے تو یہی کیا۔ غلبہ اور رعب سلطنت کی بات اور ہے خواہ کسی کا اوک کیا کیوں نہ ہو۔ محکوم بہرحال اس سے مطمئن ہو سکے باوجود خوش نہیں ہوسکتا ہندوستان اس کلئے سے باہر نہیں۔ دلی گھوم گھام کر پاکستان کا قصد کیا۔ معلوکم ہوا کہ جناح صاحب بہت علیل ہیں اور بغرض علاج کی صحت افزا پہاڑی مقام پر چلے گئے ہیں ان کی جلد صحتیابی کیلئے دعا کی اس سے زیادہ او کر بھی کیا سکتے تھے۔ دلی میں تو گاندھی جی کے قتل کے بعد ابھی تک غم اور غصے کا دور دورا تھا کراچی میں البتہ گہما

گھی کنظر آئی ۔ بازاروں میں ایسی رونق جوزندگی میں بھی گاہے گاہے دیکھی ہگی ۔ دکانیں نہ صرف کھلی بلکہ گاہکوں س بھری بھری ۔ یہاں کے صدر بازار کی وہی حیثیت ہے جو دلی کی چاندنی چوک کی ۔مگر یہاں کے کقابلے میں چچاندنی چوک اجڑا دیارلگتا تھا۔ ہیاں تو سیلانیوں کا ہجوم تھا۔شکل سے باکلل بےفکرے لگتے تھے ۔جلاطنی کے عذاب کو گویا بھول چکے تھے ۔ معلوکم ہوتھا تھا جیسے نہ تو گھرک سے بے گھر ہوئے اور نہ ہی اپنے شہراو وطن سے اوشاید اس شہر کراچی کی ہوا ہی ایسی ہے جتےٗنی تزی سے چلتی ہے اتنی تیزی سے لگ بھی جاتی ہے ۔

یہ حال تو تھا شہر کے مرکزی اور تجاری علاقے کا۔ جہاں تک پاہ گیروں کی جھونپڑیوں مقامی بولی ٹھولی میں جھگیوں کا تعلق ہے سو وہ شہر کے ایک سرے سے دہی وسری طرف پھیلتی جارہی تھیں کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے اطراف میں بس جھگیاں (لیجئے صاحب اردو معلیٰ ختم ہوئی اور ہم بھی جھگیوں میں اترائے) جھگیاں تھیں ۔مگر بظاہر یہاں کے ساکنوں کی حالت ابھی پہلے سے بہتر نظر آئی ۔عورتیں اگرچہ اب بھی باہر بیٹھیں ہانڈی چولہا کررہی تھیں ۔مگر اب انگیٹھی میں پچھیوں کی بجائے کوئلہ تھا کپڑے بھی نسبتاً بہتر تھے ننگے بچوں کے بدن پر کپڑا تھا صرف ادھیڑ اور بوڑھے مرد بان کی کھٹولیوں پر بیٹھے حقہ اور چائے سے شوق فرمارہے تے جوان کم ہی نظر آئے ضور کسی دھندے سے لگ گئے ہوں گے اس طرح پاکستان کی حالت غیر ہوتے ہئے بھی بہرحال مای سے کہیںٗ بہتر تھی ۔دلی کی تو خیر بات ہی کیا ہنسی میں بھی روتی دکھائی دیتی ہے رونی صورت جوٹھری ۔

اس بار کراچی کو خوب گھوم گھام کر دیکھا گنتی کی عمارتوں بازاروں اور ردرختوں کو نکال دو تو لق ودق صحرا معلوم ہوگا البتہ عمارات بری نہ تھیں گو حس تعمیر کا شائبہ تک نہیں تھا مگر ہر عمارت اپنی جگہ صاف ستھری اور روزمرہ کے کام کیلئے موزوں آبادی دلی اور لاہور کے مقالے میں یقیناً کم ہوگی ۔سڑکیں انتہائی وسیع اور کشادہ اور آبادی میں کمی کی نسب سے اور بھی وسیع اور کشادہ لگتیں تھیں ۔اچھا شہر تھا ہوا اگرچہ مرطوب تھی مگر چوبیس گھنٹے چلتی تھی دلی اور لاہوور کے حبس تو ہم جیسے بھول چکے تھے ۔

کراچی کے ساحل پر زندگی میں پہلی بار سمندر اور وہاں پر لنگر انداز بڑے بڑے جہاز دیکھے اس سے پہلے تو شاید شاہی بجرے سے بڑی ہم نے کوئی کشتی تک نہیں دیکھی تھی۔ کبھی سال میں دو چار بار اس میں بیٹھ کر دلّی سے فرید آباد تک سیر کو نکل جاتے۔ مگر یہ سمندر تو گویا پانی کا صحرائے اعظم تھا۔ تا حد نظر پانی ہی پانی اور وہ بھی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گویا گھڑ سواروں کے دستے سرپٹ دوڑ لگا رہے ہوں۔ ایک موقع پر ایک بڑے مگر مچھ کو ساحل سمندر پر اونگھتے دیکھا' کچھوے بڑی تعداد میں ایک طرف پڑے دھوپ سینک رہے تھے۔

ابھی ہم کراچی میں تھے۔ اخبارات کے مطابق ادھر جنگ کشمیر چل رہی تھی۔ ادھر لیاقت علی اور جواہر لال آپس کی زبانی بیان بازی بلکہ تو تو میں میں لگے تھے ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ کراچی کی بڑی شاہراہ کو دھویا جا رہا ہے وہاں آرائشی محرابیں لگائی جا رہی ہیں۔ ایک خاص قسم کی گہما گہمی اور سرگرمی ہے۔ شاہراہ کے ایک سرے پر واقع عمارت کو بہت سلیقے اور اہتمام سے سنوارا گیا ہے۔ اخبارات کی سرخیاں' (جی ہاں سرخیاں اخبارات دیکھتے دیکھتے تھوڑی بہت اخباری زبان بھی آ ہی گئی) دیکھیں تو معلوم ہوا کہ قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کے بڑے بینک کے افتتاح کیلئے کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ پورا شہران کے استقبال کی تیاری میں لگا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اور جان کر یک گونہ خوشی ہوئی کہ چلو اب شاید ابتلا کا دور ختم اور تاریخ کا روشن باب کھلا ہی چاہتا ہے۔

سو لیجئے صاحب پاکستان کے قائد اعظم محمد علی جناح آخر کراچی تشریف لے ہی آئے۔ ان کے ساتھ ایک عمر رسیدہ مگر چاق و چوبند' بلا کی چمکیلی آنکھوں اور چاندی جیسے سفید بالوں والی خاتون شاہی بگھی میں سوار تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ان کی ہمشیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ بگھی میں دو حضرات اور تھے۔ ایک اچھی عمر کے اور دوسرے جواں سال باوردی۔ بگھی نپے تلے انداز میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ باہر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ وہ سب با آواز بلند پاکستان زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں نعروں میں ایک زوردار نعرہ سنائی دیا' شہنشاہ پاکستان زندہ باد' یہ نعرہ سن کر ہمیں اپنے حال پر ہنسی آئی۔ بادشاہت ختم ہوئے زمانہ گزرا قلعہ اور دلّی

دونوں کب کے اجڑ چکے۔ مگر شہنشاہ زندہ باد کا نعرہ ابھی باقی تھا۔شہنشاہ خواہ شطرنج کا ہو خواہ ہماری طرح کا'از دلّی تا پالم' بہر حال شہنشاہ ہے اس کا جاہ وجلال نہ سہی نعرہ تو باقی ہے۔

ہم نے قائداعظم کو قریب سے نظر بھر کر دیکھا تو پہلے سے بھی زیادہ نحیف ونزار نظر آئے۔ چہرہ کے اوپر کی ہڈیاں صاف نظر آتی تھیں۔گال بالکل پچک کر رہ گئے تھے۔البتہ آنکھوں کی چمک پہلے سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ بالکل ایسا لگا کہ جیسے شمع گل ہونے سے پہلے ایک دم بھڑک اٹھی ہو۔ ان کے ہونٹوں میں ایک قسم کی لرزش سی تھی اور مسکرانے کی کوشش میں ان کی زبان کی نوک ذرا کی ذرا باہر نکلتی مگر پھر وہ جلد ہی اسے اندر کر لیتے۔کمال ضعیفی کے باوجود ابھی تک انہیں اپنے جسم کی حرکات وسکنات پر مکمل اختیار تھا۔

قائداعظم ہاتھ ہلا ہلا کر اور روکھے منہ مسکرا مسکرا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ ہجوم ان کی بگھی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ان کی آنکھیں اپنے قائد کیلئے عقیدت اور احترام سے لبریز تھیں۔ایسے میں ہمیں اپنا وقت یاد آ گیا کہ جب ہماری سواری قلعہ معلّٰی سے مہر دلی یا غیاث پور کیلئے نکلتی تو اسی طرح لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے۔لاکھ بے بس ہونے کے باوجود ہم عوام کے محبوب بادشاہ رہے۔ ہمارے لئے ان کی محبت اور عقیدت میں شاید ہی کوئی کمی آئی ہو۔

امور مملکت سے رشتہ منقطع ہونے کے باوجود عوام سے ہمارا رشتہ سدا قائم رہا۔وہ بھٹکے ہوئے پور بیئے سپاہی بھی ہمارے ہی پاس آ کر بضد ہوئے کہ ہم ان کی کمان سنبھالیں اگرچہ یہ ان کی صریحاً حماقت اور سادہ لوحی تھی۔مگر ان کے دلوں میں ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے لئے جو محبت اور عقیدت تھی اس سے تو انکار ممکن نہیں۔

لیجئے صاحب اس عمارت خاص جس کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ پر پہنچ کر قائداعظم کی سواری ٹھہر گئی۔سب سے پہلا وہ باوردی جوان (جو یقیناً ان کا ایڈی کانگ ہوگا) بگھی سے اترا۔ اس کے بعد اس نے انتہائی ادب اور آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر قائداعظم کا ہاتھ تھاما اور بگھی سے اترنے میں ان کی مدد کی پھر ان کی ہمشیرہ اور ان کے بعد ادھیڑ عمر کے وہ صاحب جوان کے ساتھ بگھی میں بیٹھے تھے۔

ادھر قائداعظم نے زمین پر قدم رکھا ادھر ہجوم نے ایک بار پھر بے قابو ہو کر شہنشاہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کئے ہمیں آگے چل کر معلوم ہوا کہ ان نعروں کی جذباتی اور تاریخی اہمیت کے ساتھ موقع محل کی اہمیت کا بھی دخل تھا۔ اس روز پاکستان خود اپنا سکہ جاری کر رہا تھا۔ اس طرح گویا پاکستان کی علیحدہ حیثیت پر ایک اور مہر تصدیق ثبت ہو رہی تھی یہ جان کر ہمیں یک گونہ خوشی ہوئی اور دل سے پاکستان اور اس کے عوام کیلئے دعا نکلی۔

قائداعظم بگھی سے اترے آہستہ آہستہ مگر قدم جما کر اپنی محترم ہمشیرہ اور ایڈی کانگ کی معیت میں اس حصہ خاص کی طرف بڑھے جو موقع کی مناسبت سے ان کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ تقریب میں مدعو سارے مہمان جو باادب کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک قائداعظم اور ان کی ہمشیرہ محترمہ اپنی اپنی اونچی پشت والی آراستہ کرسیوں پر تشریف فرما نہیں ہو گئے کرسی پر بیٹھنے میں ان کے ایڈی کانگ نے ان کی مدد کی۔

اس کے بعد تلاوت قرآن، پھر ان صاحب کی تقریر جو جناح صاحب کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر آئے تھے معلوم ہوا کہ ملک کے سب سے بڑے بینک کے یہی سربراہ ہیں۔ شیروانی اور چشمے سے لیس، اس کے بعد جناح صاحب کا خطاب۔ ان کا تنفس اگرچہ قدرے تیز تھا اور نقاہت کے باعث وہ بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرتے مگر ان کی آواز میں بڑی توانائی تھی۔ ہمیں تو ایسا لگا کہ بولنے والا کوئی اور، اور آواز کسی اور کی ہے۔ اگرچہ خطاب کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے سے لگے مگر آواز میں ذرا بھی کمی نہیں آئی اور ادھر ان کا خطاب ختم ہوا ادھر فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ مہمانوں کے چہرے فتح و کامرانی کے احساس سے دمکتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد جناح صاحب نے فیتہ کاٹا اور اس طرح گویا بینک کا افتتاح ہو گیا۔

آئندہ چند روز ہم نے پاکستان ہی میں کراچی، لاہور، راولپنڈی کے چکر لگاتے گزارے حتیٰ کہ پشاور تک جا پہنچے اتنے برسوں میں پہلے باران پٹھانوں کو دیکھا جنہوں نے حضرت جلال الدین اکبر جنت مکانی کی افواج کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ قدیم شہر تھا۔ شہر کے بڑے بازار کے بیچوں بیچ بیٹھے کمبل پوش قبائلی کھلے بندوں اسلحہ کا کاروبار کر رہے ہیں وقفے وقفے سے

بندوقوں سے ہوائی فائر کرتے جا رہے ہیں۔ ایسا منظر بھلا ہم نے پہلے کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ پہلے کچھ گھبرائے پھر عادی ہو گئے۔

پشاور سے شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعے یہاں کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خاں سے بھی غائبانہ تعارف ہوا۔ ان کی ادھر وہی حیثیت تھی جو دلّی میں سردار پٹیل کی تھی جس طرح وہ ہندوستان کے مرد آہن تھے۔ اسی طرح خان عبدالقیوم خاں سرحد بلکہ پورے پاکستان کے مرد آہن کلے ٹھلے میں البتہ وہ سردار پٹیل سے کہیں سوا' دونوں میں کسی قسم کا موازنہ ممکن نہیں آگے چل کر یہ بھی معلوم ہوا کہ جنگ کشمیر کا آغاز بھی انہیں صاحب نے کیا۔ انہوں نے ہی قبائلیوں کو جہاد کشمیر کی ترغیب دی۔ انہیں ہتھیار اور دوسری سہولتیں مہیا کیں مگر قبائلی بہر حال' بہر صورت قبائل ٹھہرے۔ ان کی صورت عملاً اس بے سری فوج کی تھی جو میرٹھ کے باغیوں کی تھی لہذا اپنی منزل مقصود یعنی کشمیر پہنچ کر تنظیم اور ضابطے کے فقدان کے باعث اکثر واپس لوٹ آئے۔ باقی جو رہ گئے تھے انہوں نے البتہ داد مردانگی دی۔

کسی اپی کے فقیر کا ذکر بھی سنا کہ نہ صرف صاحب کرامات تھے بلکہ فن جنگ کے بھی ماہر انگریزوں کے خلاف اپنے علاقے میں ہونے والی آزادی کی جنگ میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا اور انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے۔ مگر اب نہ صرف آزادی کی آمد بلکہ پاکستان کی مملکت اسلامیہ کے قیام کے بعد بھی ان کا جہاد جاری تھا اور اس دفعہ ان کا ہدف خود پاکستان تھا۔ ہماری سمجھ میں تو خاک نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ تقسیم ہوئی۔ انگریزوں کا منہ کالا ہوا۔ ادھر پاکستان اور ادھر ہندوستان میں قائدین نے اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیں۔ پھر وہی کی دہی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی چکی کے پاٹوں تلے کشمیر پس رہا ہے۔ افغانستان اور اپی کے فقیر صاحب پاکستان کو للکار رہے ہیں۔

پشاور سے نکلے تو ذرا کی ذرا لاہور پہنچے۔ داتا صاحب کے دربار پر حاضری دی۔ مگر ملاقات کا یارا تھا نہ جواز' آخر ان سے کہتے بھی تو کیا کہتے۔ گرد و پیش کا تو انہیں ہم سے زیادہ ہی علم ہوگا اب رہا خود ہمارا تو ہماری تو وہ کیفیت تھی۔

شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

ابھی تو خود ہی حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ حضور کی خدمت میں کیا عرض کرتے۔ آخر ہم نے کونسا تیر مار لیا۔ لاہور کی حالت بہت سنبھل چکی تھی۔ دوکانیں سب کی سب کھلی سڑکوں پر چہل پہل۔ یہاں کے لوگوں بہت بھلے' خوش پوش اور زندہ دل۔ انہیں اس طرح دیکھ کر یک گونہ اطمینان اور خوشی ہوئی۔ حضرت نورالدین جہانگیر کے مقبرے پر بھی حاضری دی۔ اب کے یہاں بھی رونق تھی سیلانی بیٹھے خورد ونوش اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی طرح جیسے کسی زمانے میں حضرت نصیرالدین ہمایوں کے مقبرے پر۔ زندگی اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ ایک بار پھر لوٹ کر آ گئی تھی۔ اس کے بعد ملکہ نور جہاں کے مقبرے پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور وہیں تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ اور حضرات بھی تھے مجاور معلوم ہوتے تھے۔ یقیناً پینک میں تھے آنکھیں چڑھی ہوئی اور منہ کھلے ہوئے ہونق کے ہونق۔

لاہور کا قلعہ دیکھا پھر دو رکعت نماز کیلئے نماز کیلئے شاہی مسجد گئے۔ وہاں عین نماز کے دوران باجے' گاجے کی آواز آئی۔ سلام پھیرا اور مسجد سے نکل کر دیکھا تو مسجد کی بغل میں رنڈیوں کا بازار تھا۔ بالکل جیسے ہماری دلّی میں جامع مسجد کی پشت پھر چاوڑی ہوا کرتی تھی۔ مرزا نوشہ نے یہی کچھ دیکھ کر تو کہا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے

کوٹھوں پر گانا بجانا ہو رہا تھا۔ بازار شوقینوں سے پٹا پڑا تھا۔ رنڈیاں اپنی اپنی دوکانیں سجائے بیٹھی تھیں۔ دوکانوں کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے۔ پان والوں کی دوکانوں پر جمگھٹا تھا۔ پان کی گلوری منہ میں دبائے اور وہیں بلا جھجک پیک تھوکتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے' رنڈیاں تو ہم نے بھی بہت دیکھی ہوں گی مگر رنڈی خانہ کا تو تصور تک نہ تھا۔ لاحول پڑھی اور ادھر سے سیدھے نکل گئے۔

راستے میں مسجد وزیر خاں دیکھی۔ بہت پرشکوہ مسجد تھی۔ نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ باجماعت پڑھ لی جائے۔ نمازیوں کی صرف ایک صف تھی۔ وہیں ایک کونے میں کھڑے ہو کر

مغرب کی نماز ادا کی ۔ایک رات اور لاہور میں گزاری ۔اس کے بعد کراچی کا قصد کیا۔

کراچی ابھی پہنچے ہی تھے کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم محمد علی جناح رحلت فرما گئے ۔اناللہ وانا الیہ راجعون ۔ابھی گاندھی جی کو اس جہان فانی سے اٹھے کتنے دن ہوئے تھے کہ جناح صاحب بھی اٹھ گئے ۔ خدا خیر کرے ۔اب پاکستان کا کیا ہوگا۔ اس خیال ہی سے ہمارا دل گویا ڈوبنے سا لگا۔

اس روز جو حالت ہم نے کراچی کی دیکھی وہ بھولے نہیں بھلائی جاسکتی۔ کوچہ و بازار سب ویران مگر جہاں ان کی تجہیز وتدفین کا بندوبست کیا جارہا تھا ادھر خلق خدا اس طرح بھری تھی کہ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی ۔اتنا بڑا مجمع ہم نے گاندھی جی کی وفات کے وقت بھی نہ دیکھا تھا۔ میت ایک گاڑی پر رکھی تھی جسے سفید وردی والے سپاہی کھینچ رہے تھے۔ایک کونے میں لیاقت علی خاں کالی شیروانی میں ملبوس اکیلے بیٹھے تھے۔ان کے چہرے پر غم واندوہ اور سوچ وفکر کے ایسے آثار تھے کہ فیصلہ کرنا دشوار کہ کون کس پر حاوی ہے۔ ہمیں تو فکر کے آثار ہی غالب نظر آئے ۔وہ اکیلے رہ گئے تھے ۔اپنی پوری سیاسی زندگی اور جدوجہد محمد علی جناح کے سایہ عاطفت میں گزاری ۔اب چونکہ ان کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سر سے اٹھ گیا تو فکر اور پریشانی تو لازم ٹھہری۔ پاکستان کے وہ وزیراعظم ضرور تھے۔ مگر نہ سندھی' نہ پنجابی' نہ پٹھان' نہ بلوچی' نہ بنگالی' بنگالی تو ویسے بھی پاکستانی آبادی کی اکثریت ہو کے بھی مرکز سے اتنی دور پڑے تھے۔

محترمہ فاطمہ جناح کو بھی دیکھا وہ بھی کالے کپڑوں میں ملبوس' ان کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں مگر مجال جو ذرا بھی آواز نکلے۔ بس مرقع اندوہ الم بنی کھڑی تھیں ۔لیاقت علی خاں کا تو ہادی ورہبر گیا مگر محترمہ کا تو ماں جایا اور اس سے بھی کہیں زیادہ پوری زندگی کا دوست اور ساتھی وہ جناح کی بہن بھی تھیں' ماں بھی تھیں اور ہمدم دمساز بھی ۔ بھائی کی خدمت میں تمام زندگی کنواری رہیں۔

لیاقت علی کے ساتھ ایک باریش بزرگ ململ کی اونچی باڑھ کی دو پلی ٹوپی اور کرتے پائجامے میں ملبوس بیٹھے تھے۔ پتہ چلا کہ ان کا شمار پاکستان کے معماروں میں سے ہوتا ہے۔ ہر چند کہ ان کا اصل تعلق صرف دین سے تھا۔البتہ اس مذہبی یا نظریاتی سیاست' جس کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک

مغرب کی نماز ادا کی۔ یک رات اور لاہور میں گزاری کا س کے بعد کراچی کا قصد کیا۔
کراچی ابھی پہنچے ہی تھے کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا کمعلوم ہوا کہ قائداعظم محمد علی جناح رحلت فرما گئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ابھی گاندھی جی کو اس جہان فانی سے اٹھے کتنے دن ہوئے تھے کہ جناح صاحب بھی اٹھ گئے۔خدا خیر کرے۔ اب پاکساتن کا کیا ہوگا اس خیال ہی سے ہمارا دل گویا ڈوبنے سالگا۔
اس روز جو حالت ہم نے کراچی کی دیکھی وہ بھولے نہیں بھلاء جا سکتی۔کوچہ و بازار سب ویران مگر جہاں ان کی تجہیز و تدفین کا بندوبست کیا گجا ہا تھا ادھر خلق خدا اس طرح بھی تھی کہ تل رکھنے کو جنگہ نہ تھا اتنا بڑا مجمع ہم نے گاندھی جی کی وفات کے وقت بھی نہ دیکھا تھاے۔میت ایک گاڑی پر رکھی تھی جسے سفید وردی والے سپاہی کھینچ رہے تھے ایک کونے میں لیاقت علی خاں کالی شیروانی میں ملبوس اکیلئے بیٹھے تھے کا ان کے چہرے پر غم واندواور سوچ وفکر کے ایسے آثار تھے کہ فقصلہ کرنا دشوار کہ کون کس پر حاوی ہے ہمیں تو فکر کے آثار ہی غالب نظر آئے وہ اکیلےء رہ گئے تھے اپنی پوری سیاسی زندگی اور جد جہد محمد علی جناح کے سایہ عاطفت میں گزاری۔اب چونکہ ان کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سر سے اٹھ گیا تو فکر اور پریشانی تو لازم ٹھری۔ پاکستان کے وہ وزیراعظم ضرور تھے۔مگر نہ سندھی،نہ پنجابی،نہ پٹھان،نہ بلوچی،نہ بنگالی،بنگالی تو ویسے بھی پاکستانی آبادی کی اکثریت ہو کے بھی مرکز سے اتنی دور پڑے تھے۔
محترمہ فاطمہ جناح کو بھی دیکھا وہ بھی کالے کپڑوں میں ملبوس،ان کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں مگر مجال جو ذرکا بھی آواز نکلے۔ بس مرقع اندوالم بنی کھڑی تھی۔لیاقت علی خاں کا تو ہادی و رہبر گیا مگر محترمہ کا تو ماں جایا اور اس سے بھی کہیں زیادہ پوری زندگی کا دوست اور ساتھی وہ جناح کی بھی بھیں ماں بھی تھیں اور ہمدوو مساز بھی۔بھائی کی خدمت میں تمام زندگی کنواری رہیں۔
لیاقت علی کے ساتھ ایک باریش بزرگ ململ کی اونچی باڑھ کی دو پلی ٹوپی اور کرتے پائجامے میں ملبوس بیٹھے تھے پتہ چلا کہ ان کا شمار پاکستانے معماروں میں سے ہوتا ہے۔ہر چند کہ ان کا اصل تعلق صرف دین سے تھاے البتہ اس مذہبی یا نظریاتی سیاست،جس کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک

چلی اورانجام کارکامیابی ہمکنار ہوئی اس میں وہ شانہ بشانہ شامل تھے اوراس موقع پر وہ جناح کصاحب کی آخری رسوم کی ادائیگی کے سلسیل میں موجود کیتھے ان کا سام گرامی مولانا شبیر احمد عثمانی معلوم ہوا۔

کشد یدگر یہ وزاری کے عالم میں محمد علی جناح کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ان کی تدّفین کے بعد جیسے ہی ہجوم منشتر ہونے لگا ۔چاروں طرف سے اچانک قائداعظم زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہونا شروع ہوئے۔اپنے قائد سے لوگوں کی عقیدت کی یہ حالت تھی کہ ان کی کا بس ہوتا تو شاید وہ خود بھی انہیں کے ساتھ دفن ہو جاتے۔

عقیدت اور محبت کا جو مظاہرہ ان گنہگار آنکھوں سے اس روز دیکھا وہ رف اور صرف رب العزت کی دین ہے جسے چاہے نہ دے لیجئے صاحب،تحریک اور تشکیل پاکستان کا پہلا اہم ترین باب تو تمام ہوا۔آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

کراچی اور کراچی والوں کوان کے حال پہ چھوڑ کے پنڈی کا رخ کیا دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے ککہ فو جک کا مرکزار کشیر سے جغرافیائی قربت ہو کنے ناطے کپنڈی کے کلیدی اہمیت اختیار کر لی تھی۔وہا پہنچکر دیکھا تو حالات میں خاص فرق نظر نہیں آیا۔ انگریز کمانرجوں کے توں موجود تھے۔مگر گوروں میں بھورے اور کالے بھی نظر آنے لگے تھے۔کشمیر کی جنگ جاری تھی معلوم ہوا ولایت سے ثالث آرہے ہیں۔جنگ بندی کرا کے کشمیریوں کو خود قسمت کا فیصلہ کرے کا حق دلائیں گے خدا کرے ایسا ہو مگر فرنگی کی بات پر بھروسہ وہ کرے جوان سے اوران کی چالوں سے واقف نہ ہوا اور خود کان کا شکار نہ ہو چکا ہو۔اب انگریز کی جگہ امریکیوں کا نام زیادہ سننے میں آتا ہے سواس سے کیا فرق پڑتا ہے۔دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے جوٹھرے۔

پنڈی کلب کی رونق پہلے سے بھی کہیں زیادہ نظر آئی وہی خوش پوش چاق و چو بند خوش شکل افسراں ناؤنوش اور خوش گپیوں میں مصروف، وہی بینڈ باجا، وہی عورتوں اور مردوں کا سینے سے سینہ اور رخسار سے رخسار ملائے باہمی رقص، اماں لاحول ولا قوۃ۔بھلا یہ کیسی بیہودگی ہے کہاں اسلام کے نام پر بٹوارہ اور پاکستان کا قیام اور کہاں یہ بے شرمی کا مظاہرہ،ایک دوبار مٹکاف صاحب کی

ضیافت میں ہم پہلے بھی اس قسم کی محفل رقص وسرور دیکھ چکے تھے۔مگر میر بھائی وہ تو انگریزوں کا دور تھا اور اپنے دور میں وہ وہی کچھ کررہے تھے جس کی ان کا مذہب اوران کی تہذیب اجازت دیتی تھی مگر کم ازکم پاکستان کمیں تو یہ سب خرافات ختم ہوجانا چاہیئے یہاں کے چپہ چپہ پر تو ہم نے ''ھذا من فضل ربی'' کی عبارت جلی حروف میں لکھی دیکھی تو گویا یہ رقص وسرور بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے نعوذ باللہ! دیکھیں اب یہ غنیؒ رملکی ثالث آر کشمیر کا فیصلہ کب اور کس طرح کرکاتے ہیں:

ہم کو ان سے ہے وفا کی امید
جو نہیں جانو فا کیا ہے

ہماری تو خاک سمجھ میں نہیں آرہا اور جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ بس اتنی کہ زآغ کے انڈے سے مور نہیں نکل سکتا۔تقسیم کی کوکھ سے تعمیر نہیں نکل سکت۔صرف تقسیم در تقسیم کا سلسلہ ہی دراز ہوسکتا ہے لہٰذا جس ہندو مسلم بنیاد پر کلکپورے ہندوستان کا بٹوراہ ہوا ہے اس بنیاد پر کشمیر کا بٹوارہ بھی ہوگا اس بیچ ہمیں کشمیریوں سے گہری اوردلی ہمدردی ہے کہ بیچارے مفت میں مارے گئیے ہاتھوں کے رن میں کچل کررہ گئے۔اللہ ان پر اور ہم سب پر رحم فرمائے۔آمین!

کپنڈی سے کل کرلاہر کا عزم کیا۔یہاں کی رونقیں گویا پوری طرح لوٹ آئی تھیں یہاں سے تو کشمیر کی جنگ کا سایہ جیسے غائب سا ہو چلا تھا۔البتہ چائے خانوں میں اس کا ذکر ضرور تھا لاہرو میں اب کوئی قابل ذکر بات نہیں رہ گئی تھی بس ہندوؤں کا رسکھوں کی چھوڑی ہوئی املاک کا کبٹوارہ ہورہا تھا جس کا جہاں اور جس پر بس چلتا قبضہ جمالیتا اور اپنے نام کی تختی باہر آویزاں کرلیتا۔اس دوڑ میں مقامی اور غیر مقامی کیعنی وہ جو اس شہر کے اصل باسی تھے اور جو لٹ لٹا کر سرحد پار سے آئے دونوں ہی شامل تھے بس مال غنیمت بٹ رہا تھا جس کے ہاتھ جو دوکان یا مکان لگتا وہ اپنے نام کے ساتھ ھذا من فضل ربی کی تختی لگا کر وہیں پر دھیہ دے کر بیٹھ رہتا۔

لاہر کے اخبارات سے معلوا ہوا کہ لیاقت علی خاں بدستور پاکستان کے وزیراعظم ہیں البتہ محمد ععلی جناح کی جگہ بنگل کے کوئی خواجہ ناظم الدین صاحب پاکستان کے بڑے لاٹ صاحب

ؒ یعنی گورنر بہادر بن گئے ہیں۔ کراچی میں بڑی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ چل رہی ہے۔ ملک کی سیاست سے جس کا ذرا سا بھی تعلق ہے وہ خود کو اقتدار اعلیٰ کا وارث سمجھتا ہے اور اس پر کسی نہ کسی بہانے سے قابض ہونا چاہتا ہے اگر چہ لیاقت علی خاں نے خاصی خوش اسلوبی سے معاملات کو سنبھال رکھا تھا مگر مہاجر کی تہمت پر ان پر بدستور چسپاں تھی۔

لاہور کے عمائدین، دانشکور، اخبارات ان سے بہت زیادہ خوش نہیں ان کی بڑی شکایت یہ ہے کہ کیا پاکستانی اس لئے بنا تھا کہ ہندوستان ادھر سے آئی اور ادھر آ کر اقتدار اعلی پر قابض ہو جائیں۔ ملک کا وزیر اعظم ہندوستانی گورنر جنرل بنگالی پنجاب کس کے کھاتے میں گیا۔ پناب جو پاکساتن کا بازوئے شمشمیر زن بھی ہے اور دماغ بھی بس ادھا دھڑ اور ادھا ادھر ہو کر رہ گیا اور بدے میں اسے کچھ نہیں ملا۔

لاہر سے امرتسر یعنی ہندوستانی پنجاب کا صدر مقام تو اتنا قریب تھا کہ شاہی مسجد کے کسی بھی مینار پر کھڑے ہو کر اس کا قرب جوار نظر آتا تھا او امرتسر سے دلی گویا ایک زقند۔

لو! جناب دلی وارد ہوئے یہاں سماں بہت بدل چکا تھا لارڈ ماؤنٹ بیٹن ککب کا دفع ہو چکا تھا ان کی جگہ ایک دبلے پتلے، پکے رنگ آنکھوں پر رنگین چشمن لگائے ہوئے صاحب گورنر جنرل بہادر بن چکے تھے ان کا تعلق مدراس سے تھا۔ نا اتنا مشک لکہ کوشش کے باوجود منہ سے نہیں نکلتا۔ افواج کی کمان بھی شاید ہندوستان ہی کے کسی جنرل نے سنبھال لی تھی۔ جواہر لال نہرو اپنی جگہ تھے۔ سردار پٹیل کی حکومت پر گرشت اور مضبطو ہو چکی تھی سبھی نے اپنا بسیرا دلی ہی میں کر لیا تھا اب وہ جاتے بھی تو کہاں جاتے اور کس لئے سب کچھ ادھر دلی ہی میں سمٹ کر آ گیا تھا۔

کراچی کے مقابلے میں دلی میں کاروبار حلکمت کہیں زیادہ منظر طریقے سے چل رہا تھا ظاہر ہے یہاں ہر چیز ہر محکمہ انگریزوں کے وقت سے ہی جمے جمائے تھے جبکہ کراچی میں تو کاغذ اور قلم بھی عنقا۔ سرکاری عمارات کا تو ذکر ہی کیا۔ خوشی اس پر تھی کہ کراچی کے چھوٹے بڑے حکام جنہوں نے آزادی سے پہلے کام نہ کرنے کی

گویا قسم کھا رکھی تھی۔ اب بڑے انہماک سے اپنے اپنے کام اور اپنے ملک کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ سرکاری محکموں میں بڑے زور سے کام ہو رہا ہے افسر اور ماتحت سب وقت پر آتے ہیں اور ضروری نہیں کہ وقت پر چھٹی بھی کر لیں بلکہ چھٹی کے وقت کے بعد رات تک کام میں جتے رہتے ہیں۔ البتہ سیاست میں برابر لپاڈگی چل رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو ملک کے ایک دوسرے سے دور افتادہ بازوؤں کا تھا۔ بُعد المشرقین کے اصل معنی اب سمجھ میں آئے۔ ایک طرف مغربی پاکستان اور دوسری طرف مشرقی پاکستان بیچ میں ہندوستان' ہوائی سفر بھی ہندوستان ہی کے راستے سے۔ ایک ملک اور دو جغرافیائی منطقے' بات پلے نہیں پڑی۔ پھر خود ہی اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''سراج الدین تمہارے پلے بات ہی کونسی پڑی تھی۔ غنیمت جانو کہ بزرگوں کے صدقے اب کچھ نہ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ مقامات وہ شہر دیکھ لئے جنہیں اپنے وقتوں میں خواب میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہماری کل دنیا تو بس قلعہ معلٰی تک محدود تھی اور کل نقل و حرکت قلعہ سے غیاث پور اور مہرولی تک۔ صحیح معنوں میں تو خود دلّی کے گلی' کوچوں تک رسائی نہ ہوئی تھی۔''

کراچی میں قیام کے دوران کئی بار خیال آیا کہ حضرت عثمان مروندی کے دروازے پر دستک دیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر ان سب بزرگوں کا یہی فرمان تھا کہ سیاست اور امور حکومت کی دیکھ بھال سب تمہارے ذمہ' ان کا بغور مطالعہ کرو اور دیکھو کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ دونوں پڑوسی باہمی دشمنی میں کہاں تک نکل چکے ہیں۔ اور مزید کہاں تک آگے بڑھیں گے۔ ہمارے پاس صرف اس وقت آؤ جب بات بالکل تمہارے سر سے اور معاملات تمہارے ہاتھ سے نکلتے معلوم ہوں ورنہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ لہٰذا ہم نے لاہور داتا صاحب کو بار بار زحمت دینے سے عمداً احتراز کیا۔ البتہ دلّی میں جہاں تک حضرت نظام الدین اور امیر خسرو کا تعلق تھا۔ سو ان کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح حاضری ہو ہی جاتی۔ ایک دفعہ خدمت میں حاضر تھا حضور نے فرمایا:

''ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت

’’گاندھی جی بھی گئے۔ جناح صاحب بھی گئے۔گاندھی جی نے بہت زور لگایا کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو تقسیم ہو کر رہا۔ جناح صاحب نے بہت چاہا کہ بنگال اور پنجاب کے حصے بخرے نہ ہوں ہو کر رہے۔

’’اب جو تصویر آنکھوں کے سامنے ابھر رہی ہے وہ کم و بیش وہی ہے جس کا ہمیں ڈر تھا دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ناسمجھ احمق یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں اگر ایک نے دوسرے کو ختم کر کے رکھ دیا۔ دونوں ہی ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ ابھی تو صرف ایک کے دو ہوئے ہیں۔ پھر دو کے چار اور چار کے آٹھ ہو کر رہ جائیں گے۔ پورا ہندوستان ویسا ہی ریاستی اور نوابی ہندوستان بن کر رہ جائے گا جیسا تھا۔

حضرت نظام الدین کا ہمارے لئے وہی فرمان تھا کہ جو خط تقسیم اب زمین پر کھینچا گیا ہے وہ بے شک اپنی جگہ رہے تمہاری کوشش اور ہماری دعا بس یہی ہے کہ تقسیم کی یہ لکیریں روح اور زمین کی لکیر نہ بن جائے سو تم اپنے کام سے کام رکھو اور رب العزت پر بھروسہ رکھو۔ تقسیم کی بات چھوڑ و کہ وہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے، تقسیم کے زہر کا مداوا کرو۔ اس سے پہلے کہ بس یہ زہر لوگوں کے رگ و پے میں سرائیت کر جائے ...‘‘

نظام الدین کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کہنے والی بات کہہ چکے تھے تو پھر اپنا منہ قبلے کی جانب کر لیتے۔ اگر امیر خسرو موجود ہوتے تو ان کی طرف رخ کر کے پوچھتے کیوں امیر اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ لہٰذا جیسے ہی وہ قبلہ رو ہوئے۔ ہم نے خاموشی سے اجازت چاہی اور باہر آ گئے۔

دلّی کے اخبارات سے پتہ چلا کہ کشمیر میں فائر بندی کیلئے کسی بین الاقوامی انجمن کے نمائندے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ وہاں کے حکام بالا سے بات چیت کرنے کے بعد ہندوستان آئیں گے اور یہاں کے ارباب بست و کشار کا موقف معلوم کر کے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ان کے ذمہ جو کام سونپا گیا ہے اس کے دو اہم ترین حصے ہیں۔ اول یہ کہ کشمیر میں جلد از جلد فائر بندی کے بعد وہاں پر امن و امان کی بحالی اور اس کے بعد رائے شماری خود کشمیریوں سے پوچھا جائے گا کہ

وہ خود کیا چاہتے ہیں پاکستان میں شمولیت یا بدستور ہندوستان کے ساتھ الحاق۔

ہمارے دل سے تو یہی دعا نکلی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آنے والے حضرات کو ان کی کوششوں میں کامیابی عطا فرمائے اور کشمیر کا مسئلہ بخیر وخوبی طے ہو جائے۔ آمین! مگر ادھر نئی دلّی میں جو کچھ بھی دیکھنے میں آرہا ہے وہ بظاہر امید افزا نہیں۔ نہرو دورے اور تقریریں زیادہ کرتے ہیں اور جم کر کام کم۔ امور حکومت پر سردار پٹیل صاحب ہی چھائے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمان اگرچہ معمولات زندگی یعنی روزی، روزگار کی فکر میں لگ گئے۔ مگر ان کے چہرے لٹکے ہوئے اور آنکھوں سے پریشانی ٹپکتی ہے اڑوس پڑوس کے ہندو بھائی ان سے اظہار ہمدردی کرنے کے ساتھ انہیں پاکستان جانے کا بھی مشورہ دیتے ہیں کہ اب ان کے حق میں یہی بہتر ہوگا۔

جب تک انگریز کا سایہ سر پر تھا۔ پولیس اور فوج پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بڑی حد تک غیر جانبدار تھے۔ مگر اب تو پولیس اور بھی ہندوستانی۔ یعنی ہندوؤں کی ہر چند کہ ہنوز مسلمان خاصی تعداد میں ان دونوں میں شامل تھے۔ مگر حکم تو ہندو حاکم ہی کا چلتا تھا۔ اور دفتری حکام سے بھی کہیں زیادہ سردار پٹیل کا ہر چند کہ مسلمان اب ہندوؤں کے شانہ بشانہ بھارتی یا ہندوستانی شہری ہو چکے تھے اور ان کی بڑی اکثریت ہندوستان سے اپنی مکمل وفاداری اور پاکستان سے لاتعلقی کا برملا اظہار بھی کر چکے تھے۔ مگر سردار صاحب اور ان کے ہرکارے مسلمان پر اب بھی دل سے پاکستانی ہونے کی تہمت دھرتے اور انہیں اپنے پاکستان جانے کا مشورہ دیتے۔

چھٹا باب

گاندھی اور جناح کے بعد

آزادی کے بعد چار ماہ سے بھی کم عرصے میں گاندھی جی قتل کر دیئے گئے اور ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت میں جناح صاحب رحلت فرما گئے۔ ادھر ہندوستان میں گویا ہابیل کا تسلط ہوا عدم تشدد کے پیامبر کیا گئے کہ ان کا نام ہی سرزمین ہند سے اٹھتا معلوم ہوا۔ کشمیر کی جنگ امن کی بات چیت کے باوجود نہ صرف جاری تھی بلکہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جنگ کا بھوت اب خواص کے ساتھ ساتھ عوام کے سر بھی چڑھ گیا تھا۔ ہم نے بارہا لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ سارے فساد کی جڑ پاکستان ہے۔ اسے ختم کیے بغیر چارہ نہیں۔ پنجاب پر چڑھائی کر ڈالو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بنگال سے بھی کچھ ایسی خبریں آ رہی تھیں۔ ادھر پاکستانی افواج نہ ہونے کے برابر تھیں اور ہندوستانی افواج وہاں پر حملہ آور ہونے کو بے قرار تھیں اور یہ سب کچھ پٹیل صاحب کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ کم از کم افواہوں سے تو یہی لگتا تھا۔ ان میں کتنا مبالغہ اور کتنی حقیقت ہے اس کا فیصلہ اپنی جگہ دشوار تھا اور عملاً بے معنی کہ حکومت کی باگ ڈور اب پٹیل صاحب ہاتھ میں تھی اور نہرو بس نام کے وزیراعظم ہو کر رہ گئے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

یہ تو تھا ہندوستان کا عالم۔ پاکستان کے حالات پہلے ہی ابتر تھے۔ اب مزید ابتر ہو کر رہ گئے۔ سرکاری خزانہ پہلے ہی کونسا آباد تھا۔ کشمیر کی جنگ نے تو اس پر اتنا بوجھ ڈالا کہ دیوالیے پن کی نوبت آ گئی۔ تعجب اس پر تھا کہ جنگ کے اخراجات بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کے بعد

ملک چل کیسے رہا تھا۔ جس بات پر ہمیں دلی دکھ تھا وہ یہ کہ ہندی مسلمانوں کے مابین جس اتحاد اور کثرت رائے کی بنیاد پر پاکستان معرض وجود میں آیا وہ اتحاد اب گویا ہوا ہوا جا رہا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی بات تو خیر جانے دیں کہ ایک اِس پار اور دوسرا اُس پار۔ خود مغربی پاکستان میں یہ حال تھا کہ صوبائی تعصب کے آگے قومی یگانگت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر چہ مغربی پاکستان کے سب سے بڑے اور ترقی یافتہ صوبہ پنجاب کے مقابلے سرحد میں سندھ اور بلوچستان کھڑے ہو گئے تھے اور اپنے جثہ سے زیادہ حصہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر خود آپس میں ایک دوسرے سے بیزار تھے۔

صورت حال کچھ ایسی بنتی جا رہی تھی کہ اب پاکستان گویا ایک ملک اور قوم نہیں بلکہ پانچ صوبوں کا سنگم ہے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ہندی مسلمانوں کی مٹھی بند تھی۔ انہوں نے ایک قوم کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس قومی محاذ سے انہوں نے پاکستان کی جنگ لڑی اور اس کو فتح سے ہمکنار کیا۔ مگر ادھر پاکستان بنا ادھر قومی شیرازہ اتنی تیزی سے بکھرنا شروع ہوا کہ ملک تو البتہ رہ گیا مگر قوم کے متعلق مرزا نوشہ کا وہ مصرع صادق آیا کہ

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اتنا کچھ دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ان کے اس دعویٰ میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین صاحب شدید مسائل اور مصائب کے باوجود کسی نہ کسی طرح پاکستان کے دو پہیہ گاڑی کو آگے بڑھا رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ حکومت کو لاحق گونہ گوں پریشانیوں کے باوجود عوام کی حالت ہندوستان کے عوام کی حالت سے کہیں بہتر دکھائی دی۔ ان کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، رہن سہن پڑوسیوں سے کہیں بہتر تھا۔ تباہ و برباد ہونے والے تو تباہ و برباد ہو کر رہ گئے مگر باقی الحمدللہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور خوش حال۔ مسلمانوں کے بارے میں پگڑی میں پھاگ کھیلنے کا محاورہ تو سدا سے سنتے آئے تھے۔ پاکستان میں اس کی جلوہ گری بھی دیکھ لی۔

کراچی میں دلّی کے پان اور لاہور میں سیخ کباب گویا یہی دو چیزیں قیام پاکستان کی بنیاد ٹھہریں۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ ولایت سے آئے ثالثوں کے وفد کے تحت کشمیر میں جنگ بندی کی بات چیت آگے بڑھ رہی ہے۔ تاہم طرفین کی یہی کوشش ہے کہ جنگ بندی سے پہلے وہ اپنی اپنی جگہ پر اتنے مستحکم ہو جائیں کہ جنگ بندی ان کی شرائط اور ان کے حق میں ہو۔ جنگ کا تو دستور ہی یہی ہے کہ جہاں جہاں بھی خون بہے وہاں وہاں اپنا قبضہ ہو۔ اچھی بات یہ تھی کہ سر پھرے عناصر کی اشتعال انگیزی کے باوجود دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنی اپنی جگہ یہ کوشش کی کہ جنگ کا دائرہ کشمیر سے باہر نہ نکلے اور ان کی یہ کوشش اور حکمت عملی کامیاب رہی۔

خدا خدا کر کے آخر وہ دن آ ہی گیا جب فریقین جنگ بندی پر راضی ہو گئے اور کشمیر میں جنگ ایک ایسے مقام پر رکی کہ وہاں کا آدھے سے زیادہ حصہ ہندوستان کے پاس اور آدھے سے کم پاکستان کی طرف رہ گیا۔ اس طرح گویا کشمیر بھی بٹ کر رہ گیا۔ اور بزرگان دین کی وہ پیشنگوئی کہ تقسیم کا عمل، تقسیم در تقسیم در تقسیم کا پیش خیمہ ہوگا۔ پتھر کی لکیر بن کر سامنے آ گئی۔ بنگال کی تقسیم، پنجاب کی تقسیم اور ان دونوں صوبوں کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم بذات خود تقسیم در تقسیم کا مظہر تھی۔ اب کشمیر بھی اس کی زد میں آ چکا تھا۔ ہر چند کہ بات اب بھی حالات کے معمول پر آنے کے فوراً بعد رائے شماری ہی کی تھی مگر

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

اس بدنصیب ہندوستان کے قائدین میں اگر اتنی سمجھ اور قوت برداشت ہوتی تو بھلا ایک کے دو اور دو کے چار کیوں ہوتے۔ ہر چند کہ جنگ بندی، مسئلے کے حتمی اور پرامن حل کی شرط اول تھی۔ اور بہر حال اس کا استقبال کرنا چاہئے تھا۔ مگر دلی تمنا کے باوجود دل نہیں مانتا کہ جنگ بندی کے باوجود آگے چل کر یہ دونوں ملک کشمیر کے پرامن تصفیہ کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے۔ کم از کم ہندوستان تو اس بات پر مصر ہوگا کہ جو ہمارے پاس وہ ہمارا اور جو تمہارے پاس وہ تمہارا۔ بس اسی پر اکتفا کرو۔

رہے بیچارے کشمیری، تو بھائی نزلہ برعضو ضعیف، یہ بیچارے خواہ مخواہ پھنس کر رہ گئے۔ بندوں

سے کیا مانگیں کہ وہ بجز دکھ اور پریشانیوں کے اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ بس اللہ سے فریاد کر سکتے ہیں، نجانے ان بچاروں کو کس گناہ کی سزا مل رہی تھی۔ سو برس ظالم راجوں مہاراجوں کے مظالم سہے اب ہندوستان پاکستان کے ساتھ وہ بھی بٹ کر رہ گئے۔

جنگ بندی تو طے شدہ معاہدے کے مطابق عمل میں آ گئی مگر باہمی امن و آشتی کا نشان کہیں نظر نہیں آتا۔ فریقین پہلے سے بھی کہیں زیادہ ایک دوسرے سے شاکی اور بیزار نظر آتے تھے۔ پاکستان میں اخبارات کی حد تک بڑا شکوہ یہی ہے کہ جنگ بندی کس طرح بھی پاکستان کے حق میں نہ تھی۔ اس کا نفاذ عین اس وقت ہوا جب پاکستان کی افواج فتح سے ہمکنار ہوا چاہتی تھیں اور کشمیر کا فیصلہ پاکستان کے حق میں کر لیتیں۔ اس کے متعلق بھلا ہماری کیا رائے ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوتا مگر کوئی دعویٰ سے کہہ سکتا ہے کہ اس سے بدتر نہیں ہو سکتا تھا۔

معاملات اگر ایک بار بگڑ جائیں تو دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ وہ بگڑتے ہی رہتے ہیں۔ الا اس کے کہ کوئی معجزہ یا ایسی پیش رفت ہو جائے کہ وہ جہاں کے تہاں رہ جائیں اور مزید ابتری کی طرف نہیں بڑھیں۔ مگر پلٹ کر بہتری کی طرف جانا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہو گا۔

اس اثناء میں جواہر لال اور لیاقت علی خاں کی ملاقاتیں بھی ہوئیں اور ان کے کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ مگر دونوں طرف دلوں میں جو غبار تھا وہ بدستور جہاں کا تہاں رہا بلکہ اس کا نکلنا بھی ابھی باقی تھا۔ کشمیر میں جنگ بندی کے بعد جو کچھ میں نے پاکستان میں دیکھا اس کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ گویا فوج اور حکومت میں کچھ ٹھن سی گئی ہے۔ بالخصوص فوج اس طبقے میں جس کا کشمیر کی جنگ سے گہرا تعلق رہا اور جس نے اس میں عملی حصہ لیا تھا اور جس کے زیر کمان افسروں نے اور سپاہیوں نے اپنا خون بہایا۔ فائر بندی کے خلاف شدید جذبات تھے۔ اس نئی پیدا شدہ صورت حال کے بعد لیاقت علی خاں کا اقتدار بحیثیت وزیر اعظم معرض خطر میں پڑتا معلوم ہوتا تھا ان پر ہندوستانی کی تہمت پہلے ہی لگی تھی۔ اب ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر بھی انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ یہ حالت پاکستان کے مستقبل کیلئے کسی طرح بھی خوشی کی نوید نہیں ہو سکتی تھی۔

پاکستان کے برعکس ہندوستان میں فوج اور حکومت کے تعلقات مستحکم اور استوار دکھائی دیتے

تھے۔ جواہر لال اور سردار پٹیل کے احکامات ہنوز پہلے کی طرح موثر تھے۔ بظاہر کسی قسم کی کشیدگی کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس طرح فوج اور حکومت کے تعلقات کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت پاکستان کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ یہ تو ہندوستان اور پاکستان کا اپنا اپنا معاملہ اور اپنا اپنا مسئلہ تھا۔ مگر مجموعی طور پر جنگ بندی کے بعد بھی فوجیں اپنی اپنی جگہ ڈٹی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے کے اس طرح آمنے سامنے کہ آنکھ کا ذرا سا غلط اشارہ بھی کسی بڑے بحران کا پیش خیمہ ہوسکتا تھا۔

کشمیر میں جنگ بندی کو بہت عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان سے سردار پٹیل کے انتقال کی خبر آئی۔ لیجئے تین چار برس کے قلیل عرصے میں تقسیم کے تین بڑے ستون گر گئے۔ پہلے گاندھی جی پھر محمد علی جناح اور اب سردار پٹیل کے انتقال پر بھی عوام وخواص غمگین اور سوگوار تھے مگر کم از کم مجھے ان میں دلی رنج وغم کی وہ کیفیت نظر نہیں آئی جو دلّی میں گاندھی جی اور کراچی میں جناح صاحب کے انتقال کے موقع پر دیکھنے میں آئی تھی اس دفعہ پریشانی' دلی غم پر حاوی تھی۔ سردار پٹیل واقعی ہندوستان کے مردِ آہن تھے۔ مسلمانوں کے بھلے وہ دوست اور ہمدرد نہ ہوں مگر آزادی کے بعد جس مضبوطی سے انہوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی وہ انہیں کا کمال تھا۔ گاندھی جی نے تو آزادی کے فوراً بعد ہی سیاست کو گویا الوداع کہا۔ رہے جواہر لال کا تو سوا نتہائی ذہین اور صاحب علم ہونے کے باوجود عملی سیاست کے میدان میں ذہنی انتشار کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ اور حالات کے دباؤ میں اکثر وہ کچھ کر گزرتے جو انہیں نہیں کرنا چاہئے تھا اور جس کا انہیں غالباً خود بھی احساس تھا۔ کشمیر کی بارہ تیرہ مہینے کی طویل جنگ کی منجملہ اور وجوہات کے بڑے حد تک ان کی اسی ذہنی پراگندگی کا نتیجہ تھی۔

سردار پٹیل کے انتقال کے بعد نہرو تنہا رہ گئے۔ اب نہ تو ان پر گاندھی جی کی اخلاقیات کی پابندی اور احترام لازم تھا۔ اور نہ پٹیل صاحب کی خالص سیاسی مصلحتوں اور حکمت عملی کا دباؤ' اب وہ امور حکومت میں بالکل آزاد و مختار تھے۔ انہیں روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد البتہ تھے۔ ان کے پاس وزارت تعلیم کا قلمدان تھا۔ وہ ہمیشہ کھوئے کھوئے رہتے۔

ملک کی تقسیم کے بعد وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ آخر وقت تک ملک کی تقسیم کے مخالف رہے۔گاندھی جی سے بھی زیادہ۔

مولانا نصرف مسلمان تھے بلکہ اپنے وقتوں کے قرآن اور حدیث کے ترجمان اور مستند عالم بھی۔گاندھی جی مسلمانوں کی خیرخواہی اور ہمدردی اوران کی ہرطرح سے عملی مدد کرنے کے باوجود بہرحال ہندو تھے۔ وہ مذہبی تعصب سے بالاتر ہونے کے باوجود ہندواور ہندومت پرآخروقت تک سختی سے قائم رہے۔انہوں نے جواہرلال کی طرح کبھی خدا کی ذات اور مقدس صحیفوں سے نصرف انکارنہیں کیا بلکہ ان کے تقدس اور الہامی حیثیت کو دل سے قبول کیا۔ وہ عظیم انسان اور ساری دنیا کے شہری ہونے باوجود ہندی اور ہندورہےاوراب جبکہ ہندوستان' ہندواکثریت کی بنیاد پرتقسیم ہوکر بھارت بن گیا تھا۔ان کاتعلق لامحالہ ہندواکثریت سے ہو چکا تھا۔

اسی طرح مولاناابوالکلام آزادؔ پکے ہندوستانی قوم پرست اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے صف اول کے قائد ہونے کے باوجودآزادی کے بعدبھی مسلمان کے مسلمان رہےاوراب ان کا تعلق مذہب وملت ہندوستانیوں سےنہیں بلکہ ہندوستان کی مسلم اقلیت سے ہوکررہ گیا تھا۔

ذرااندازہ کریں کہ ایک ایسا انسان جوتمام عمراپنے ہندوستانی ہونے کا اوراپنی ہندوستانیت کا دم بھرتارہاا گروہ اچانک دریا سے الگ ہوکرندی میں اورندی سے جدا ہوکر پرنالے میں گر جائے تو پھراس پرکیا گزرے گی۔ہم پربھی تو یہی گزری تھی۔کہاں حضرت جنت مکانی ظہیرالدین بابراور جلال الدین اکبراورمحی الدین اورنگ زیب کہ ان کا ڈنکا چاردانگ ہندوستان میں صدیوں سے بجتا چلاآرہاتھااورکہاں ہم بےبس اور مجبورلال قلعے کےقیدی۔سکہ اگرچہ ہماراچلتا تھااورشاہی مہر بھی ہماری تھی مگرقلعہ کےاندرتوہماری اپنوں کے سامنے بھی نہیں چلتی تھی وہاں بھی کمپنی بہادرکاراج تھا۔

بات منہ تک آئی سونکل گئی اوراس پرہمیں خاصی پشیمانی بلکہ شرمندگی ہے۔خوداپنے آپ سے مخاطب ہوکرکہا''سراج الدین یہ اپنارونا آخرکب تک روتے رہوگے۔سارے ملک کے بزرگان دین نے سوبرس بعدتمہیں پورے ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔اس سے بڑھ کرتمہاری بادشاہی

کی اور کیا سند ہوسکتی ہے۔ جس مقدس مقصد کیلئے تمہیں مزار سے اٹھا کر قیادت شاہی کے مدار میں لایا گیا ہے۔ اب پوری طرح اس کے اہل بن کر دکھاؤ۔ گزری ہوئی بے بسی کو حال کی مجبوری کا جوازمت بناؤ یہ سوچ کر ذرا ڈھارس بندھی ہمت کی کمر باندھی اور اپنے کام سے لگ گئے۔

کراچی پہنچ کر دیکھا تو کوچہ و بازار کی حد تک حالات بہت اچھے نظر آئے۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ کہیں دور بڑی جنگ چھڑ گئی ہے۔ جس کے باعث پاکستان کے خام مال کی زبردست مانگ ہوگئی ہے مال دھڑا دھڑ دساور بھیجا جا رہا ہے اور اس کے اچھے دام وصول ہو رہے ہیں۔ لیاقت علی خان اپنی جگہ ڈٹے ہوئے اور بظاہر مستحکم تھے۔ ہندوستانی کی تہمت ان پر بہر حال لگی تھی۔ کیا سندھ' کیا پنجاب' کیا سرحد سبھی اس میں شامل تھے بنگالی تو خود مغربی پاکستان میں اجنبی بنے ہوئے تھے۔ جہاں تک بلوچیوں کا تعلق تھا تو وہاں کے قائدین اور نوابوں نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا تھا شروع شروع میں ان کے قائدین کے ایک خاص طبقے اور قوانین قیام پاکستان کی مخالفت بلکہ مزاحمت کی تھی۔ مگر اب وہاں خاموشی تھی۔

رہے لیاقت علی خاں سو ان سے ایک قسم کی بیزاری تو سبھی کو تھی' بالخصوص اہل پنجاب کو مگر قائداعظم کے نائب اور ایک تجربہ کار اور صاحب کردار فرد کی حیثیت سے ان کا نعم البدل سامنے نہیں تھا۔ پاکستان میں ایک لحاظ سے ان کی وہی حیثیت تھی جو مولانا آزاد کی ہندوستان میں۔ مولانا کا شمار تو ہندو اکثریت والے ہندوستان میں بہر حال اقلیتی طبقے میں ہوتا تھا۔ مگر لیاقت علی خان مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی اقلیت کے نمائندے بن کر رہ گئے تھے۔ اس طرح ہندوستان میں آزاد اور پاکستان میں لیاقت علی خاں دونوں اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے ملک میں اقلیتی طبقے سے منسلک ہو کر رہ گئے۔ ہندوستانی مسلمان' وہ بھی جو ہندوستان ہی میں رہ گئے اور وہ بھی جو ہجرت کر کے پاکستان آ گئے دونوں ہی اقلیتی طبقہ سے جڑ کر رہ گئے' بہت خوب!

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے

اس بار دورہ سندھ کے دوران سوچا کہ حضرت عثمان مروندی اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے

آستانہائے مبارک پر حاضری دوں اوران کے کلمبات سے دل ودماغ کوروشن کروں لہذا کراچی سے پہلے سندھڑی کا رخ کیا حضرت عثمان اوران کے بے شمار معتقدین انہیں لال شاہ باز قلندر کے نام نامی سے یاد کرتے ہیں۔ان کے جلال کی نسبت سے یہ نام ان پر بالکل صادق آتا ہے۔ان کی شاعری ہو یا بول چال دونوں گویاان کے جلال کے آئینے ہیں۔ہم نے مجلس شوریٰ میں انہیں دیکھا بھی اور سنا بھی۔ان کے جلال کا دبدبہائی میرے دل ودماغ پر حاوی تھااس لئے ان کی خدمت میں حاضری سے ذرا کتراتا تھا۔مگراس بار ہمت کرہی لی کہ اتنا کچھ دیکھنے اور پرکھنے کے بعدان کی ہدایت اور رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔

انکی درگاہ پر پہنچ گیااورابھی پہنچے ذرا بھی دیر نہیں ہوئی تھی کہ خدمت عالیہ میں طلب کرلیا گیا۔سلام وآداب کے بعدانتہائی شفقت اور کمل مہبانی سے مجھے قریب بلایااور بغلگیر ہوئے ان کے چہرے مبارک پراس وقت جلال اور جمال کی ایک عجیب وغریب کیفیت کتھی ایک آنکھ سے جلال ٹپکتا معلوم ہوتا تھا۔دوسری سے جمال۔اشارے سے بیٹھنےکوکہااور پھر پوچھا:

صاحب عالم فرمائیں کیا دیکھا کیا سمجھااورکس نتیجے پر پہنچے؟ میں زانوئے ادب طے رئےنظر جھکائیں خاموش بیٹھارہا۔ دوبارہ کچھ کہنے کیلئے کہاتو آخرمنہ کھولناہی پڑا۔

گاندھی جی اور جناح صاحب تو گزرگئے اب پاکستان میں لیاقت علی خاں اور ہندوستان میں جواہرلعل کسی نہ کسی طرح حکومت کی گاڑی کھینچ رہّے تھے مگر دووں ہی اپنی اپنی جگہ پریشان اورایک قسم کی بےیقینی کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔

دوست ہوشیار ہوجاؤ حالات بہت جلد ہی قابو سے باہر ہونے والے ہیں۔جواہرلعل تو بہر حال بچ جائیں گے مگر لیاقت علی خان کیلئے سنگین خطرہ دکھائی دے رہاہے حضور نے ٹو کا خطرے کی نوعیت؟ میں نے رکتے رکتے پوچھا۔

دیکھتے جاؤ خون بولےاور پھر بولے

اس کے بعد جیسے مراقبے میں چلے گئے آنکھیں کچھ اس طرح چڑھیں کہ صرف سفیدی نظر آئی اور پھر بند ہوگئیں ملاقات ختم ہوچکی تھی اور ہمیں چلے جانے کا حکم مل چکا تھا۔

دل بہت ڈوبا ڈوبا سات ھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہونے والا کیا ہے۔لیاقت علی خاں کو کیا خطرہ لاحق ہے اور جواہر لعل کس طرح سے بچ کر نکلیں گے۔

اس کے بعد شاہ صاحب کی درگاہ پر حاضری تھی۔وہاں کچھ نقشہ اور تھا بہر سو رقص بسمل کا سماں تھا۔جسے دیکھو حال سے بے حال گویا فنا اور بقا کے بیچ و بیچ شاہ صاحب نے فوراً شرف ملاقات بخشا۔ان کا چہرہ بعقعہ نور بنا ہوا تھا۔اس قدر روشن کہ اگر چہ آنکھ نہیں ٹھرتی تھی مگر ٹھنڈک ایسی پڑتی تھی کہ بیان سے باہر ان کے دوان مبارک سے اشعار رواں تھے اور ان کی عقیدت مندانہیں کاغذ پرؔ اتار رہا تھا۔شاہ صاحب کی زبان میرے لئے بالکل نئی مگر غیر مانوس ہرگز نہی تھی اس کی نوعیت کچھ ایسی تھی جیسے اچھی موسیقی کی ہوتی ہے چاہے کہاں کی بھی ہو کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔شاہ صاحب تو اس وقت اپنا کلام ترنم ہی سے پڑ رہے تھے۔اشعار اس طرح منہ مبارک سے نکل رہے تھے جیسے جھرنا کا پانی۔

ان کی آواز کا حسن ساز کا محتاج نہیں شاہ جی نے ہمیں نیم وا آنکھوں سے دیکھا پھر آنکھیں موندلیں پھر ارشاد فرمایا:

سالک ہو اپنا راستہ مت چھوڑنا چاہے کتنی بلائیں آفاتیں کیوں نہ آئیں اور یہ سب کچھ ہوگا۔تمہارا اور پورے ملک کا راستہ ہر قسم کی دشواریوں سے پٹا پڑا ہے قدم قدم پر قتل،خون،تباہی بربادی مگر ہرگز اپنا راستہ مت چھوڑنا۔جنت پہنچنے سے پہلے جہنم سے گزرنا ہوگا اور پھر خاموش۔

وہاں سے فارغ ہوا تو دل کی وہی کیفیت تھی جو لعل شہباز قلندر سے شرف ملاقات کے بعد محسوس ہوئی تھی آہستہ آہستہ مقامی بولی ٹھولی میں کچھ کچھ چل نکلے تھے اور کیوں نہ ہو کیا بادشاہ کیلیئے لازم نہیں کہ رعیت کی زبان کو خواہ اس کا تعلق ملک کے کسی حصے سے بھی کیوں نہ ہو اچھی طرح سمجھے خدا کا شکر ہے کہ اتنا تو سمجھ میں آیا دیرآید درست آید۔

کراچی سے لاہر وا اور لاہور سے پنڈی،لاہر میں اخباری سیاست کے علاوہ شاید ہی کچھ اور دکھائی دیا ہ لاہر و والوں کی گفتگو کا بس ایک ہی موضوع تھا او وہ یہ کہ پنجاب کے ساتھ بہت زیادت ہو رہی ہے اسے وہ کچھ نہیں لا جو اس کا حق ہے حد تو یہ ہے کہ خود فوج کا پہلا پاکستانی نامزد

سپہ سالار (کمانڈر انچیف) بھی سرحد کے اقلیتی صوبہ سے تھا کسی پنجابی جنرل کا نام بھی سننے میں آیا جن کی پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف کی حیثیت سے نامزدگی عملاً ہو بھی چکی تھی مگر وہ کسی ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون مرحوم کی جگہ کسی پٹھان کجرنیل کا تقرر کیا جا چکا تھا۔

لاہور کی عام زندگی میں ہمیں کہیں وہ توانائی نظر نہیں آئی جس کا ہم نے اتنا کچھ سنا تھا اور جس کا تھوڑا بہت مظاہرہ ہم نے آزادی کے فوراً بعد اپنے دورے کے دوران دیکھا بھی تھا، اب تو توانائی اور تازگی کی جگہ ایک خاص قسم کی برہمی تھی، غصہ تھا۔ لاہور والے جب خوش ہوتے ہیں تو حسینوں کے حسین اور جب ناخوش ہو یا غصے میں ہوں تو ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی درشتگی اور برہمی آجاتی ہے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ان کی تو صرف زندہ دلی ہی اچھی لگتی ہے، زندہ دل ہی ان کی توانائی اور تازگی کی ضامن ہے۔

ساتواں کلب

پنڈی کلب

لاہور والوں کے ان کے حال پر چھوڑ کر راولپنڈی پہنچے۔ وہاں بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ ولایت سے آئے ہوئے ثالثوں کا وفد بھی وہیں موجود تھا جنگ بندی کے بعد رائے شماری کا تذکرہ کراچی اور لاہور کے اخبارات میں پہلے ہی بہت کچھ دیکھ چکے تھے اندر خانے کیا کچھ ہو رہا تھا خدا جانے مگر بظاہر امی، جمی کے باوجود کم از کم ادھر سماں ہی کچھ اور بندھتا معلوم ہو رہا تھا۔

پنڈی کلب ہماری سب سے بڑی مخبر تھی خود بے زبان ہوتے ہوئے بھی دوسری کی زبانی وہ تمام خبریں ہم تک پہنچا دیتی جنہیں بالعموم صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے۔

پاکستان کے نئے کمانڈر انچیف کو پہلی بار ہم نے کلب میں ہی دیکھا۔ انتہائی حسین وجمیل، رشک یوسف، ان یک شان و شوکت اکر سج دھج ہی کچھ ایسی تھی کہ ایک بار دیکھ لو تو آنکھیں بس وہیں جم کر رہ جاتی تھی۔ ٹیپو سلطان شہید کی تصاویر یہم نے دیکھی تھی۔ ان صاحب کو دیکھ کر ہمیں بے اختیار شہید سطان یاد آ گئے۔ دل سے بے اختیار ان کے لئے دعا نکلی اور اللہ تعال یکے حضور عرض کی کہ زندگی بے شک ان کی شہید سلطان کی ہو۔ مگر انجام ان کا نہ ہو کہ جس کام کا انہوں نے بیڑہ اٹھایا تھا اور جس کی تکمیل کی صرف وہ مضبوط سی پیش قدمی کر رہے تھے وہ ادھورہ کا ادھورہ رہ گیا اور شہید ہو گئے معلوم ان صاحب کا نام محمد ایوب خاں تھا اور ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ سرحد سے تھا۔

ایوب خان کلب کے سبزہ زار پر بیٹھے۔ پڑھنے کی عینک لگائے انگریزی کے کسی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مشروب کا ایک گلاس ان کے سامنے والی چھوٹ سی میز پر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو تین اور حضرات ان کے پاس آئے۔ اص فوجی انداز میں ایڑیاں ملا کر انہیں سلام کیا اور پھر باقاعدہ ان کی اجازت لے کے بعد برابر لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جنرل ایوب خاں نے اپنی کرسکی سے نیم دراز ہو کر ان کا استقبال کیا اور ان سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔ کلب کا بیرا حاضر ہوا۔ پھر جنرل صاحب نے زیر لب بیرے سے کچھ کہا۔ وہ بھی ٹھک سے سلام کر کے چلا گیا اور پلک جھپکتے تھال میں قرینے سے سجے مشروبات کے گلاس اٹھا کر لے آیا۔ گلاس پینے سے دو دو انگلی بھر تھے اور سودے کی بوتلیں ساتھ تھیں۔ یہ منظر ہم چونکہ پہلے بھی کئی بار مٹکاف صاؔحب کی روشن آراء کلب کی پارٹیوں میں دیکھ چکے تھے اس لئے اب عام مشروفب اور شراب میں تمیز کرنا مشکل نہ تھا۔ بیرے نے گلاسوں میں ہر ایک کے حکم کے مطابق سوڈا اڈالا اوک پھر ٹھک سے سلام کر کے واپس سب ے انے اپنے جام اٹھائے، ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کچھ کہا اور انتہائی سلیقے سے دو ایک چسکیاں لے کر اپنے اپنے گلاس میز پر رکھ دیئے۔

کلب کے سبزہ زار کے دوسرے گونے پر فوجی افسروں کی ایک ٹولی جمی تھی ان کے درماین ایک صاحب خالص پٹھانی خدوخال پر پُراعتماد شخصیت کے لحاظ سے بہت نمایاں تھے۔ عہدے کے لحاظ سے بھی یقیناً وہ اپنے ساتھیوں سے برتر ہوں گے اس کی تصدیق بھی جلد ہی ہوگئی یہ صاحب بھی جرکنیل تھے اور ان کا محمد اکبر خاں تھا کشمیر کی جنگ کے دوران ہم نے ان کا نام تو بارہا سنا تھا البتہ شکل اب پہلی بار دیکھ رہے تھے انہیں جرنیل ایوب کی طرح حسین تو نہیں کہا جا سکتا البتہ اپنی سپاہیانہ شان او دبدبہ ان سے کچھ سوا ہی تھا۔ ان کی حرکات وسکنات بھی جنرل ایوب کے مقابلے میں بہت تیز و تند تھیں۔ وہ شراب بہت تیزی سے پیتے بلکہ انڈیل لیتے مگر ان کے ہاتھوں اور گردن کی جنبش جتنی تیز تھی ان کی بات چیت اتنی ہی دھیمی بلکہ خالی سرگوشی کے انداز میں جہاں ایوب خاں کی پارٹی قہقھوں کی آواز سنائی دیتی وہاں اکبر خاں کے حلقے میں سرگوشیاں ہی سرگوشیاں تھیں۔

کلب کے سبزہ زار میں فوجی بینڈ باجا بج رہا تھا۔مگر یہ لوگ اس سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے البتہ فوجی ضابے اور قاعدے کے مطابق جیسے کہی کوئی دھن ختم ہوتی اور بینڈ ماسٹر انہیں ایک خاص زاویے سے گردن جھکا کر سلام کرتے تو سب کے سب بڑی بردباری سے تالیاں بجا کر داد دیتے۔

اس بار کلب میں گورے بس اکا دکا دکھائی دیتے اوران میں نہ جانے کتنے خالص انگیرز اور کتنے دیسی، ادھے تیتر اور آدھے بٹیر یعنی ہندوستانی اور انگریز ماں باپ کی ملی جلی اولاد، کلب سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ایک باوردی نو جوان سبزہ زار میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے جنرکل ایوب کی طرف رخ کر کے ایڑیاں ملائیں اوراٹینشن ہوکر سلام کیا پھر کسی جھجھک کے بغیر کسید ھا اکبر خاں اوران کے ساتھیوں کی طرف قدم بڑھایا۔اکبر صاحب نے اسے دیکھتے ہی راجہ کہہ کر پکارا۔انہوں نے اوران کے ساتھیوں نے اپنی اپنی کرسی سے نیم دراز ہوکر اس کو ہیلو کہا اور پھر خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ جانے کو کہا انہیں میں سے کسی نے چٹکی بجائی اور چسکی بجاتے ہی بیر کا بڑی تیزی سے حاضر ہو گیا۔

صاحب کیلئے ایک بڑا ڈبل جلدی۔

بیرے نجی س کہا اور سبزہ زار پر لگے ہوئے ایک اونچے اور لانبے میز کی طرف لپکا۔میز پر گلاس قرینسے لگےؒ تھے اس کے پیچھے ایک الماری تھی جس میں انواع واقسام رنبرن کی شرکا کی بوتلیں سجی تھیں۔بار کے پیچھے پگڑی اور سرخ یا سبز پٹکا باندھے آبار کھڑا تھا جیسے بیرا اس کے پاس پہنچا اس سے پوچھے بغیر آبادار نے ایک صاف ستھرے چمکدار گلاس میں شاراب انڈیل دی اور گلاس بیرے کو تھما کران صاحب ککو دور ہی سے سلام کیا جو ابھی ابھی شاید کشمرؒ کے محاذ سے آئے تھے اکوجن کیلئے ڈبل شراب کا حکم ہوا تھا ادھر آنے والے مہمان (بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام کرنل صدیق راجہ ہے) نے اپنا گلاس تھاما۔ ادھر سب نے اپنے اپنے گلاس ان صاحب کی طرف اٹھا کر کچھ کہا اوران کا جام صحت نوش کیا۔

جرنل ایوب خاں اوران کے ساتھ تو تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر کلب سے

چلے گئے۔کوئی پیدل اور کوئی بائیسکل پر۔مگر اکبر خاں اور ان کے ساتھ اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔دور پہ دور چلتا رہا حتیٰ کہ آبداد نے بیرے کو اشارہ کر کے اس کے کان میں کچھ کہا۔جواباً ان صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اس سے کچھ کہا اور بیرا ًسلام کر کے واپس چلا گیا۔

اس کے بعد جلد ہی جرنل اکبر نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی گلاس میں جو شراب باقی رہ گئی تھی اسے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گئے اور پھر کہا ویل جنٹلمین خدا حافظ آپ سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔گڈلک وغیرہ وغیرہ اس کے بعد وہ سب کھڑے ہو کر جھومتے ،جامتے سبزہ زار سے باہر آ گئے کشمیر میں اگر چہ جنگ بندی نافذ تھی مگر دونوں افواج میں جھڑپیں گویا روز کا معمول تھیں اور جہاں تک توپ خانے کی گولہ کباری کا تعلق تھا سو اس کے بارے میں کم وبیش روز اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر شائع ہوتی۔اس نو جوان افسر کے حلیہ سے بھی صاف پتہ چلا کہ کشمیر کا محاذ ہنوز گرم ہے۔دونوں طرف سے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔دیسیوں کی لڑائی میں اگر بدیشیوں کا دخل ہو جائے تو بس اللہ ہی مالک۔چور سے کہیں کہ چوری کر اور شاہ سے کہیں کہ تیرا محل لٹے۔یہ ہندوستان پاکستان والے بھی کیسے حمق ہیں جو ان لوگوں سے امن کی آس لگائے بیٹھے ہیں جنھوں نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے ہمارا کا تو یہی ایماًن ہے کہ اہل ہند کی بڑی حماقت ایک طرف مگر درحقیقت بٹوارے کی پوری ذمہ داری انہیں سفید فام شاطروں پر جاتی ہے خواہ وہ انگلستان کے ہوں یا امریکہ کے ایک ماموں دوسرا بھانجا۔سب ایک خاندان کی ایک ہی تھیلی جے چٹے بٹے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ کشمیر کے بٹوارے کی بھی بات چل رہی ہے۔سو اس میں حیرت کی کیا بات ہے کنک ہو یا اینٹ گا گر پہاڑ کی چوٹی سے لڑ کائے جائیں تو پھر زمینے ٹکر کا کر ہی رہیں گے ملک کی تو بہت بڑی بات ہے اچھے بھلے خاندان بٹتے ہیں تو پھر بنتے ہی چلے جاتے ہیں تقسیم کبھی تعمیر کی بند نہیں بن سکتی۔

دلی گئے عرصہ ہو گیا تھا سوچا کہ ذرکا ادھر سے بھی جنگ کشمیر اور دوسرے حالات کا جائزہً لیا جائے دیکھیں ادھر ہوا کا رخ کدھر ہے کون کیا کہہ رہا ہے کیا کر روا ہے چنانچہ دلی کا قصد کیا سب سے پہلے حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا فوری کشرف ملاقات بخشا۔فرمایا

کل حضرت علی ہجویری سے ملاقات ہوئی ان کا فرمان تھا کہ اہل لاہر وفائر بندی سے ہرگز خوشی نہیں انہیں ہر حالت او ہر قیمت پر کشمیر چاہئےعوہ جنگ بندی کےکے حق میں نہ تھے نہ ہوں گے کشمیر کی جنگ طول کھینچے گی ہوسکتا ہے یہ دنیا کی طکویل تر یجنگ ثابت ہو بیچ میں کچھ سکون کے لمحات بھی آئیں گے تاہم جنگ کسی نہ کسی طور پک چلتی رہے گی کبھی تیز اور کبھی ہلکی حتیٰ کہ یہ خطہ جنت نظیر، رشک فردوس، کجہنم کا نمہ بنے اوا اپنے ساتھ ساتھ ہندو پاکستان کے امن کو بھی جلا کر خاکستر کر دے۔ تمہارے لئے علی ہجویری صاحب کا پیغام اور مشورہ ہے کہ تم پنڈی میں تکیہ کرواور وہی سے پاکستان کے حلاتا پر نظر رکھو۔ پنی میں بری امام بھی ہیں احب کمال ہیں۔مگر جذب کی اس منزل پر ہیں جہاں بے خبری ہی خبر بن جاتی ہےاور لاہوت اور ناسوت کے کنارے گویا مل جاتے ہیں ان کی خدت میں حاضری دومگر انہیں بلکل چھیڑے بغیر۔ہم کلامی کی کوئی بھی کوشش ان کے نزدیک نا قابل معافی ہوگی البتہ ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہو۔خبرنہیں کہ کس وقت ان کے منہ سے کونسل لفظ نکل جاءکونسا ایسا اشارہ ہو کہ جس سے تمہیں ہدایت مل جائے۔

دلی میں اوخسر وسنبھالے بیٹے ہیں ادھر بھی لوگوں کے بیور بگڑے ہوئے ہیں جواہرلعل کا تو بچپن گویا لوٹ آیا ہےان کا مزاج بگڑے نواب کا ساتھ ہوجار ہاہے بات بات پر برہم ہوجاتے ہیں کشمیری میں جنگ بندی کے باوجود پاکستان سے بے حدناراض ہیں لیاقت علی خاں سے جوذاتی تعلق تھاوہ بھی اب سیاست کی لپیٹ میں آگیا ہے۔وہ چونکہ کجدی، پدری کشمیری ہیں اس لئے کشمیرکواپنا خاندانی ورثہ سمجھتے ہیں کیسی عجیب بلکہ مضحکہ خیز بات ہے کہ ہندوستان کی تقسیم تو وہ بہرحال راضی ہوگئے مگر کشمیر کواپنا خاندانی مسئلہ بنائے بیٹھے ہیں ای چہ بوالعجبی ایست چ

بہرحال تم پہنڈ جاوٗ حالات پر نظر رکھواور دیکھو کہ کشمیر کا ونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے بری امام صاحب کے منہ سے نلے اللہ ہو پر دھیان رکھو کہ وہ اسے کب، کس طرح، کس لہجہ اور آواز میں کہتے ہیں ان کے منہ صسے صرف یہی دول لفظ نکلیت ہیں مگر ان میں اسرار ومعنی کا گویا پورا جہاں آباد ہے بس سمجھنے والا ہونا چاہئے۔

حضرت کے فرمان کے مطابق پنڈی پہنچ گیا سب سے پہلے بری امام کی خدمت میں حاضری دی وہ جب دستور جذب کی اس منزل پر تھے جہاں دوسرا ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ خاصی دیر زانوئے ادب تہ کئے بیٹھا کرہا مگر دہان مبارک سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ سمجھ گیا کہ اس وقت میری موجودگی منظور نہیں۔ لہٰذا جھک کر خاموشی سے آداب بجالایا اور وہاں سے رخصت ہوا۔

سیدھا پنڈی کلب پہنچا کہ اب وہی ہمارا ٹھکانہ ہوگیا تھا کشمیر کی جنگ اور اس کی نسبت خود پاکستان کی قسمت کے بیشتر فیصلے اب فوکج کے بڑے دفتر کے بعد ادھر ہی ہوتے تھے۔

کہنے کو اب وہاں پوری وزارت کشمیک بھی آ گئی تھی۔ اس کے سربراہ ایک نواب صاحب تھے بڑھے ٹھسے کے، پاکستن میں البتاً پہلی بار ہم نے کسی کو اپنے وقتگوں کا انگرکھا پہنچے دیکھا۔ فربہ اندامی کے باوجود ان میں ویسی ہ ّی نزاکت اور نفاست تھی جیسے کہ دلی کے نواززادوں میں ہعتی تھی حقہ اوپیچوان سے بھی شوق فرماتے۔ معلوم ہوا کہ ان کا اسم گرامی نواب مشتاق احمد گورمانی ہے مشتاق احمد تو کانوں کو بہت اچھا لگا مگر گورمانی ہماری فہم سے باہر تھا یہ صاحب رات بھر جاگتے اور دن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ظہر تک سوتے، ادھر فوج کے صدر دفتر میں افسران والاشان ن صرف کشمیر بلکہ پورے پاکساتن کے مسقبل کے بار کے میں سوچتے اور نصوبہ بندی کرتے رہتے۔

ہر چند کہ فوج کے جودستے کشمیر میں ہندوستان کی فوج کی آ کھ میں آنکھ دالے بیٹھے تھے ان کا کمانڈر انگریز ہی تھا مگر ہم نے دیکھا کہ اب انگریز کا وہ دبدبہ نہی جو آج سے چند ماہ پہلے تھا اول تو دیکھتے دیکھتے ہی پاکستانی اعلیٰ افسروں کی تعداد ماشاءاللہ کہاں سے کہاں ہوگئی تھی دویم یہ کہ اب خود انگریز کو یہ احساس ہو چکلا تھا کہ اس کا دور دورہ ختم ہوا اور اب اسے اپنا بوریا بستر گول کرنا ہی پڑے گا اور یہ کام جتنی کجلدی اور عزت و عافیت ہوجائے اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے اچھے شاطر کی یہ بھی شان ہے کہ جب بازی اردب میں آجات ہے تو وہ شہہ مات سے پہلے ہی بازی کے حریف کے حق میں دے دیتا ہے۔

ایک شام پنڈی کلب میں معمول سے کہیں یادہ رونق اور گہما گہمی دیکھی کلب گھر کے باہر رنگارنگ برقی قمقبے روشن تھے سردی اپنے پورے شباب پہ تھی کلب گھر اا اندر سے ولائتی

موسیقی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی فوجی افسروں کی ٹولیاں خوش گپیاں کرتی کلب گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ سب کے سب باوردی ان کی شان وشوکت بالکل وہی تھی جو ہم نے اپنے وقتوں میں انگریز افسر کان والا شان کی دیکھی تھی۔ مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی تھیں۔ بے پردہ، سرخی پاؤڈر سے آراستہ۔ پھر اچانک مرزا نوشہ یاد آ گئے پتہ نہیں یہ وقت بے وقت کہاں کود پڑتے ہیں ملاحظہ ہو۔

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن

دست مرحون حنا رخسار رہن غازہ تھا

جیسے جیسے کلب گھر میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے وہاں سے آ اے والی موسیقی کی آواز پر باتوں کا شور غالب ہوتا گیا جب آنے والوں کا سلسہل تقریباً ختم ہگیا تو کلب گھر کے اندر گیا واللہ کیا خوؔب تماشہ تھا ہندوستانی، معاف کیجئے پاکستانی افسروں کے جمگھٹے میں انگریز بھی تھے اوک ان میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ اپنوں سے بھی کہیں زیادہ نتہائی گرم جوشی سے ایک دوسرے کی صحت کے جام پر جام لنڈھا رہے تھے۔ مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی تھیں۔ رخسار سے رخسار ملائے مردوں کے ساتھ محورقص، کچھ ہنسی آئی کچھ رونا۔ آزادی بھلے انے کو آ گئی مگر نداز وہی غلامی کا سا تھا۔

پھر کلب گھر ایک دم سے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بینڈ باجے والوں نے موقع محل کی نسبت سے ایک خاص دھن چھیڑی یہ دھن ہماری جانی پہچانی سی تھی ضرور پہلے بھی کہیں نہ کہیں سنی ہوگی ادھر دن ختم ہوئی ادھر برقی قمقمے روشن ہوئے۔ اکثر مردوں اورعورتوں کے چہرے اجڑے اجڑے سے معلوم ہوئے۔ خواتین کی زلفیں پریشان مرد رومال سے ہونٹ پونچھ کر رہے تھے سب ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دے رہے تھے اتنا تو ہم پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ آج بڑا دن ہے مگر یقین اب آیا شنیدہ کہ بود مانند دیدہ۔

اسلامی پاکستان میں بڑے دن کی تقریب بچشم خود دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا اب پاکستان اپنی آزادی کے چوتھے سال یعنی ۵۱ء میں داخل ہوا چاہتا تھا۔ ہندوستان بھی اس کے شانہ بشانہ تھا

ہر چند کہ ہم دلی میں موجود نہ تھے مگر یقیناً وہاں بھی بڑا دن اور نیا سال اسی جوش وخروش سے منایا جار ہا ہوگا جس طرح پاکستان میں نئے سال کا جام نوش جان کر کنے کے بعد اکثر شکارء محفل کے چہروں سے تھکاوٹ کے آثار نظر آئے آنکھوں میں چڑھتے اترتے نشے کے ساتھ ساتھ نیند کا لبہ تھا۔ کچھ حضرات تو وردی سمیت کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

لیجئے صاحب بڑے دن کی بڑی رات ختم ہوئی تو حضرات قدم جما کر کلب گھر میں داخل ہوئے تھے لڑکھڑاتے ہوئے وہاں سے باہر نکلے خواتیکی حالت غیرسی تھی کسی کی ساڑھی کا پلو ڈھلکا ہکا کسی کا سر مرد کے کاندھکیک پر چند اصحاب ہنز ہاتھوں میں جام تھامے انتہائی بھدی آوازوں میں انگریزی گیت گا رہے تھے۔ ایک صاحب کونے میں بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رور ہے تھے غرضیکہ عجب سماں تھا محفل اگچہ منتشر ہورہی تھی مگر شکاءؒ کی ایک خاص تعداد ابھی تک اپنی اپنی جگہ جمی ہوئی تھی اور ایک اور بس ایک اور کی تکرار کیک ساتھ جام پہ جام لنڈھا رہی تھی ہم نے سوچا بہت ہولیا بس اب چپکے سے ادھر سے نکل جاؤ۔

۱۹۵۱ء کا سال شروع ہو چکا ہے۔ یعنی اب سے صرف چھ سال بعد ہمارکا اپنی معزولی اور جلاونی سکو ورپے سو سال ہو جائیں گے یعنی پوری ایک صدی دیکھیں وقت کس طرح پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔

کسال نو کے آاز ہی کے ساتھ یہ خبر آئی کہ پاکساتنی فوج کے انگریز سربراہ ہفتہ، دس روز میں پاکستان میں اپنلا زمت کی مدت پوری کر کے ولایت جانیا لے ہیں اور ان کی جگہ جنرل اویب صاحب فوج کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف ہوں گے جن ایوب وہی صاحبنکلے جنں ہم نے پہلی بار کپنڈی کلب ہی کے سبزہ زار پر دیکھا تھا بڑی پرکشش شخصیت شخصیت کے مالک، دراز قد، انتہائی موزوں خدوخال، اچھا کسرتی جسم، اس خبر پرہمیں دلی خوش یہوئی اور ہم ان کے حق میں دعا گو ہوئے کہ اللہ تعالیٰ انؒ ہیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اور تکمیل میں سروخروئی اور کامرانی عطا فرمائے ککا مین! حالانکہ مشکل ہی سے یقین اتا تھا کہ انگریز کمانڈر اتنی جلدی اور آسانی سے افواج پاکستان کی کمان چھوڑ کے چلا جائے گا مگ وہ واقعی چلا گیا اور جنرل ایوب خاں نے واقعی افواج کی کمان سنبھال لی۔

جہاں تک کشمیر کی جنگ کا تعلق تھا تو جنگ بندی کے باوجود محاذ ابھی تک خاصہ گرم تھا مگر اب اصل مسئلہ اوک اس کے حتمی، پر امن حل پر بحث ساتھ سمندر پار، ولایت سے بھی بہت پرے امریکہ میں ہو رہی تھی ادھر پنڈی اور دلی میں بھی ان کے نائندے موجود ہنوستانی اور پاکستانی فوکی اور شہری حکام سے گفت وشنید میں مصروف تھے بظاہر نشتند وگفتند و برخاستند کے علاوہ کوئی معقول پیش رفت نظر نیں آ رہی تھی۔ مسئلہ طول پکڑ رہا تھا اور طوالت کے ساتھ ساھت اس میں ہر قسم کی موشگافیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی تھیں اتنا تو ہمیں معلوم تھا کہ یہ لوگ بندر بانٹ کے ماہر ہیں اور ڈور کو اس طرح الجھاتے ہیں کہ اس کا سرا ہی کھو جاتا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ اپنی جگہ تھا کہ پاکساتن میں ایک زبردست دھما کہ ہوا معلوکم ہوا فوج میں باوت ہوگئی یاالٰہی یہ کیا ماجرہ ہے ابھی انگریز کمانڈر انچیف کو دفع ہوئے اور جنرل ایوب کو کمان سنبھال مدت ہی کتنی ہوئی تھی کہ فوج میں بغاوت کی خبر آ گئی یہ جان کر دل کو ذرا تسلی ہوئی کہ بغاوت صررف چند سر پھرے افسروں تک محدود اور فوج کی صفوں میں کسی قسم کا کوئی انتشار کوئی ہل چل نہیں ان سر پھرے افسروں کے کرتا دھرتا وہی صاحب تھے جنہیں ہم نے پہلی بار جنرل ایوب اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ پنڈی کلب کے سبزہ زار پر دیکھا تھا اور ان کا نام جنرل اکبر خاں تھا۔ یہ وہی صاحب تھے جن کے متلعق ہمار کا پنا تاثر یہ تھا کہ اگر چہ وہ جسمانی وجاہت میں جنرل ایوب کے برابر نہیں مگر خالص سپاہیانہ شانا و دبدبہ میں ان سے کہیں سوا۔ وہ اپنی تیز طرار حرکات سے ہمارے اپنے جن بخت خاں کی طرح مول ہوتے تھے ایک ایسا سپاہی جو میدان جنگ کا گرم و سرد چشیدہ ہوا دھر دلی سے بھی کچھ اس قسم کی خبر سنے میں آئی تھی وہاں کے کسی جنرل کی بھی جواہر لعل سے تو تو میں میں ہوئی تھی اور بس وہیں ختم ہو کر رہ گئی۔

بغاوت بے شک نہ ہو مگر سازش تو بہر حال ہوء اور وقت پر پکڑی گ ء بہت برا ہوا اگر اب سے پاکستن کے یہ لچھن ہیں تو آگے چل کر کیا ہوگا سازش ہماری تاریخ کا اہم ترین باب رہا ہے اور وہ بھی اپنوں کی اپنوں کے خلاف کچا ہے حکیم احسن اللہ خاں ہوں یا چا ہے مرزا الٰہی بخش یا خود ہماری بیگم نواب زینت محل، محکم سب کا ایک ہی یونی اقتدار اعلیٰ پر غاصبانہ قبضہ ہوتا ہے اور اس محر کک کے پیچھے حرص اور حکاقت دونوں ہی کی کارفائی ہوتی ہے اور حرض اور حماقت جب ہاتھ

ملاتے ہیں تو زبردست دھماکہ ہوتا ہے سازش اگر سر دست کامیاب بھی ہو جائے تو آگے چل کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فتح دراصل حماقت کی ہوئی ہے۔

کجو کہتے ہیں کہ آفات جب آتی ہیں تو ایک کے بعد دوسری او دوسری کے بعد تیسری، گویا ایک شیطانی چکر سا تندھ جاتا ہے یہی کچھ ان دنوں نوزائیدہ مما لک کے مابین دیکھنے میں آیا پنڈی سازش کا چرچہ ابھی پورے زور پر تھا کہ معلوم ہوا کہ ہندو۔ پاکستن میں ٹھن گئی کشمیر کی لڑائی تو صرف کشمیر تک محدود تھی اور کشمیر بہرصورت ایک متنازع علاقہ تھا اور اس کی اس حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم بھی کرلیا گیا تھا۔ مگر سرحدیں جب ایک بار متعین ہو گئیں او جن کی بین الاقوامی حیثیت کو تسلم بھی کرلیا گیا تو پھر ان پر فوج کشی کا کیا جواز رہ جاتا ہے مگر معلوم ہوا کہ دونوں اطراف سے افواج کی پیش قدمی ہوئی اور وہ ایک دوسرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالے آخری احکام کی منتظر ہیں۔

سید ھا بری امام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اہیں جیسے ہی ہماری حاضری کا علم ہوا تو آنکھ کھولے بغیر زوردار آوازمی اللہ ہو کہا او پھر مکمل خاموشی اختیار کر لی اس طرح کے جیسے ہماری موجدگی کا علم ہی ن ہہو سمجھ گیا کہ حضور نے جو کچھ فرمانا تھا فرمادیا اب سید ھے لاہر و چلو کہ میدان جنگ پنڈی سے دکرتر اور لاہر سے قریب تر ہو گیا ہے دل میں ہزار قسم کے وسوسے اور خدشات تھے۔ اگر یہ جنگ چھڑ گئی تو کیا ہو گا بوعلی قلندر اور خواجہ معین الدین چشتی مدظلہ نے لوں کی بھڑ اس کی طرف جو اشارہ کیا تھا وہ اب جنگ یا انتہائی کشیدگی کی شکل میں سامنے آنے والا تھا۔

لاہور پہنچ کر سید ھا علی ہجویری صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو گیا وہ گویا میری آمد کے منتظر کتھے فو کاً ہی شرف ملاقات بخشا۔ آداب سلام کے بعد حضور کے سامنے زانوے ادب طے کر کے بیٹھ گیا۔

دیکھ لیا تم نے سراج الدین بہر حال اب کے آئی تو ٹل جائے گی مگر ابھی تو ابداء ہے ابتلا کا دور تو ابھی آنے والا ہے اس وقت اللہ کی زمین کا یہ ٹکڑا دیوانگی اور پاگل پن کے آشوب میں ایسا پھنس کر رہ گیا ہے جو اجتماعی اقدام خودکشی سے کسی طرح سے کم نہیں پہلے بٹوارہ اور اس ک دوش بدوش ہونے والی تباہی قتل و غارت گری اور توپ وتفنگ سے ایک دوسرے پر چڑھائی کر کنے

پر تلے ہیں۔ بٹوارہ ہونا تھا جو ہو کر رہا۔ اُسے چھیڑنا کسی طرح بھی کارعاقلاں نہیں۔

''تم سیدھے دلّی جاؤ اور نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہو۔ خود ان کا تمہارے واسطے یہی حکم ہے۔ راستے میں دیکھ بھی لو گے کہ فوجیں کس طرح ایک دوسرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالے کھڑی ہیں فی امان اللہ۔''

میں الٹے پاؤں حضرت علی ہجویری کے حجرے سے باہر نکلا۔ ذرا کی ذرا شہر کی طرف نکلا کہ دیکھوں ادھر کا کیا حال ہے۔ شہر کی رونق اپنی جگہ تھی۔ مگر چند مقامات پر اونچی، اونچی نالیوں والی توپیں نصب ہوتی دیکھیں۔

مرگِ انبوہ جشن دارد' کا سماں سا تھا۔ شہر والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر سرحد کی طرف بڑھا سرحد کیا گویا شہر ہی کی توسیع تھی۔ ذرا اونچائی سے دیکھا تو مشرق اور مغرب میں دونوں ہی طرف فوجوں کا زبردست اجتماع نظر آیا۔ پوری تیاری تھی۔ بس طبل جنگ پر تھاپ پڑنے ہی والی تھی۔ جسمانی خدوخال اور رنگ کے فرق کے علاوہ بالکل انگریزوں کی افواج تھیں۔ وہی تنظیم، وہی مستعدی، قریب قریب ایک ہی وردیاں۔ اگر مشرق اور مغرب کے فرق کو بھول جاؤ تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ ہندوستان کی فوج کونسی ہے اور پاکستان کی کونسی۔ ہمارا اپنا فوجی تجربہ تو نہ ہونے کے برابر تھا تاہم جو بات ہماری سمجھ سے باہر تھی وہ یہ تھی کہ ہنگامِ جنگ کیسے معلوم ہوگا۔ کون کون ہے اپنے اور دشمن کے سپاہی میں کیسے فرق معلوم ہوگا۔

سرحدوں کے آس پاس فوجوں کا بڑا اجتماع دیکھنے میں آیا۔ پیچھے چھوٹی بڑی چوکیاں تھیں۔ اونچی اونچی نالیوں والی توپیں اور ایسا عجیب عجیب قسم کا سامان حرب جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دلّی پہنچتے ہی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام و آداب کے بعد خاموشی سے بیٹھ گیا۔ امیر خسرو حسب دستور حضرت کے ہم رکاب تھے۔ خلاف دستور انہوں نے گفتگو میں پہل کی اور فرمایا: ''ہنوز رقص محفل نباشد، رقصِ بسمل ھمی برپا است!''

امیر خسرو کی بات پر حضرت ذرا سے مسکرائے۔

''کچھ سنا تم نے 'صاحب عالم' جنگ کی تیاری دونوں طرف سے ہے مگر جنگ کرنے کا حوصلہ

اور ارادہ ایک کا بھی نہیں بقول امیر 'رقص بسمل نہیں بلکہ رقص محفل ہے' مگر تمہاری دلّی میں تو رقص محفل ہی میں رقص بسمل ہوا کرتے تھے۔ بگڑے ہوئے عاقبت نا اندیش نوجوان کوٹھوں پر رنڈی کے ذرا سے اشارے' ذرا سی ناگوارِی خاطر پر تمنچہ چلا دیتے تلوار' اٹھا لیتے'

''ہندوستان۔ پاکستان کی لڑائی کو بس کوٹھوں پر ہونے والی بگڑے نوجوانوں کی جنگ سمجھ لو۔ اماں لاحول ولا' بھلا دیوانگی اور حماقت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ مگر یہ دونوں تو ابھی سے آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ ایک کروکھشتر کی بات کرتا ہے تو دوسرا پانی پت کی یہ دونوں دل کی بھڑاس نکال کر ہی دم لیں گے بلکہ دم دیں گے۔ تم بس ذرا دیکھتے جاؤ۔ میاں سچ تو یہ ہے کہ:

گندم از گندم بر وید جو ز جو

از مکافات عمل غافل مشو

''جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں تو اس دنیا کی بداعمالیوں کی سزا ملے گی۔ مگر بندوں کی عدالت میں اس دنیا کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل جائے گی۔ تقسیم سے ایک ہی زمین کے دو ٹکڑے تو ہو سکتے ہیں سو سر دست ہو گئے مگر روحانی وحدت اور یکجہتی انسانی تاریخ کا وہ صحیفہ ہے جس کے ابواب نہیں ہوتے بس ایک رواں سلسلہ ہوتا ہے جو ازل سے چلتا آیا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا'

''تاریخ بنتی ہے بگڑتی ہے مگر تاریخی عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ تاریخ ہی وقت کا دوسرا نام ہے۔ یہ صرف اس وقت اپنے انجام کو پہنچے گی جب وقت ختم ہوگا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب اور کس طرح ہوگا۔ اب تم جاؤ اور اپنے کام سے کام رکھو۔ مرض اگر چہ بہت موذی ہے مگر لاعلاج نہیں۔ اچھے وقتوں کا انتظار کرنیکے بجائے جو اور جیسا بھی وقت میسر ہے اسے ہی غنیمت جان کر اس سے پورا استفادہ کرنا چاہئے...''

دلّی سے پلٹ کر کراچی کا رخ کیا کہ ذرا چل کر دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ جن حضرات کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے ان کا کیا حال ہے۔ پنڈی والے فوجی تو پیش قدمی کر چکے تھے۔ دیکھیں اب کراچی والے حالات کا کس طرح سامنا کرتے ہیں۔ کراچی پہنچے تھے کہ ایک روز شہر میں واقع ایک بہت بڑی کوٹھی کے سامنے لوگوں کا ایک جم غفیر دیکھا محمد علی جناح کی وفات کو اب

لگ بھگ تین سال ہو رہے تھے۔ مگر وہاں پر کھڑے لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر قائداعظم زندہ باد' 'پاکستان زندہ باد' اور 'قائدملت زندہ باد' کے نعرے لگا رہے تھے پاکستان اور قائدِاعظم زندہ باد کے نعرے تو بارہا سنے تھے۔' قائدملت زندہ باد' کا نعرہ پہلی بار سنا۔ معلوم ہوا کہ قائدملت کا خطاب عوام کی طرف سے لیاقت علی خاں کو عطا ہوا ہے۔ بہت خوب' جسے پیا چاہے وہی سہاگن!

اتنے میں لیاقت علی خاں کوٹھی کے برآمدے میں نمودار ہوئے۔ ان کا چہرہ گویا عزم اور حوصلے کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ ہمیں تو انکے حلیے میں پریشانی یا بوکھلاہٹ کا ذرا سا نشان بھی نظر نہیں آیا۔ 'برادران ملت' کہہ کر وہ لوگوں سے مخاطب ہوئے (غالباً اس نسبت سے انہیں قائدملت کا خطاب عطا ہوا تھا) سرحدوں پر ہندوستانی افواج کے اجتماع سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کا مختصر جائزہ لیا اور پھر اپنا ایک ہاتھ بلند کیا اور مکہ بنا کر زوردار آواز میں اعلان کیا کہ ہندوستان پاکستان کو حقیر نہ جانے اور ہندوستان والے اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے جارحانہ عزائم کے مقابلے کیلئے صرف لیاقت علی کا یہ مکہ ہی کافی ہوگا۔ اس وقت لوگوں کے جوش وخروش کی کیفیت دیدنی تھی۔ انہوں نے با آواز بلند نعرہ لگایا: ہندوستان کے لئے لیاقت علی خاں کا مکہ' اور اس کے بعد وہی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے۔

یوں لگتا تھا کہ بس جنگ اب چھڑی' اب چھڑی اور یہ انتہائی نازک صورتحال خاصے مہینہ ڈیڑھ ماہ چلی مگر پھر حالات سنبھل گئے اور آئی بلا ٹلتی معلوم ہوئی۔ طرفین نے اپنی اپنی افواج پیچھے ہٹالیں ہمارے تو کچھ پلے نہیں پڑا کہ آخر اس قسم کی خطرناک جنگ صورت حال پیدا کرنے کا بجز دلوں کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا جواز ہوسکتا ہے۔ جنگ نہ ہوئی بچوں کا کھیل ہوا۔ جب جی چاہا کھیل میں لگ گئے بہرحال 'رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت'

خدا خدا کر کے ابھی جنگ کا خطرہ سر سے ٹلا ہی تھا کہ ایک ایسا قیامت خیز دھماکہ ہوا جس نے پاکستان کے در و بام ہلا کر رکھ دیئے۔ خاں لیاقت علی خاں پنڈی کے دورے پر تھے۔ ایک شام وہیں کے ایک باغ میں انہوں نے عوام سے خطاب کرنا تھا لوگوں کا زبردست اجتماع تھا کہ تھالی اچھالو تو سر ہی سر جائے۔ تلاوت قرآن شریف اور نعت حضور مقبول کے بعد لیاقت علی لوگوں سے خطاب کیلئے اٹھے۔ انہوں نے حسب دستور حاضرین کو مخاطب کر کے 'برادران ملت' کہا ہی تھا کہ

ایک طرف سے تڑ سے گولی کی آواز آئی۔ گولی لیاقت علی خان کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد ظاہر ہے افراتفری اور بھگدڑ کی ایسی فضا پیدا ہوئی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کیا کر رہا ہے، کس حال میں ہے۔

ہر طرف سے 'مارو مارو' 'نکلنے نہ پائے' کا شور سنائی دے رہا تھا پھر دوبارہ تڑ تڑ گولی کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ جس بد بخت نے لیاقت علی خان کا خون کیا تھا اسے وہیں گولی مار کے ختم کر دیا گیا۔ اچھا ہوا یا برا ہوا اس کا فیصلہ کرنے والے بھلا ہم کون ہوتے ہیں۔ بہر حال ہمارے نزدیک اس مردود کو اس طرح ختم کر دینا ہرگز کار عاقلاں نہیں تھا۔ لیاقت علی خاں تو شہید ہوئے اور ان کے ساتھ ہی اس فرد کی کلیدی شہادت بھی ہمیشہ کیلئے ختم جس نے انہیں شہید کیا اس بارے میں بجز اس کے اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدا گوشہ نشین است تو حافظا مخروش

لو صاحب دیکھتے ہی دیکھتے گاندھی جی گئے، محمد علی جناح گئے، سردار پٹیل گئے اور اب لیاقت علی خاں شہید کر دیے گئے۔ اس طرح جہد آزادی کے چار بڑے ستون گر گئے۔ رہ گئے جواہر لال تو ان کے مزاج میں بوکھلاہٹ اور اکھڑ پن کی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو چلی تھی اس لئے کہ وہ ہمیشہ بڑوں کے سایہ عاطفت میں رہے۔ پہلے گاندھی جی اور ان کے بعد سردار پٹیل اب حکومت کی پوری باگ ڈور سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا کہاں اور کس طرح استعمال کریں۔ پاکستان سے تو پہلے ہی بہت بیزار تھے۔ اب آس پاس کی چھوٹی خود مختار ریاستوں پر بھی ان کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ وہ کسی نہ کسی عنوان کبھی تقسیم کا رونا روتے کبھی مہاراجہ اشوک کے پراچین ہندوستان کی بات کرتے جس کی سرحدیں وادئ گنگ وجمن سے لے کر شمال مغربی سرحد سے آگے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا جیسے اندر ہی اندر انہیں کوئی غم، کوئی غصہ کھائے جا رہا ہے، بظاہر بھی ان کی حالت کافی غیر اور قابلِ رحم دکھائی دیتی تھی۔

آٹھواں باب

فوج ظفر فوج

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پاکستان لڑکھڑا کر پھر سنبھل گیا۔مگر اب اقتدار اعلیٰ کی باگ ڈور حکومت کے ہاتھ سے نکلتی اور فوج کے ہاتھ میں جاتی نظر آ رہی تھی۔ جنرل ایوب خان آہستہ آہستہ پاکستان کی بساط اقتدار پہ چھائے جا رہے تھے۔ ریاستی حکام کی باہمی آویزش' ملک کے مشرقی اور مغربی بازوؤں کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی کے علاوہ فوج کی اقتدار اعلیٰ کی طرف پیش قدمی کے پیچھے ہندوستان کے بڑھتے جارحانہ عزائم کا بھی دخل تھا۔ پاکستان تو گویا پیدا ہی خطرات کی آغوش میں ہوا اور اس طرح ڈر اور خوف گویا اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ ہندوستان اس کا جنم کا بیری اور ایسا ہمسایہ جس سے مفر ممکن نہیں۔اس کے باوجود کہ دونوں نے اپنے اپنے ٹھکانے الگ کر لئے تھے مگر بیچ میں دیوار تک نہ تھی۔

ایسی نازک صورتحال سے دوچار پاکستان کا صرف فوجی قوت پر تکیہ کرنا لازمی تھا۔حکومت کی اہمیت سے انکار نہیں۔مگر ملک کا تحفظ دیگر امور حکومت سے بہرحال بالاتر تھا' ملک رہے گا تو حکومت بھی ہوگی۔ جب ملک ہی نہ ہوگا تو حکومت کس کی اور کس کام کی اور اگر ہوگی بھی تو غیر کی۔

لہٰذا پورا زور فوجی قوت کی افزائش پر ہوگیا۔ دامے درمے جہاں سے اور جیسے بھی ہو فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کیا جائے۔ پاکستان نے اسلحہ کے حصول کے لئے امریکہ کی طرف منہ کیا۔ برطانیہ عظمیٰ اب کنگال ہو چکا تھا۔اس کے پاس سوائے جنگ عظیم کے بچے کھچے اسلحہ کے اور

تھا ہی کیا جو وہ پاکستانی کو دیتا۔اتنی بڑی جنگ میں فتح سے ہمکنار ہونے کے بعد برطانیہ اقتدار کی جنگ ہار گیا۔اس کو کہتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کبریائی۔ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت۔

ادھر پاکستان نے حصول اسلحہ کے لئے امریکہ کا رخ کیا۔ادھر ہندوستان نے ایک ایسے ملک کا جس کا ہم نے شاید ہی کبھی نام سنا ہو' یہ ملک روس تھا۔ ہماری سمجھ سے باہر تھا کہ آخر ہندوستان کو کیا پڑی ہے کہ وہ اسلحہ بندی کرے۔آخر اسے کس سے اور کہاں سے خطرہ تھا۔اس کے پڑوسی ممالک میں (بشمول پاکستان) کسی لحاظ سے بھی کوئی بڑا اور طاقتور نہیں تھا مگر جواہر لال کے ایک مضبوط ہندوستان کے خواب کی تکمیل کے لئے فوجی قوت گویا شرط اول تھی۔اس طرح ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف ہندوستان' دونوں کے دونوں افواج بڑھانے اور انہیں جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنے کی دھن میں لگ گئے۔

پاکستان میں فوجی قوت میں اضافہ آگے چل کر فوجی اقتدار کی شکل میں سامنے آیا۔سب سے پہلے شہر لاہور میں جرنیلی راج نافذ ہوا۔اس کے بعد پورے ملک میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ حکومت کے ہر شعبے پر گویا فوج کی چھاپ لگ گئی۔گو باہر سے حکومت شہری حکام اور قائدین کے ہاتھوں میں تھی مگر اندر خانے فوج کی عملداری تھی۔طرفہ تماشہ یہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات میں جتنا بگاڑ آتا اتنا ہی پاکستان کی بساط حکومت اور سیاست پر فوج کا غلبہ بڑھتا جاتا۔حالت یا اینجا رسید کہ فوج اور ملک بالکل ہم معنی اور ہم ذات ہو کر رہ گئے۔یعنی اگر فوج ہے تو ملک بھی ہے اور فوج نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اسی اثناء میں ایک ایسا موقع آیا کہ جس کا تعلق ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ خود ہماری ذات سے تھا۔ایک صبح جو اخبارات پر ہماری نظر پڑی تو خود اپنی تصاویر اور اپنا نام نظر آیا۔خدا گواہ ہے۔یہ سب کچھ تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔غدر کو ہوئے پوری ایک صدی بیت چکی تھی۔ جب ہم خود دنیا سے اٹھ گئے تو بھلا ہمارا دنیا اور دنیا والوں سے کیا واسطہ۔ یہ تو انہیں

حضرت نظام الدین کا کمال تھا کہ انہوں نے ہمیں ابدی نیند سے اٹھا کر اس کام سے لگا دیا جو ہم اپنی چار روزہ زندگی میں نہ کر پائے تھے۔

معلوم ہوا کہ جنگ آزادی کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ کیسی جنگ آزادی' کس کی جنگ آزادی بادشاہ کے حکم اور اشارے کے بغیر ہونے والی جنگ کو صرف غدر کہا جا سکتا ہے۔ کلکتہ اور میرٹھ کے باغی سپاہیوں نے جو کچھ بھی کیا۔ اگر جی بھر کر ان کی داد بھی دی جائے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ تاہم تنخواہ دار' وفادار پیشہ ور فوجی کی حیثیت سے ان کے اس اقدام کی حمایت نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح انہوں نے نہ نمک خواری کا بھرم رکھا نہ اس حلف وفاداری کا احترام جو انہوں نے اپنے انگریز حکام کے حق میں اٹھایا تھا۔

جہاں تک خود ہمارا تعلق تھا سو میاں چاہے تو آپ ہماری ضعیفی اور ضعف پر ترس کھا کر ہمیں قابل معافی قرار دیں' چاہے ہمیں بزدلی اور کم حوصلہ قرار دے کر ہدف ملامت بنائیں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنے حق میں اپنی ضعیفی اور مجبوری کے علاوہ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ہمیں خبر کئے بغیر میرٹھ سے بھاگے ہوئے سپاہ قلعہ معلیٰ کے باہر آ کر ہمیں پکارنے بلکہ للکارنے لگے کہ آؤ اور آ کر ہماری کمان سنبھالو تو ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم ان کی اس حرکت پر تھرا کر رہ گئے تھے۔ اول تو یہ کہ ہم نے پہلے ہی اپنی زیر کمان کتنی جنگیں لڑی تھیں اور دوسری یہ کہ اگر کمان سنبھالتے بھی تو کس کی۔ ایک ایسی بے سُری فوج کے سپہ کی جو اپنے افسران اعلیٰ کو ان کے بیوی بچوں سمیت تہ تیغ کر کے دلّی پر چڑھائی کے لئے آئے تھے۔

دلّی' لاہور' کراچی جہاں بھی ہماری نظر اخبارات پر پڑتی۔ بس جنگ آزادی ہی کا ذکر دکھائی دیتا۔ حقیقت کم اور زیب داستان زیادہ' سچ ہے:

چوں نہ بینند حقیقت رہِ افسانہ زنند

داستان گوئی کا یہ سلسلہ ہفتہ دس روز تک چلتا رہا۔ ہم اس وقت پورے ہندوستان کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس میں بھی حضرت نظام الدین ہی کی کارستانی ہو۔ مجموعی طور پر ہمارا ذکر خیر' خیر اور نیکی ہی کے الفاظ میں بھی لیا جا رہا تھا۔ اس پر باری تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجا لایا جائے کم ہے۔

جنگ آزادی (ہماری زبان میں غدر) کا بیان ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ پاکستان کے مشرقی کنارے فوج 'سول' حکام کی مدد کے لئے بلالی گئی ہے اور ہر چند کہ وہاں جرنیلی راج کے نفاذ کا باقاعدہ اعلان نہیں ہوا مگر فوج کو وہی اختیارات دے دیئے گئے ہیں جو جرنیلی راج میں دیئے جاتے ہیں۔فوج سارے صوبے میں پھیل کر اپنی کاروائی میں مصروف ہوئی۔لاہور میں جرنیلی راج کو گئے ابھی کتنا عرصہ ہوا تھا جو فوج آبادی کے لحاظ سے ملک کے سب سے بڑے صوبے میں بلالی گئی۔ ہنوز ہمارا رخ بنگال کی طرف نہیں ہوا تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔خواہ مرکز میں خواہ صوبوں میں' سب مغربی پاکستان میں ہو رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین جو کشیدگی اور آویزش تھی۔اس کا تعلق بھی مغربی پاکستان سے تھا۔ نیز جن فرائض کی بجا آوری اور تکمیل کی ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی تھی۔ان کی نسبت بھی اسی حصے سے تھی۔سو ہماری پوری توجہ اور مصروفیت اس خطے تک محدود رہی۔

پھر اچانک پاکستان کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سیاست کی بساط بالکل الٹ کر رہ گئی۔ فوج نے پہلی بار پورے ملک کا انتظام سنبھال لیا۔تاریخ شاہد ہے کہ فوجی قوت بیرونی جارحیت کے خلاف اس وقت کارگر ہوسکتی ہے جب سول حکومت اپنی جگہ مستحکم اور پائیدار ہو۔بصورت دیگر فوج کی توجہ بیرونی خطرات سے ہٹ کر اندرونی خطرات اور بحرانوں پر منعکس ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں بعینہٖ یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔یوں تو محمد علی جناح صاحب کی وفات کے بعد ہی سے سیاسی عمل ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا مگر لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد جڑ سے اکھڑتا معلوم ہوا۔سیاسی قائدین باہمی جھگڑوں اور اختلافات میں ایسے الجھے کہ الجھتے ہی چلے گئے۔ جماعتی اور انفرادی دونوں سطحوں پر ہر ایک کو بس اپنی اپنی اور اپنے اپنے اقتدار کی پڑی تھی۔

ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں میں کشیدگی اتنی تیزی سے بڑھی کہ یوں لگتا جیسے یہ ایک ہی ملک کے دو صوبے نہیں بلکہ دو علیحدہ ملک ہیں' مرکزی اقتدار کا محور مغربی پاکستان میں تھا۔فوج کی بڑی اکثریت کا تعلق بھی مغرب سے تھا۔سول حکام بھی ادھر کے تھے۔ان حالات میں مشرقی پاکستان میں محرومی کا احساس لازمی تھا اور مرکز کی طرف سے بگڑتے ہوئے حالات کے تدارک کا کوئی حتمی اور معقول اقدام نہیں کیا جا رہا تھا۔

تعجب اس پر تھا کہ ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے مارشل لاء کا خیر مقدم کیا اور جانے والے سیاسی قائدین کی شان میں تبرّا۔ عوام ان کی آئے دن کے جھگڑوں اور اکھاڑ پچھاڑ سے اتنے تنگ آچکے تھے کہ ان سے ہر حالت میں اور ہر قیمت پر جان چھڑانا چاہتے تھے۔ پاکستان کے برعکس ہندوستان میں جواہر لال نے جمہوریت کی آڑ میں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی سامنے چوں بھی کرے۔ وہ جو چاہتے ہیں اور جب چاہتے اپنی من مانی کرتے۔ کشمیر پر اگر چہ بین الاقوامی سطح پر گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر جواہر لال گویا اپنے تئیں کشمیر کا فیصلہ ہندوستان کے حق میں کر چکے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ انہوں نے کشمیر کے سب سے بڑے قائد کو جن سے ذاتی دوستی اور تعلقات پر انہیں بہت ناز تھا۔ صرف اس لئے جیل میں ڈال دیا کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کشمیر کی مکمل خودمختاری کے خواہاں تھے اور ان کا یہ مطالبہ کسی حالت میں بھی جواہر لال نہرو کو منظور نہ تھا۔ وہ کشمیر کو ہندوستان ضم کرنے سے کم مسئلے کے کسی اور حل پر تیار نہ تھے۔ ان کے مزاج کا پیدائشی الڑھ پن اب ایک ایسی خطرناک صورت اختیار کرتا جارہا تھا جو پورے خطے کے امن کو خاک میں ملاسکتا تھا اور اس کا عملی مظاہرہ جلد ہی سامنے آ گیا۔

چند برس کی بات ہے کہ ہم نے اپنے قیام دلّی کے دوران بارہا 'ہندی چینی، بھائی بھائی' کے نعرے سنے۔ اس کے بارے میں ہم اپنی ناواقفیت کا پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں۔ مگر چین کو کون نہیں جانتا اور نہیں تو کم از کم چینی گڑیا تو دیکھ چکے تھے۔ سنا بھی اور پڑھا بھی کہ چین دنیا کا ایک عظیم ملک اور قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ ہے۔ 'ہندی چینی بھائی بھائی' کے نعرے سن کر ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کہ یہی نعرہ ہندو، پاکستان کے تعلقات کے حق میں لگایا جاتا۔ ہندو اور چین لاکھ ایک دوسرے کے دوست اور ہمسایہ ہیں مگر ہندو پاکستان سے قریب تر نہیں ہو سکتے۔ ہندو پاکستان نے ایک ماں کی گود میں آنکھ کھولی۔ ایک ہی ماں کا دودھ پیا اور اب حال یہ ہو چلا ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے جارہے ہیں۔

ابھی ابھی پتہ چلا کہ کہیں ہمالیہ کی لڑائی میں ہند اور چین میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی ہے۔ شنید ہے کہ سرحدی حدود سے متعلق کچھ اس قسم کا جھگڑا تھا جسے پاکستان اور اس کے شمالی مغربی ہمسایہ

ملک اورافغانستان کے مابین تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ادھر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ اخباری خبروں کے مطابق جواہر لال چین کے مطالبے پر اتنے برہم ہوئے کہ انہوں نے اپنی افواج ظفر موج کو حکم دیا کہ چینیوں کو فوراً متنازع فیہ علاقے سے نکال باہر کرو۔ گویا چین نہ ہوا آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہو گئیں کہ ادھر ہندوستان کی فوج کو وزیراعظم کا حکم ملا ادھر انہوں نے عدو پر چڑھائی کر دی اوراس کا ملک یا علاقہ فتح کرلیا۔

اس سے کچھ ہی عرصے پہلے جواہر لال اس قسم کی ایک اور حرکت کر بیٹھے تھے۔ گوا کا جزیرہ ہمارے وقتوں سے ایک یورپی طاقت پرتگال کا مفتوحہ علاقہ چلا آرہا تھا۔ خود انگریزوں نے بھی اس کی اس حیثیت کو تسلیم کیا اوراسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کسی قسم کی مہم جوئی کا تو بھلا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا مگر جواہر لال کو ہرگز یہ منظور نہ تھا کہ ان کے آس پاس کوئی بھی علاقہ ہندوستانی اقتدار سے باہر رہے۔ لہذا افواج کو گوا پر چڑھائی کا نادرشاہی حکم صادر کیا۔ وہاں بجز پرتگالی پولیس کے چند نفوس کے اور تھا ہی کیا جو ہندوستان کی منظم افواج کا مقابلہ کرتا۔ چنانچہ ایک دوروز کے اندر اندر گوا پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

اب جواہر لال نے گویا چین کو بھی گوا کی طرح کا تر نوالہ سمجھ کر اپنی افواج کو حکم دیا کہ اس کی افواج سرحد کے دوسرے پار پھینک دیں۔ فوج نے اپنے قاعدے اور دستور کے مطابق وزیراعظم کے حکم کی بجا آوری کی مگر فوراً ہی منہ کی کھائی اور چینی افواج کو سرحد کے اس پار پھینکنے کی بجائے خود اپنا علاقہ چھوڑ کر پسپائی پر مجبور ہو کر عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئیں۔ اب صورتحال مکمل طور پر چین کے حق میں تھی اوراگر وہ چاہتا تو ہندوستان کے شہری علاقوں کی طرف پیش قدمی کر کے کلکتہ تک پہنچ سکتا تھا۔ تاہم انہوں نے نہ صرف مزید پیش قدمی سے گریز کیا بلکہ یک طرفہ جنگ بندی کر کے ہندوستان، اصل میں جواہر لال کو حیران اور پریشان کر کے رکھ دیا۔ لڑنے کا یارہ تو اب کہاں اور کس کے پاس تھا۔ ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی پتہ نہیں جواہر لال کو آخر یہ ہو کیا گیا تھا جو ایک اتنا اچھا اور مہذب انسان اس قسم کی مہم جوئی بلکہ اوچھی حرکتوں پر اتر آیا۔ جہاں تک دلوں کی

نابلد بھی نہیں رہے تھے۔ جتنے شروع شروع میں تھے۔ ہم خود دیکھ رہے تھے کہ حالات کا رخ اس جانب ہے جس کا اشارہ بزرگان دین پہلے ہی کر چکے تھے۔ یعنی دونوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہی دم لیں گے اور باہمی امن و آشتی (ان دنوں کی اخباری زبان میں بقاء باہمی' ترکیب تو اچھی ہے مگر ذرا بھونڈی' بھونڈی سی) کی منزل تک پہنچنے سے پہلے انہیں آتش و آہن کے راستے گزرنا ہوگا۔

پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان اگرچہ مرکزی شہر اور حکومت کے صدر مقام کراچی سے ہوا تھا۔ مگر اب اقتدار کا اصل مرکز فوج کے صدر مقام پنڈی پہنچ چکا تھا۔ یوں قافیہ تو دلّی اور کراچی کا بھی ملتا تھا مگر اس میں قدرے جھول تھا۔ البتہ دلّی اور پنڈی بالکل ہم قافیہ تھے اور آئندہ ہونے والے واقعات اور حادثات کا آغاز اور ظہور اب انہیں دو مقامات سے ہوگا۔

پنڈی (یعنی پاکستان) میں تو فوج میں دور جدید اسلحہ بندی کا عمل کشمیر کی لڑائی کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ چین سے شکست کے بعد اب دلّی یعنی ہندوستان میں بھی یہی عمل بڑے زور وشور سے شروع ہو گیا تھا۔ جواہر لال کا بس چلتا تو وہ ساری دنیا سے اعلیٰ سے اعلیٰ جدید ترین ہتھیار اکٹھا کر کے ہندوستانی افواج کی گود میں ڈال دیتے۔ چین کے ایک جھٹکے ہی نے ان غیر جانبداری اور پرامن بین الاقوامی حکمت عملی کے کس بل نکال کے رکھ دیئے تھے۔ اور وہ برطانیہ کے ساتھ امریکہ کے سامنے اس طرح دست بستہ کھڑے تھے جیسے وہ آقا اور وہ یہ غلام اور ہمیں یہ سب کچھ دیکھ کر اور جان کر واقعی کوفت اور دلی دکھ ہوا۔

لہٰذا ہم نے سیدھے پنڈی کا قصد کیا اور وہاں پہنچ کر اپنے پرانے ٹھکانے یعنی پنڈی کلب پہنچ گئے ۔شام کا وقت تھا۔ سردی جاتے جاتے ایک بار پھر لوٹ آئی تھی ۔اس لئے ہم سیدھے کلب گھر کے اندر داخل ہو گئے ۔ وہاں بڑی رونق تھی ۔قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی ۔ جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے ۔ چاروں طرف سگریٹ کا دھواں تھا۔ اس دھویں میں ہمارے پیچوانِ خاص کی دھول بھی نہ تھی ۔مگر آنکھوں میں مرچیں سی لگنے کے باوجود ناک اور منہ کو اتنا برا بھی نہیں لگا۔ کلب گھر کے اندر گھوم کر دیکھا۔ تو سب کے سب نئے چہرے جو پہلی بار ہمارے سامنے آئے ۔ پرانوں میں

نابلد بھی نہیں رہے تھے۔ جتنے شروع شروع میں تھے۔ ہم خود دیکھ رہے تھے کہ حالات کا رخ اس جانب ہے جس کا اشارہ بزرگان دین پہلے ہی کر چکے تھے۔ یعنی دونوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہی دم لیں گے اور باہمی امن و آشتی (ان دنوں کی اخباری زبان میں بقاء باہمی' ترکیب تو اچھی ہے مگر ذرا بھونڈی' بھونڈی سی) کی منزل تک پہنچنے سے پہلے انہیں آتش و آہن کے راستے گزرنا ہوگا۔

پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان اگرچہ مرکزی شہر اور حکومت کے صدر مقام کراچی سے ہوا تھا۔ مگر اب اقتدار کا اصل مرکز فوج کے صدر مقام پنڈی پہنچ چکا تھا۔ یوں قافیہ تو دلّی اور کراچی کا بھی ملتا تھا مگر اس میں قدرے جھول تھا۔ البتہ دلّی اور پنڈی بالکل ہم قافیہ تھے اور آئندہ ہونے والے واقعات اور حادثات کا آغاز اور ظہور اب انہیں دو مقامات سے ہوگا۔

پنڈی (یعنی پاکستان) میں تو فوج میں دور جدید اسلحہ بندی کا عمل کشمیر کی لڑائی کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ چین سے شکست کے بعد اب دلّی یعنی ہندوستان میں بھی یہی عمل بڑے زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ جواہر لال کا بس چلتا تو وہ ساری دنیا سے اعلیٰ سے اعلیٰ جدید ترین ہتھیار اکٹھا کر کے ہندوستانی افواج کی گود میں ڈال دیتے۔ چین کے ایک جھٹکے ہی نے ان غیر جانبداری اور پرامن بین الاقوامی حکمت عملی کے کس بل نکال کے رکھ دیئے تھے۔ اور وہ برطانیہ کے ساتھ امریکہ کے سامنے اس طرح دست بستہ کھڑے تھے جیسے وہ آقا اور وہ یہ غلام اور ہمیں یہ سب کچھ دیکھ کر اور جان کر واقعی کوفت اور دلی دکھ ہوا۔

لہٰذا ہم نے سیدھے پنڈی کا قصد کیا اور وہاں پہنچ کر اپنے پرانے ٹھکانے یعنی پنڈی کلب پہنچ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سردی جاتے جاتے ایک بار پھر لوٹ آئی تھی۔ اس لئے ہم سیدھے کلب گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔ جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹ کا دھواں تھا۔ اس دھوئیں میں ہمارے پیچوانِ خاص کی دھول بھی نہ تھی۔ مگر آنکھوں میں مرچیں سی لگنے کے باوجود ناک اور منہ کو اتنا برا بھی نہیں لگا۔ کلب گھر کے اندر گھوم کر دیکھا۔ تو سب کے سب نئے چہرے جو پہلی بار ہمارے سامنے آئے۔ پرانوں میں

سے شاید ہی کوئی دکھائی دیا ہو۔ ایک صاحب ذرا بھاری جسم کے گھنی مگر نفاست سے ترشے ہوئی مونچھوں والے گویا شمع محفل بنے ہوئی آتش دان سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ ان کے آس پاس اور چند حضرات تھے۔ ان میں سے ایک صاحب اپنے خاص خدوخال کی مناسبت سے نمایاں تھے۔ رنگ ان کا بھی پہلے والے صاحب کی طرح طرح سرخ وسپید مگر چہرہ طباق سا ترائی کے پہاڑیوں جیسا' مونچھیں گھنی اور سنہری۔ تیسرے صاحب معمولی خدوخال کے تھے مگر جب ہنستے تھے تو ان کے دانت بالکل اصلی سیپی کے موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ یہ سب حضرات پختہ عمر کے یعنی ہمارے حساب سے چالیس سال سے کچھ اوپر کے معلوم ہوتے تھے اور سب کے سب اعلیٰ عہدوں پر فائز معلوم ہوتے تھے اور اس کا اظہار نسبتاً وہ جوان حضرات کی نشست و برخواست اور رویہ سے ہوتا تھا جو ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہر چند کہ محفل ناؤ نوش تھی اور باہمی بے تکلفی نمایاں تھی مگر حد ادب سے تجاوز معدوم!

یقیناً ان سب حضرات کا تعلق افواج پاکستان سے تھا اور جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ان میں دو حضرات جرنیل' ایک بریگیڈیئر اور باقی کرنل اور میجر تھے۔ ان میں بظاہر سب سے زیادہ چونچال اور ذرا بھاری جسم والے افسر کا نام جرنل یحییٰ خان' دوسرے انہیں کی طرح سرخ وسپید مگر طباق سے چہرے والے کا نام جرنل حمید اور چمکتے دانتوں والے صاحب بریگیڈیئر پیرزادہ تھے ان میں سے دو جرنیل یحییٰ اور حمید غضب کے بلانوش اور دھواں دار سگریٹ پینے والے تھے۔ بریگیڈیئر صاحب بلانوشی میں ہم پیالہ' مگر دھواں پھونکنے میں ذرا کم بلکہ محتاط۔

ان سب کو ہم نے اپنے روحانی سفر میں پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر رسمی تعارف اور مزید معلومات کے بغیر بھی ہم دیکھ رہے تھے کہ ان میں سب سے زیادہ فیصلہ کن شخصیت کے مالک اور جرنیلی شان والے جرنیل یحییٰ صاحب تھے۔ ان کی ہر بات' ہر حرکت منہ سے نکلے ہر لفظ سے ایسی خود اعتمادی ٹپکتی کہ اس پر ایک پر ایک قسم کے تکبر اور غرور کا گمان ہوتا تھا۔

جرنل حمید ان کے بالکل برعکس تھے۔ خود کم بولتے اور دوسرے کی بات پر دھیان زیادہ دیتے۔ بیچ بیچ میں کوئی ہنسی' مذاق کی بات چھوڑ دیتے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے۔ بریگیڈیئر پیرزادہ

دونوں جرنیلوں کی باتوں کو بہت غور سے سنتے۔ سنتے وقت ان کی آنکھیں بالکل گول، گول سی ہوجاتیں۔ پھر وہ خود بھی کچھ کہتے اور پہلے کی طرح حلقہ بگوش ہوجاتے۔

جرنل یحییٰ اور جنرل حمید سے ذرا سے فاصلے پر ہال کے ایک کونے میں ہمیں ایک اور صاحب نظر آئے۔ حلیے میں بالکل منفرد تھے۔ انتہائی گھنی اور چڑھی ہوئی مونچھیں ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ تھیں۔ مونچھوں کے بغیر تو ان کی شخصیت کا تصور بھی مشکل ہی ہوگا۔ رنگ ان کا گہرا سانولا۔ وہ اس اپنی میز پر تنہا بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ شراب کا بھرا ہوا گلاس ان کے سامنے رکھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ اخبار سے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھتے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ پھر وہ ایک دو چسکیاں لے کر دوبارہ اخبار کے پیچھے اپنا منہ ڈھانپ لیتے۔

اتنے میں دو تین اور اصحاب ہال میں داخل ہوئے۔ رنگ روپ میں وہ مونچھوں والے صاحب سے بہت ملتے تھے۔ ان میں ایک صاحب جو ذرا بڑی عمر کے تھے۔ یعنی وہی چالیس پینتالیس کے پیٹے میں، اس میز کی طرف بڑھے جس پر جنرل یحییٰ اور ان کے دوست بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ہیلو ہیلو کیا۔ اس کے بعد مزاج پرسی اور پھر رسمی اجازت لے کر، مونچھوں والے صاحب کی میز پر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ جو دو تین نوجوان آئے تھے، وہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اور مونچھوں والے صاحب کے ساتھ ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مونچھوں والے صاحب کھڑے ہوئے تو ان کا قد بہت چھوٹا نکلا۔ ان کے ساتھ آنے والے مہمان بھی سوائے ایک نوجوان کے سب چھوٹے یا درمیانہ قد کے تھے۔

انہوں نے خاص فوجی انداز سے اپنے سے بڑی عمر والے مہمان کا استقبال کیا۔ انہیں 'سر' کہہ کر مخاطب کیا اور تشریف رکھنے کو کہا۔ اس کے بعد چٹکی بجا کر کلب کے بیرے کو بلایا اور سب کے لئے ان کے پسندیدہ مشروبات کا حکم دیا۔ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے جنرل یحییٰ نے نظر بچا کر مونچھوں والے صاحب کی میز کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں اپنے برابر بیٹھے جنرل حمید صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ پھر ان دونوں نے ایک ساتھ گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ مگر فوراً ہی گردن سیدھی کر لی۔ ظاہر ہے اس طرح ایک دوسرے کو مڑ مڑ کر دیکھنا خلاف تہذیب تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ فریقین کی آنکھیں چار ہوئیں کہ نہیں البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جنرل یحییٰ صاحب کی پارٹی پر خاموشی بلکہ ایک قسم کی بیزاری سی چھا گئی۔ بات چیت سرگوشیوں میں بدل گئی اور قہقہے دبی دبی ہنسی میں جیسے عموماً کسی کا مذاق اڑاتے وقت ہوتا ہے۔

پتہ چلا مونچھوں والے صاحب اور ان کے سارے احباب کا تعلق ملک کے مشرقی حصے سے تھا۔ یعنی وہ سب کے سب بنگالی تھے۔ مونچھوں والے صاحب کا عہدہ اور نام کرنل عثمانی تھا جبکہ بعد میں آئے ہوئے پختہ عمر والے صاحب جنرل وصیع الدین' باقی دو میں ایک نوجوان کرنل حق تھے اور دوسرے میجر ضیاء الرحمٰن' کرنل عثمانی کا حلیہ قد وقامت اختصار اور گہرے سانولے رنگ کے باوجود ان انگریز کرنیلوں کا سا تھا۔ جنہیں بارہا ہم اپنے زمانے میں دیکھ چکے تھے۔ جنرل وصیع الدین کی داڑھی مونچھ صاف تھی اور ان کی شخصیت میں سوائے اس تہذیبی جھلک کے جس کا تعلق عموماً گھر اور خاندان کی تربیت سے ہوتا ہے اور کوئی چیز نمایاں نہیں تھی۔ نوجوان افسران میں کرنل حق ذرا گھبرائے اور کمزور اعصاب کے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بھی داڑھی مونچھ دونوں ہی صاف تھے۔ البتہ میجر ضیاء الرحمٰن مضبوط اعصاب اور شخصیت کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ عہدے میں سب سے کم ہونے کے باعث وہ کم ہی بولتے تھے۔ مگر جب بولتے تو ان کا عہدہ پیچھے اور شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی تھی۔ ان کی مونچھیں بھی گھنی اور ترشی ہوئی۔

ہم نے پہلی بار بنگال افسروں کو پنڈی کلب میں دیکھا۔ پاکستانی یکجہتی کے حق میں یہ نسبتاً ایک مثبت پیش رفت معلوم ہوتی تھی کہ اب فوج بنگالیوں کے لئے شجر ممنوعہ نہیں رہی تھی اور انہیں بھی اس کا پھل مل رہا تھا۔ البتہ جو بات حیران کن اور اتنی ہی پریشان کن تھی وہ یہ کہ ایک ہی فوج کے افسر اور ایک ہی کلب کے ممبر ہونے کے باوجود بنگالی اور غیر بنگالیوں کے مابین اتنا فاصلہ کیوں تھا کہ آمنے سامنے ہوتے ہوئے بھی دونوں نے اپنی اپنی دنیا علیحدہ علیحدہ بنائی تھی اور بجز رسمی تعلقات کے وہ ایک دوسرے سے اتنی ہی دور معلوم ہوتے تھے جتنے ان کے صوبے۔

بنگال افسروں کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد جنرل یحییٰ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے اپنے جام ختم کئے اور کھڑے ہو گئے۔ یقیناً وہ اس وقت تک جتنی پینی تھی پی چکے تھے۔ مگر پھر بھی جس

طرح ان کی محفل برخواست ہوئی ایک قسم کی بدمزگی کے عنصر سے ہرگز خالی نہ تھی۔ جنرل یحییٰ نے بنگالی افسروں کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر صرف جنرل وصیع الدین کو مخاطب کر کے انگریزی میں انہیں 'گڈ نائٹ' کہا اور چل دیئے۔ وصیع الدین نے بھی کھڑے ہو کر انہیں شب بخیر کہا اور دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ جنرل یحییٰ اور ان کے ساتھی قدم جماتے ہوئے آہستہ آہستہ ہال سے باہر آ گئے۔

ان کے جاتے ہی بنگالی افسر صاحبان کی پارٹی میں گویا جان آ گئی۔ جام پر جام آنے شروع ہوئے اور کرنل عثمانی کی آپس کی بات چیت نے خطاب کی سی صورت اختیار کر لی۔ وہ بولتے تو بس بولتے ہی چلے جاتے۔ انگریزی میں بنگلہ کی ملاوٹ بھی کر دیتے۔ ان کے بعد میجر ضیاء الرحمٰن گرم گفتگو دکھائی اور سنائی دیئے۔ میجر ضیاء کے چہرے پر کرنل عثمانی کے غصے کے ساتھ ساتھ عزم بھی نظر آتا تھا۔ ان کی گفتگو بہت نپے تلے انداز میں تھی۔ کرنل حق بجز مسکرانے یا پھر بیچ میں ایک آدھ لفظ کے اضافے پر ہی اکتفا کئے بیٹھے رہے۔ جنرل وصیع الدین شروع شروع گفتگو میں خاصے محو رہے۔ پھر ان پر جیسے نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ انہوں نے کئی بار جمایاں لیں۔ پینے میں وہ کرنل عثمانی سے کم نہ تھے۔ کرنل حق نے تو شاید شربت یا سوڈا واٹر پر اکتفا کیا ہوا تھا۔ جبکہ میجر ضیاء الرحمٰن آہستہ آہستہ چسکیاں لے کر پی رہے تھے۔ وہ بولتے کم مگر سنتے زیادہ تھے۔

آگے چل کر معلوم ہوا کہ فوج میں اب بنگالیوں کی تعداد بڑھ کر کئی ہزار تک پہنچ چکی ہے اور ان میں سے اکثر اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ کرنل عثمانی صاحب یہیں فوج کے صدر دفتر میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جنرل وصیع فوج کے کسی بڑے دستے (ڈویژن) کی کمان کر رہے تھے۔ کرنل حق بھی ایک پوری بٹالین کے کمانڈر تھے اور میجر ضیاء الرحمٰن غالباً فوج کی سب سے بڑی تربیت گاہ میں متعین تھے۔

کرنل عثمانی ان سب کے گرو تھے اور جنرل وصیع سے عہدے میں کم ہونے کے باوجود سب سے زیادہ اہم شخصیت کے مالک' ان کا قیام اور ایک عرصے سے ادھر پنڈی کلب میں ہی تھا۔ انہیں بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی کے لئے غیر موزوں قرار دیا جا چکا تھا اور انہیں اپنی باقی ماندہ ملازمت

کے دو چار سال ادھر پنڈی ہی میں پورا کرتے تھے۔ چھڑے چھانٹ تھے۔ اس لئے پنڈی کلب ہی میں ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور بجز سرکاری دوروں چھٹیوں کے دوران انہیں باقاعدگی سے پنڈی کلب میں دیکھا جا سکتا تھا۔

کلب میں ان کا ایک کونہ مخصوص تھا۔ ہم نے انہیں ہمیشہ وہیں بیٹھے دیکھا۔ منہ اخبار کے پیچھے اور شراب کا گلاس سامنے میز پر اکثر تنہا۔ مگر کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ' ان کے کئی دوست مغربی پاکستان کے غیر بنگالی بھی تھے اور وہ ان کی صحبت میں بہت خوش دلی سے اور دلچسپی سے حصہ لیتے مگر صرف گاہے' گاہے بالعموم وہ اپنی ہی صحبت میں رہتے۔

کرنل عثمانی بھی بالعموم اپنی ہی ذات میں محو نظر آتے۔ وہ بڑے قاعدے' قرینے کے افسر تھے۔ کپڑے خالص فوجی انداز میں انتہائی صاف ستھرے اور بہترین تراش کے استری کئی ہوئے مجال جائے کہیں سے ذرا جھول نظر آ جائے۔ ان کی مونچھوں کی نوکیں ہمیشہ چڑھی رہتیں۔ وہ ایک خاص وقت پر کلب میں آتے۔ ان کا انداز پٹھان اور پنجابیوں سے بھی کہیں زیادہ فوجی تھا۔ وہ گردن کو ایک خاص زاویہ سے ایک طرف جھکا کر سلام کرتے اور اسی طرح سلام کا جواب دیتے۔ ہم نے تو سخت گرمی کے زمانے میں بھی انہیں سوٹ اور ٹائی میں ملبوس دیکھا۔

بہت مہمان نواز اور متواضع تھے۔ جن نوجوان اور عہدے میں کم افسران سے ان کی واقفیت تھی۔ انہیں بغیر کچھ کھلائے پلائے نہیں رہتے۔ بیوی بچے تو تھے نہیں کہ خاندان کی ذمہ داری ہوتی۔ ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ کلب ہی کی نظر ہو جاتا کہ وہیں ان کا کھانا پینا رہنا' سہنا سب کچھ وہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں عثمانی صاحب بہت ڈھنگ کے آدمی لگے۔ ان کا طریقہ بالکل ہمارے زمانے کے انگریزوں کا سا تھا کہ جو اپنی مدت ملازمت' اصل میں زندگی کے بہترین سال' اکثر پوری زندگی کلب یا فوجی میسوں میں گزار دیتے۔ جو کماتے اڑا دیتے اور واپس گھر یعنی ولایت جا کر صرف پنشن پر تکیہ کرتے۔

نواں باب

ہند و پاک جنگ

ملک بھر میں مارشل لاء کے نفاذ کے کچھ ہی عرصے بعد ملک کا دارالحکومت کراچی سے اٹھ کر پنڈی آ گیا۔ اقتدار کا پورا پورا مرکز' پورا محور اب پنڈی ہی بن گیا تھا۔ کراچی میں عوام کے ساتھ ساتھ بہر حال سول حکام اور قائدین کی بڑی اکثریت تھی اور فوجی خال' خال اور وہ بھی صرف چھاؤنی اور اپنے مخصوص ٹھکانوں پر نظر آتے تھے۔ مگر پنڈی' جو پہلے ہی ملک کی سب سے بڑی چھاؤنی اور فوج کا صدر مقام تھی۔ اب ملک کا اہم ترین حصہ بن گئی تھی اور وہاں مکمل طور پر فوج کی عملداری نظر آتی تھی۔

پنڈی ہی کے قریب بلکہ اس کی بغل میں چند چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل ایک ویرانہ سا تھا اسے پاکستان کے مستقل دارالحکومت کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا اور اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کا کام جلدی شروع کر دیا گیا۔

دریں اثناء ایک خوش آئند پیش رفت دیکھنے میں آئی۔ دریاؤں کے پانی کی منصفانہ تقسیم پر جو دونوں ممالک کے مابین جھگڑا (ملاحظہ کریں زمین کے بعد پانی کی تقسیم یعنی تقسیم در تقسیم در تقسیم) تھا۔ اس کے حتمی فیصلے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے جواہر لال دلّی سے کراچی اور پھر کراچی سے پنڈی' اسلام آباد تشریف لائے۔ جنرل ایوب صاحب نے بڑے پرتپاک انداز میں پنڈی کے چکلالہ ہوائی اڈے (لاحول ولا قوۃ ہمارے زمانے میں تو اڈا صرف ٹکے ہائی رنڈیوں یا بدمعاش جواریوں کا ہوا کرتا تھا) پر استقبال کیا۔ جواہر لال نے ایک دو روز قیام کیا بظاہر دونوں

ممالک کے تعلقات میں امید کی ایک شعاع آتی دیکھائی دیتی تھی۔مگر باہمی عدم اعتماد اور شکوک کا آتش بار سورج اپنی جگہ تھا۔اس وقت پاکستان کی فوجی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔جنرل ایوب کے فوجی عہدے میں ترقی ہوگئی تھی۔وہ اپنی جگہ حد سے زیادہ پراعتماد معلوم ہوتے تھے۔قدرتی حسن اور شکل وصورت میں وہ پہلے ہی لاکھوں میں ایک تھے۔اقتدار اور فوجی قوت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے گویا ان کی خوداعتمادی کو اور مہمیز لگائی اور بالکل فرنٹ ہوگئے۔ہم نے جب انہیں جواہرلال کے شانہ بشانہ کھڑے دیکھا تو وہ ان پر بالکل چھائے ہوئے تھے۔جواہرلال ویسے بھی پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور، عمر رسیدہ اور خاصے بیمار نظر آتے تھے۔ایوب صاحب کے آگے وہ جیسے بجھ کر رہ گئے تھے۔

اگرچہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں افواج کی ہتھیار بندی اور مشقوں کا زور تھا۔مگر چین کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ہندوستان گویا ڈھیر ہوکر رہ گیا تھا۔سنا تھا کہ جواہرلال سے باہمی اور نجی گفتگو کے دوران ایوب خان نے بھی انہیں اچھی طرح جتادیا تھا کہ اگر آئندہ کبھی جنگ چھڑی تو پاکستان کی افواج چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر دلّی میں بیٹھی ہونگی۔واللہ اعلم بالصواب!

ایک دن بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ کیوں نہ ذرا کی ذرا بری امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوجائے۔دیکھیں کیا فرماتے ہیں۔اب تو ان کا مرقد مبارک پاکستان کے دارالحکومت یعنی اسلام آباد کے عوام وخواص کا مرکز بن چکا تھا۔لہذا وہاں کا قصد کیا۔اس بار وہاں پہلے سے کہیں زیادہ رونق دیکھی۔مقبرے کی توسیع اور تعمیر کا کام شروع تھا۔قوالوں کی ٹولیاں بھی تھیں۔گلا پھاڑ پھاڑ کر اللہ جانے کس کا کلام گا رہی تھیں۔ہمارے تو خاک پلے نہیں پڑا۔

دبے قدموں حضور کے حجرے میں پہنچا۔حسب معمول مراقبے میں تھے۔میں دوزانوں ہوکر سر جھکائے بیٹھ گیا۔مکمل خاموشی تھی اس کے بعد اللہ ھو کی آواز آئی۔آواز بہت ہلکی تھی۔پھر یہی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔پھر تیسری بار اور جیسے پھر ایک تانتا سا بندھ گیا اور ایسا بندھا کہ مقبرے کے در و بام ہلتے معلوم ہوتے تھے۔پھر اچانک خاموشی اور خاموشی بھی ایسی کہ فرش پر اگر تنکا گرے تو

اس کی آواز تک سنائی دے۔ پورا مطلب تو سمجھ نہیں آیا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھ لیا کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی دھماکہ، کوئی حادثہ، ہمیں حضرت علی ہجویری نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ اول تو وہ بولتے ہی نہیں اور اگر بولتے ہیں تو صرف یہی دو لفظ یعنی اللہ ھو۔ صرف آواز اور لہجہ کا فرق ہوتا ہے۔ آواز اگر بلند ہو اور لہجہ درشت تو سمجھ لو کوئی بڑا واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے اور ان کے منہ سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اللہ ہو اسکی پیشگی آگاہی کے مترادف ہے۔ اب یہ سننے والے پہ منحصر ہے کہ وہ خود اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ وہ جزا کا مستحق ہے یا سزا کا۔

لہذا اب ہمیں خود دیکھنا، سمجھنا اور فیصلہ کرنا تھا کہ سرحد کے دونوں طرف جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کا انجام کیا ہوگا ادھر جواہر لال کی تمام تر توجہ فوج میں توسیع اور اسے جدید ہتھیاروں سے لیس کرنے پر تھی۔ ادھر پاکستان میں ایوب خان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ حد سے بڑی خود اعتمادی کی جو جھلک ہم نے پہلے جواہر لال نہرو میں دیکھی تھی اب جنرل ایوب خان میں آنے لگی تھی۔ حالانکہ مارشل لاء رسمی طور پر اٹھایا جاچکا تھا۔ مگر فوج کے ساتھ ملک کے سول اداروں پر بھی ان کا پورا غلبہ اور اختیار تھا۔ وہ جو چاہتے کر گزرتے۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کراچی سے دارالحکومت کی منتقلی کے بعد عوامی ردعمل کا وہ خطرہ بھی ٹل گیا تھا جو صرف ایک کراچی جیسے گنجان آباد شہر میں ہوسکتا تھا ایک ایسا شہر جس میں کراچی کی طرح بھانت بھانت کے لوگ آباد ہوں اور ان کی بڑی آبادی بے گھر اور بے روزگار ہو۔

بری امام کی ایک سے زیادہ اور ہر بار پہلے سے زیادہ بلند آواز میں اللہ ھو' اللہ ھو کہ صرف ایک مطلب ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ اب دونوں بدنصیب پڑوسی ایک بار پھر تباہی کے کنارے آ لگے ہیں۔ ان کی کروکھشتر اور پانی پت کی یادیں پھر تازہ ہوگئی ہیں۔ ایک طرف محمد بن قاسم اور شہید سلطان ٹیپو پانچوں ہتھیاروں سے آراستہ اپنے اسپ تازی پر سوار ہیں۔ دوسری طرف رانا سانگا اور سیوا جی تلواریں نیام سے باہر نکالے کھڑے ہیں۔ گویا پھر وہی مرزا نوشتہ کی زبان میں:

عشرتِ قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

'شمشیرابن شمشیر'ابن شمشیر'یہ کلمات تو آنجہانی نادرشاہ کے تھے جوان کے منہ سے اس وقت نکلے جب شاہ عالم ثانی کی بیٹی کے ساتھ ان کا نکاح ہورہا تھا۔ قاضی صاحب نے ان سے ان کے والد محترم کا نام پوچھا تو نادرشاہ نے برجستہ کہا:'شمشیرابن شمشیر... ' مگر یہ ہمارے ہندوستانی یعنی آج کے ہندوستانی۔ پاکستانی کب اور کہاں سے نادرشاہ کی طرح 'شمشیرابن شمشیر'بن گئے یہ تو اس تہذیب کے وارث ہیں۔جس کا ایک عالم قائل اور مداح تھا۔ایک طرف تاج محل سنگ مرمر سے بنا' تراشیدہ' ہیروں اور انمول موتیوں سے جڑا' فن تعمیر کا درخشندہ نمونہ اور دوسری طرف یہی ہمارے ہونٹوں سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی اردو زبان' یگانہ روزگار۔

ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے شاندار منادر جن کی ایک تختی پر عشق ومحبت کے ایسے ایسے نقوش کندہ ہیں جنہیں مٹائے نہیں مٹایا جاسکتا۔ مہاتما بدھ کے اقوال زرّیں سے کندہ ہوئے ایسے ایسے مینار ہیں کہ جن کی عبارت کی اصل روح کو اگر اہل ہند سمجھ لیتے تو نہ تقسیم کی نوبت آتی اور نہ اس دیوانگی کی جس کا غلبہ سرحد کی دونوں جانب روزافزوں دیکھائی دے رہا ہے اور کسی وقت بھی ایک خطرناک جنگ کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ استغفراللہ! اب ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہوتی جارہی تھی کہ:

وہ اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہائے دور و دراز

جنرل ایوب خان کے وہ جرنیل جنہیں بارہا ہم پنڈی کلب میں دیکھ چکے تھے' سنجیدہ سپہ سالاروں سے زیادہ کھلنڈرے لڑکوں اور لکھنؤ کے بانکوں کی طرح لگتے تھے۔ جواہر لال کی شکل میں اب غصے اور جھلاہٹ ایسی جھلک آگئی تھی جو عموماً ایک ایسے انسان کی صورت میں نظر آتی ہے جو ایک بار بازی ہارنے کے بعد ہر قیمت اور ہر حالت میں اسے دوبارہ جیتنے کی فکر میں ہو۔ ان کے دل پہ لگا چین کا زخم اب تک ہرا تھا اور اس کی کسک انہیں بے چین کئے ہوئے تھی۔

جنرل ایوب اور ان کے جرنیل شراب اور طاقت' دونوں کے نشے میں چور اور اس یقین سے بھرپور کہ گویا وہ چٹکی بجاتے ہندوستانی دال خوروں کی دھوتی ڈھیلی کردیں گے۔ کشمیر میں فوری

جنگ بندی نے انہیں اس فتح و کامرانی سے محروم کر دیا جو جیسے ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی ۔ غلط یا صحیح وہ اس بے انصافی کا ببانگ دھل اعلان کرتے اور ساتھ اپنے عزم کا بھی کہ جو زیادتی ان کے ساتھ کشمیر میں ہوئی ہے اس کی تلافی ہر قیمت اور ہر حالت پر کر کے چھوڑیں گے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت پاکستانی افواج کی حالت ہندوستان افواج کے مقابلے میں تعداد میں نصف سے بھی کم ہونے کے باوجود کہیں بہتر تھی ۔ نیز ان کے حوصلے بھی بہت بلند تھے ۔ ہم نے بار ہا اور انہیں تربیتی اداروں اور مشقوں کے دوران دیکھا اور ہمیں وہ ہر لحاظ سے انتہائی چاق و چوبند اور تیار نظر آئیں ۔ جنگ اور امن کے ترازو کے پلڑے جب متوازن اور برابر معلوم ہوں تو جنگ کا پلڑہ بھاری ہو کر ہی رہتا ہے ۔ تاریخ تو کم از کم یہی بتاتی ہے ۔

ہم ابھی اس شش و پنج میں تھے کہ ایک صبح جو اخباروں پر نظر پڑی تو بڑے بڑے سیاہ حاشیوں کے بیچ' بھاری بھاری سرخیوں میں جواہر لال کے انتقال کی خبر دیکھی ۔ اَنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن ۔ گویا اب تحریک آزادی کے تمام ستون اور ان پر کھڑی عمارت ہمیشہ کے لئے منہدم ہو کر رہ گئی ۔ جواہر لال اپنی فطری کمزوریوں کے باوجود ایک عظیم انسان تھے ۔ انہوں نے جتنا کام جنگ آزادی کے دوران کیا ۔ اتنا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں کیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اگر اتنے عجلت پسند اور بے صبر نہ ہوتے اور پاکستان سے انہیں وہ پرخاش نہ ہوتی وہ بُعد نہ ہوتا' جو دراصل پاکستان سے بھی زیادہ جناح صاحب کی ذات سے تھا تو وہ ہندوستان کو امن کی راہ پر ڈال کر پاکستان سمیت ایک ایسے دور کا آغاز کر سکتے تھے جو ہمارے جدامجد حضرت جلال الدین اکبر نے کیا اور جسے تاریخ میں عہد اکبری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت نورالدین جہانگیر نے بھی اپنے جلیل القدر والد کی میراث کو نبھایا ۔ مگر پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ایک طرف تو دور شاہجہانی اور حضرت اورنگزیب کی حکمرانی میں اس تہذیب و تمدن اور زبان کو چار چاند لگے جس کی بنیاد اکبر اعظم نے رکھی تھی ۔ تو دوسری مخالف قوتوں نے اتنا زور پکڑا کہ وہ اس تہذیب و تمدن کو جڑ سے تو نہیں اکھاڑ سکیں ۔ البتہ اس کے ارتقاء کو روک دیا ۔

جواہر لال نے بھی آزاد ہندوستان کو ولایت اور امریکہ کے ہم پلہ کرنے کے جوش اور کوشش میں ہندوستان کی اصل روح، اصل قوت، جس کا سوتا ہندو مسلم اتحاد سے پھوٹتا تھا مادی ترقی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انہوں نے امن کو چھوڑ کر جنگ کا راستہ اختیار کیا اور چین کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانے کے بعد تو ان پر ہر حالت میں اور ہر قیمت پر فوجی توسیع اور پیش قدمی کا جنون سوار ہوگیا۔ ہمارے نزدیک گاندھی جی اور محمد علی جناح کے بعد وہ واحد ایسی شخصیت تھے جو بٹوارے کے بعد ہندوستان کے روحانی رشتے کے محافظ ہو سکتے تھے مگر افسوس وہ ترقی کے دور میں ہندوستان جنت نشان کی ابدی روح اور اس کے تحفظ کے فریضے کو فراموش کر بیٹھے۔

جواہر لال نہرو کے بعد جو وزیر اعظم آئے وہ قد' کاٹھ میں جتنے مختصر بلکہ حقیر سے لگتے تھے عملی لحاظ سے اتنے ہی پر عزم اور باحوصلہ نکلے۔ ابھی انہیں قلمدان وزارت سنبھالے دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ ہند و پاکستان کے حالات ایک بار پھر پہلے سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے بگڑنا شروع ہوگئے۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ صوبہ سندھ کے اطراف میں جو لق و دق صحرا ہے وہاں دونوں فوجیں آمنے سامنے آ کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہیں۔ ہماری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر یہ کشمیر کی عاجلانہ اور غیر منصفانہ جنگ بندی کا بدلہ ہے تو پھر کشمیر سے ہزار کوس دور کیوں لڑی جا رہی ہے۔ بھلا کہاں کشمیر کا کوہستان اور کہاں سندھ کا ریگستان۔ پھر یہی سوچ کر بیٹھ رہے کہ جب حکومت ہماری تھی اس وقت رموز مملکت سے ہمارا کونسا واسطہ تھا جواب ہوتا۔

بڑی امام تو پہلے ہی با آواز بلند 'اللہ ھو، اللہ ھو' کی تکرار کر چکے تھے۔ جواہر لال کی وفات اور اس کے بعد طبلِ جنگ پر تھاپ گویا ان کے منہ سے نکلی اللہ ھو کی ہی تعبیر تھی۔ گھڑی بھر کو سوچا کہ شاہ صاحب کے دربار میں حاضری دیں۔ مگر اچھا نہیں لگا کہ بار بار ان کو چھیڑا جائے۔ ان کی دعائیں ہمارے ساتھ تھیں اور خود ہماری سعی اور اپنے حق میں یہ دعا ہونی چاہئے تھی کہ ان کی دعائیں مستجاب ہوں اور امن اور تہذیب کے تحفظ کا جو فرض ہمیں سونپا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنے رسول کے صدقے میں کامیاب کرے۔

ریگستان سے لڑائی کی خبریں برابر اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع ہو رہی

تھیں۔ پاکستانی افواج نے ایک سے زیادہ سرحد پار ریگستانی علاقوں سے ہندوستانی افواج کو نکال کر ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ پاکستان کی پہلی فتح تھی اور اسے 'فتح مبین' کے نام سے یاد کیا جارہا تھا۔ سندھ کا نام محمد بن قاسم کی فتح اور ہندوستان میں فروغ اسلام کے حوالے سے باب الاسلام تجویز کیا جارہا تھا۔ پورے ملک میں فتح کے ڈنکے اور شادیانے بج رہے تھے۔

کراچی اور لاہور میں جشن کا سماں تھا۔ پنڈی کلب اپنے پورے جوبن پر آئی ہوئی تھی۔ جشن منانے والوں میں اکثریت نسبتاً نوجوان افسروں کی تھی۔ جنرل یحیٰی اور حمید تو ہمیں کہیں نظر نہیں آئے۔ البتہ ایک پستہ قامت مگر بھرپور شخصیت والے خوش شکل افسر شمع محفل بنے ہوئے تھے۔ یہ صاحب بریگیڈیئر تھے اور ان کا نام گل حسن لیا جارہا تھا۔ یہ صاحب بھی بلانوش تھے۔ مگر شراب بیٹھ کر پینے کی بجائے اکثر کھڑے ہوکر پیتے۔ میں نے انہیں شاید ہی کبھی ساکت دیکھا ہو کھڑے کھڑے دائیں بائیں' آگے پیچھے ایڑی کے بل اس طرح گھومتے جیسے رقص کررہے ہوں۔

یہ صاحب فوج کے بڑے دفتر یعنی جی۔ایچ۔کیو (اب ہماری فوجی لغت میں روز اضافہ ہورہا تھا) اعلیٰ ترین سطح پر فوجی حکمت عملی کے ذمہ دار تھے اور خود ان کے افسران اعلیٰ بشمول کمانڈر انچیف کا ان پر اور ان کی حکمت عملی پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اکثر ان کے کام میں مداخلت سے گریز کرتے۔ شنید ہے کہ یہ حضرت خود بھی کسی قسم کی مداخلت کو مداخلت بے جا ہی سمجھتے تھے۔

تعجب اس پہ تھا کہ کلب میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف کو دیکھنا تو کجا ان کا نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ بہت نیک سیرت اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ جنرل ایوب کے معتمد خاص اور ہر لحاظ سے وفادار' وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذاتی شہرت اور تشہیر سے انکار دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ان کا نام جنرل محمد موسیٰ ہے۔ بلوچستان کے باشندے ہیں۔ ہر چند کہ فوج کی کمان مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھی۔ مگر وہ جہاں تک ممکن ہوتا جنرل ایوب کی ہدایت اور احکامات کی پیروی کرتے۔ بے شک 'خدا پنج انگشت را یکساں نکرد' ہم نے جنرل ایوب کو بھی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خوب خوب دیکھا تھا۔ کیا جاہ وجلال تھا ان کا۔ فوج تو خیر تھی ہی ان کے زیر کمان مگر سول میں بھی کسی کی بھلا کیا مجال جوان کے سامنے چوں بھی کرسکے۔

ریگستان کی جنگ کے دوران کرنل عثمانی اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بنگال افسروں کا حال اپنے دوسرے فوجی ساتھیوں سے بالکل جدا بلکہ خاصہ غیر تھا۔ ان کی طرف سے ریگستان کی فتوحات پر کسی قسم کی خوشی کے اظہار کا تو خیر سوال ہی پیدا کیا ہوتا تھا۔ الٹے چہرے لٹکے لٹکے دیکھائی دیتے تھے۔ کرنل عثمانی نے اسی طرح اپنے مخصوص کونے میں شراب کا گلاس سامنے رکھے اخبار کے پردے میں منہ چھپائے وقفے وقفے سے اپنے ساتھیوں کی آمد کے انتظار میں ہال کے دروازے کی طرف دیکھتے رہتے اور جب آنے والے آجاتے اور اکٹھے بیٹھ کر اپنے گلاس بھر لیتے تو پھر وہی سرگوشیاں شروع ہو جاتیں۔ ہمیں ان کی بے رخی بلکہ بیزاری پر تعجب بھی تھا اور پریشانی بھی کہ آخر یہ کیسا ملک ہے اور کیسی فوج ہے کہ جس کی کامیابی پر ملک کے ایک حصے والے خوش اور دوسرے والے عملاً لاتعلق اور بیزار۔

ابھی ریگستان کی جنگ کو چلے چند ہی روز ہوئے کہ فائر بندی کی بات شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ نافذ بھی ہو گئی:

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ٹائیں ٹائیں فش یا اتنی گرما گرمی یا پھر فائر بندی اور مسئلہ کے پرامن تصفیے کی کوشش۔ ہم نے تو زیرلب مرزا کا شعر دھرا دیا:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

اور محو تماشہ ہو گئے۔

ریگستان میں جنگ بندی کے بعد حالات سنبھلنے کی بجائے پھر بگڑنے لگے ایک طرف ریگستان سے افواج ہٹائی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف میدان اور کوہستانی سرحدوں پر فوجوں کا زبردست اجتماع ہو رہا تھا۔ ہمارے ذہن میں تو بس ایک ہی سوال رہ رہ کر ابھرتا تھا۔ کیا واقعی ان لوگوں کی عقل ماری گئی ہے؟ اماں یہ کیسی جنگ اور کیسا امن کہ جنگ امن پر غالب اور امن گویا آنے والی جنگ کی پرچھائیں۔

غضب بالائے غضب یہ کہ ادھر سرحدوں سے افواج کو واپس بلایا جا رہا تھا۔ ادھر کشمیر میں سرحدیں گرم ہوگئیں' پاکستانی مجاہدین (یہ لفظ پہلی بار ہمارے کان میں پڑا) نے کشمیر میں گھس کر ہندوستانی فوج کو ہکا بکا کر دیا۔ پھر ہندوستانی فوج سنبھلی اور مجاہدین کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ کچھ کو اپنی حراست میں لے لیا۔ مگر پاکستان کہاں چین سے بیٹھنے والا تھا۔ اس نے پلٹ کر ایک اور حملہ کر دیا اور ایک بار باقاعدہ فوج کے ساتھ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں بہت تیزی سے پیش قدمی کی۔ لیکن جیسے ہر وہ اپنی منزل مراد کے قریب پہنچے ہندوستان نے پورے مغربی پاکستان پر بھر پور حملہ کر دیا۔

ہم اس وقت شہر لاہور میں حضرت علی ہجویری کی خدمتِ عالیہ میں حاضر تھے۔ وہاں لوگوں کا ایسا شور سنائی دے رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ ہم حضرت کی خدمت میں زانوئے ادب طے کیے بیٹھے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے مراقبے میں۔ اور معرفت کی اس منزل پر تھے جہاں نہ انہیں لوگوں کے شور سے واسطہ تھا اور نہ گولیوں کی تڑتڑ کی خبر۔ درگاہ کا صحن لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ ظاہر ہے وہ سب یہاں عافیت کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔ میدان جنگ حضرت کی درگاہ سے اتنا قریب تھا کہ لوگوں کے شور کے ساتھ ساتھ ہمیں بارود کا دھواں بھی صاف اٹھتا نظر آتا تھا اور اس کی بو سے گویا ہمارا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

ہونے والی آخر ہو کر رہی۔ تقسیم کے بعد کشمیر کی جنگ اور تقسیم اور اب گویا تقسیم کے خلاف پہلی بڑی جنگ' پاکستان کا یہ عزم' اس کی یہ خواہش کہ وہ اپنی سرحدوں کو آگے بڑھا کر مستحکم کرے ہندوستان کو یہ خبط کہ وہ خط تقسیم پر پانی پھیر دے:

ایں خیال است و محال است و جنوں

پہلے تقسیم کا مطالبہ ہوا پھر دونوں بلکہ بشمول برطانیہ تینوں نے اس پر صاد کیا اب خط تقسیم کو مسخ کرنے پر تلے ہیں۔ ہم سے زیادہ ہندوستان اور اہل ہندوستان کو بھلا اور کون جانتا اور سمجھتا ہوگا۔ ہم تو خود ان میں اور وہ ہم میں سمائے ہوئے تھے۔ ایک ہی خون اور ایک ہی ہڈی بوٹی یعنی سب ہندوستانی۔ امور سلطنت میں کسی حد تک سادہ لوح ضرور تھے۔ مگر جنونی کبھی نہیں۔ خاندانوں'

برادریوں اور بھائیوں بھائیوں کے بیچ جھگڑے ضرور ہوتے مگر قومی اور اجتماعی سطح پر بہرحال سینکڑوں سال اکٹھے رہے اور سب کے سب ہندوستانی کہلائے گئے۔ کیا مسلمان کیا ہندو کیا دوسرے سب کے سب ہندوستانی اور اب نوبت بایں جا رسید کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔

جنگ چلی اور ایسی چلی کہ پورا شہر لاہور ہل کر رہ گیا۔ پاکستانی فوج کی بروقت کارروائی نے شہر لاہور کی طرف ہندوستانی فوج کی پیش قدمی کو روک دیا۔ مگر جنگ کے دائرے نے پھیل کر پورے مغربی حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اڑن کھٹولے کا ذکر تو ہم نے بارہا سنا اور پڑھا مگر اب ہوائی جہاز بھی دیکھ لئے۔ ہندوستان سے جہاز لاہور پر آتے۔ پاکستانی جہاز ان کا پیچھا کرتے' ان کو نشانہ بناتے اور وہ آگ کا بگولہ بن کر فضا ہی میں تحلیل ہو جاتے۔ آسمان اور زمین دونوں طرف بس گولہ بارود کی عملداری تھی۔

سوچا کہ دلّی چل کر دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ راستے میں بوعلی قلندر صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ انہوں نے جو کچھ بھی فرمایا۔ اس کا مطلب صرف یہ نکلا کہ ''ہونے والی آخر ہو کر رہی ابھی صرف ابتدا ہے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ دلّی جاؤ' پنڈی جاؤ اور خود جا کر حالات کا معائنہ کرو۔ نظام الدین کی خدمت میں ہمارا سلام و پیام۔''

دلّی پہنچ کر لگ بھگ وہی کچھ دیکھنے میں آیا جو لاہور میں آ رہا تھا۔ ادھر پاکستان کے ہوائی جہازوں کی یورش تھی اور ان کے مقابلے میں ہندوستانی ہوائی جہازوں اور توپوں کا جوابی حملہ اور لوگوں کی چیخ و پکار۔ البتہ گولوں کے دھماکے اور گولیوں کی تڑاتڑ کے علاوہ جنگ دلّی سے ہنوز کوسوں دُور تھی۔ فوج اور سرکار کے دفاتر میں جھانک کر دیکھا تو سب بہت بجھے بجھے دیکھائی دیئے۔ جواہر لال کا طنطنہ۔ تو بڑی حد تک چین سے جنگ کے بعد خود ان کی زندگی ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ اب جو لوگ رہ گئے تھے وہ بلاشبہ حیران و پریشان دیکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان کے نئے پردھان منتری (لیجئے لغت میں ایک اور اضافہ) لال بہادر کا نام کسی طرح بھی ان کے مختصر سے جثّے پر کھپتا نہیں تھا۔ انہیں اپنے وزراء اور مشیران خاص کے درمیان گھرے دیکھا۔ رات دن کام میں مصروف' نہ جانے بچارے کو کبھی سونے کی مہلت بھی میسر تھی کہ نہیں۔

فوج کے جی ایچ کیو میں ایک ہل چل مچی تھی۔ اس وقت فوج کے سربراہ کوئی بنگالی جرنیل تھے۔ دیکھنے میں تو خاصے سج دھج کے معلوم ہوتے تھے۔ مگر حوصلہ ان کا بھی پست ہی لگتا تھا۔ سننے میں تو یہی آیا کہ ان کی اور ان کے زیر کمان پنجابی اور سکھ جرنیلوں کی آپس میں بہت کم ہی بنتی تھی بلکہ خاصی ٹھنی ہوئی تھی۔ ہندوستانی اخبارات کو بھی ان سے شکوہ تھا کہ پاکستان کے مقابلے میں دوگنی فوج کی کمان اور اس پر اچانک حملے کے باوجود وہ پاکستان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ ان کی جنگی حکمت عملی اور پیش قدمی حملے کے فوراً بعد ہی رک گئی۔ ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے علاوہ ان کے پاس اپنی کارکردگی دیکھانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اخبارات میں ان پر ہر طرف سے خاصی لعن طعن ہو رہی تھی۔

دلّی سے نکل کر سیدھے پنڈی یعنی پنڈی کلب پہنچے۔ وہاں کا حال بھی کچھ دگرگوں ہی نظر آیا۔ کلب گھر میں بجلی کی روشنی کی بجائے موم بتیاں اور لال ٹین نظر آئیں۔ بار پر البتہ افسروں کا جمگھٹا تھا۔ نا ؤنوش حسب سابق جاری تھا۔ مگر شکلوں پر اوس سی پڑی تھی۔ گفتگو بہت دھیمے دھیمے لہجے میں تھی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو کرنل عثمانی کو اپنے خاص کونے میں دوستوں کے درمیان گھرے دیکھا۔ ان کے چہرے پر رونق تھی۔ اور ایک خاص قسم کی فتح مندی کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے آس پاس بیٹھے افسر سب کے سب بنگالی تھے۔ اور دوسروں یعنی پنجابیوں اور پٹھانون کے مقابلے میں خوش اور چونچال۔ ایک طرفہ تماشہ تھا۔ ایک ہی فوج کے افراد دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک چُپ چُپ اور دوسرا چونچال۔ اگر ایک کی کارکردگی دوسرے کے مقابلے میں نسبتاً بہتر بھی تھی تو بھی خوش اور پریشانی تو دونوں کو برابر برابر کی ہونی چاہئے تھی کیونکہ معاملہ تو پوری فوج بلکہ پورے ملک کا تھا۔ ایک دوسرے کی کامیابی پر خوش ہونا الگ اور صرف اپنی بہتر کارکردگی پر خوشی اور مسرت کا اظہار الگ۔ فوج میں اتنے آگے بڑھ کر لڑنے والے اور پیچھے کمک پہنچانے اور پانی پلانے والے اپنے اپنے فرائض کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں مگر وہ سب کے سب ایک ہی فوج کا حصہ ہوتے ہیں اور اگر اس سے کٹ کر علیحدہ ہو جائیں تو یا تو دشمن کے ہاتھ آ جاتے ہیں یا پھر میرٹھ کے بھگوڑوں کی طرح بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بات کو کریدا تو پتہ چلا کہ بنگالیوں کا ایک دستہ شہر لاہور کے دفاع کے لئے وہیں اس کے آس پاس متعین تھا۔ اس کے افسروں اور سپاہیوں نے بہت ڈٹ کر ہندوستانی حملوں کا مقابلہ کیا اور ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ مجموعی طور پر ان کی کارکردگی اور کامیابی پنجابیوں اور پٹھانوں کے کسی ایک دستے سے بہتر رہی تھی۔ غدر سے سو سال پہلے ہونے والی جنگ پلاسی کے بعد بنگالیوں کی یہ پہلی جنگ تھی اور میدان جنگ میں وہ اپنی کامیابی پر بہت نازاں تھے اور بجا طور پر' تاہم ان کی کامیابی پوری اور فوج کی کامیابی تھی۔ فوج کی تنظیم چاہے کتنے دستوں میں کیوں نہ بٹی ہو مگر وہ سب ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہوتے ہیں اور ان میں ہر ایک کی کارکردگی پر پورے جسم کی صحت اور تندرستی کا دارومدار ہوتا ہے۔ مگر ادھر کم از کم پنڈی کلب تک عجیب تماشہ تھا۔ بنگالی کرنل عثمانی کے ساتھ حسب سابق علیحدہ بیٹھے خوشی مناتے نظر آتے اور دوسرے ان سے دور منہ لٹکائے بیٹھے اپنے آپ کو شراب میں ڈبونے میں لگے تھے۔

ڈھائی تین ہفتے میں جنگ ختم ہو گئی۔ فریقین نے کیا کھویا کیا پایا اس کی تفصیل نہ تو کسی کے علم میں تھی نہ ہی اس کی ضرورت مگر نہ تو پاکستانی دلّی پہنچ سکے نہ ہندوستانی بڑھ بڑھ باتیں بنانے کے باوجود لاہور فتح کر سکے۔ زمین جہاں تھی اور جس کے پاس تھی وہیں رہی۔ البتہ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور لاکھوں' کروڑوں کا گولہ بارود اور اسلحہ کام میں آیا۔ جنگ کیا تھی بس تقسیم کے فوراً بعد جو قتل وخون ہوا' سمجھ لیں اس کی تکرار تھی۔

ادھر جنگ ختم ہوئی ادھر امن کی بات چیت شروع اور ایک بار پھر وہی باہر والے گورے بیچ کے بچولی کہ جن کا اصل مقصد معاملات کو سلجھاتے وقت بھی انہیں اس طرح الجھا کر چھوڑ دینا ہوتا ہے کہ آگے جا کر وہ ایک اور' پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جائیں۔ اگرچہ جنگ بندی کے بعد امن کی بات چیت شروع ہو چکی تھی مگر ہنوز دونوں افواج کیل کانٹے سے لیس سرحدوں کے قریب ڈٹی ہوئی تھیں۔ کیا خبر کس وقت کوئی پھلجھڑی چھوٹ جائے۔

اسی اثنا میں ایک عجیب وغریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ ایک دفعہ پنڈی سے لاہور جاتے ہوئے ایک کوہستانی علاقے سے گزر ہوا جو راستے میں پڑنے والے شہر گجرات سے بہت دور نہ تھا۔ کشمیر کا

یہ وہ علاقہ تھا جس پر افواج پاکستان کا قبضہ تھا' رات ہوچکی تھی۔ پورا علاقہ بڑی بڑی قندیلوں اور ھنڈوں سے بقعہ نور بنا نظر آیا۔ خاصہ تعجب ہوا کہ ابھی تو یہاں رن پڑا تھا اور اب یہ روشنیاں اور یہ شب برات کا سماں۔ رنگ برنگ کی قناطیں اور شامیانے لگے تھے۔ وہیں شامیانے کے ایک کونے میں کھڑے ہوکر تماشہ ہم بھی دیکھنے لگے۔ (پرانے تماش بین جو ٹھہرے) فرش پر دبیز قالین تھے۔ ان پر کرسیاں بچھی تھیں ایک طرف بار لگا تھا۔ اس کے پیچھے باوردی آبدار کھڑا تھا انواع واقسام کی شراب کی بوتلیں اور چمکتے ہوئے گلاس بار پر قرینے سے سجے تھے۔ شامیانے کی ایک طرف ایک بڑا سا تخت تھا۔ اس پر سفید براق چادر بچھی تھی۔ وہاں سازندے بیٹھے ساز ملا رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب آہستہ خرام ہاتھ میں گلاس تھامے شامیانے کے اندر داخل ہوئے۔ ارے یہ تو وہی ہمارے جرنیل یحییٰ صاحب نکلے جنہیں ہم نے بارہا پنڈی کلب میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے انہیں آج پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ جنگ کے دوران کشمیر کا علاقہ انہیں کے زیر کمان فتح ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر سرخیاں ٹوٹ رہی تھیں چہرہ فروغ مے گلستان اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ جب ہم نے انہیں پہلی بار پنڈی کلب میں دیکھا تو ان کی مونچھیں خاصی بھری بھری تھیں۔ مگر اب مونچھ کا صفایا ہوچکا تھا۔ پہلے سے زیادہ بھاری دیکھائی دیتے تھے۔ سر کے گھنے بال جو پہلے ہی شاید قبل از وقت سفید ہوچکے تھے۔ اب زیادہ سفید دیکھائی دیتے تھے۔ مگر انداز ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی پہلے والا چلبلا پن اور حد سے زیادہ خود اعتمادی۔ ان کے پیچھے ماتحت افسروں کی ایک ٹولی وہ سب آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے انتہائی منظم انداز میں شامیانے کے اندر داخل ہورہے تھے۔

جیسی ہی یہ اصحاب اپنی اپنی نشتوں پر براجماں ہوئے ویسے ہی ایک محترمہ زیورات میں لدھی اور قیمتی زرق برق کپڑوں میں ملبوس بڑے ٹھسے سے اندر داخل ہوئی۔ جرنیل یحییٰ کی طرف جھک کر بڑے انداز سے آداب بجالائیں۔ اگلی نشتوں پر بیٹھے سب افسران بشمول جنرل یحییٰ' ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ جنرل صاحب نے آگے بڑھ کر انہیں 'ہیلو' کہا اور ہاتھ ملایا۔ پھر ایک نوجوان افسران کے قریب آیا اور بڑے ادب سے شہ نشیں کی طرف اشارہ کر کے

انہیں ادھر چلنے کے لئے کہا محترمہ نے پلٹ کر جنرل یحیٰی سے اجازت مانگی اور بڑے انداز سے گویا بتاشوں پر چلتی ہوئی روشن چوکی کی طرف بڑھ گئیں۔

محترمہ اچھی خاصی پکی عمر کی تھیں۔تیس چالیس سے تو کیا کم ہوں گی۔ ہمارے وقتوں میں کہ اس عمر کی ڈیرے دارنیاں گانا بجانا چھوڑ کر لٹھے اور ململ کا سادہ لباس پہن کر اللہ اللہ کرنے میں لگ جاتی تھیں۔مگر اب زمانے والے اور زمانہ کا چلن کچھ اور ہے محترمہ جب شہ نشین پر پہنچیں تو سازندوں نے ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا۔تخت کے بیچ و بیچ تین بڑے بڑے گاؤ تکیوں کی تکون سی بنی تھی۔محترمہ اس کے درمیان بیٹھ گئیں۔سازندوں میں سرنگی والے' ستار والے' ہارمونیم اور طبلے والے سبھی موجود تھے۔محترمہ نے ان کی طرف دیکھا پھر آواز کو ساز سے ملانے کے لئے کچھ گنگنائیں' گلا صاف کیا۔ جنرل یحیٰی کی طرف دیکھ کر آداب کیا اور اجازت چاہی۔ جنرل صاحب نے زیرلب مسکرا کے کہا 'جی بسم اللہ' محترمہ نے گلا صاف کیا' لے بڑھائی اور پھر شاید راگ دیس یا کھماج میں کوئی گیت شروع کیا۔گیت میں فوجی جوانوں کو مخاطب کیا گیا تھا اور دوران جنگ ان کی بہادری اور ان کے کارناموں کی تعریف کی گئی تھی۔ادھر محترمہ گیت پر گیت اور غزل پر غزل گا رہی تھیں۔ادھر جنرل صاحب اور ان کے افسر جام پر جام لنڈھاتے۔ ہر گیت کے اختتام پر بچوں کی طرح تالیاں بجاتے۔

جہاں تک محترمہ کا تعلق تھا تو اس میں کلام نہیں کہ بہت اچھا گاتی تھیں مگر ان کے فن سے بھی سوا ان کا انداز تھا۔نخرہ تھا' ادائیں تھیں:

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

ان کی نگاہیں گھوم پھر کر جنرل یحیٰی پر آ کے ٹک جاتیں۔ جرنیل صاحب اپنی نگاہیں انہیں پر جمائے رہتے اور پھر گویا آنکھیں زبان بن جاتیں اور آنکھوں آنکھوں میں عشق اور سرمستی کی تمام ابتدائی منزلیں طے ہو جاتیں۔ جرنیل صاحب کو دیکھ دیکھ کر ہمیں بے اختیار والئی اودھ نواب واجد علی شاہ یاد آ گئے۔تن و توش اور دادِ فن میں یحیٰی خان ہمیں نواب واجد علی شاہ کے گویا ہمزاد نظر

آئے۔فرق صرف اتنا تھا کہ جنرل صاحب نے عطر کی خوشبو کے ساتھ ساتھ بارود کی بو بھی سونگھی تھی۔جبکہ واجد علی شاہ تو غسل بھی عرق گلاب سے کرتے تھے اور رفع حاجت بھی ناک بند کر کے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ادھر رنگ و آہنگ کی محفل گرم تھی' شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ ادھر وقفے وقفے سے توپ کے گولوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہر چند کہ جنگ بندی ہو چکی تھی مگر فوجیں ابھی تک آمنے سامنے بیٹھی تھیں اور فوج کے جوان کبھی ویرانے کی خاموشی سے گھبرا کر اور کبھی محض تفریحاً توپیں چلا کر گویا ایک دوسرے کو سلامی دے رہے تھے۔ رات گئے کھانے کا اعلان ہوا۔ جرنیل صاحب جھومتے جھامتے خود شہ نشین کی طرف بڑھے۔محترمہ نے کھڑے ہو کر انہیں جھک کر آداب کیا۔جنرل صاحب نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنا ہاتھ جو محترمہ نے پہلے بڑھا رکھا تھا اپنے ہاتھ میں تھام کر انہیں نیچے اتارا اور پھر کاندھے سے کاندھا ملا کر کھانے کی میز کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

تقریب میں باقی جو افسر اور مہمان تھے۔سب کے سب جھوم رہے تھے۔کھانے کی میز پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔مگر کھانے کا کسے ہوش تھا۔خود جرنیل صاحب محترمہ کے گلے کا ہار بنے۔زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے ہم نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو ہمیں خواہ مخواہ مرزا نوشہ کا وہ مطلع یاد آ گیا:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے گُل
زنہار گر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

کھانے کے بعد پھر چائے اور مشروبات کا دور چلا اس کے بعد گویا محفل برخواست ہوئی اور یہ سب جھومتے جھامتے اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے جو کچھ بھی دیکھا بیک وقت اچھا بھی لگا اور اس پر خاصہ تعجب بھی ہوا۔قیام لاہور کے دوران ایک صاحب کا کلام سننے میں آیا۔ان صاحب کا اسم گرامی ڈاکٹر محمد اقبال تھا۔ویسے تو وہ پورے ہندوستان یعنی ہندو پاکستان کے مانے ہوئے شاعر تھے اور ان کا کلام سرحد کے دونوں جانب مقبول تھا۔مگر پاکستان میں ان کا نام معمار پاکستان محمد علی جناح صاحب کے نام سے جڑا تھا اور انہیں مصور پاکستان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

جنگ کے بعد ابھی ابھی ہم نے فوجی محاذ پر محفل رقص و سرود کا جو نظارہ دیکھا تھا اس کے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب یعنی مصور پاکستان کا یہ شعر یاد آ گیا:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یعنی پہلے جنگ پھر ترنگ۔ سوال یہ ہے کہ اگر طاؤس و رباب ہی تقدیر امم کا انجام اور آخری مرحلہ ہے تو کیا اس کا حصول شمشیر سناں کے بغیر نہیں ہو سکتا؟ پھر ہم خود ہی سوچ میں پڑ گئے کہ آخر یہ خیال ہمارے ذہن میں آیا ہی کیوں اور کیسے۔ اپنے راج میں تو ہماری کل سوچ صرف شطرنج کی اگلی چال اور آنے والے دن کی سیر و تفریح ہی تک محدود تھی اور اب یہ اندیشہائے دور دراز اور وہ بھی اس سیاسی فکر اور مصلحت بینی سے ملوث جس نے پورے ہندو پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ فارسی کے کسی استاد کا یہ شعر کبھی اگلے وقتوں میں سنا تھا:

سگانِ بیشہِ ماژندراں را
نگیرد جُز سگِ ماژندرانی

یعنی ماژندران کے جنگل کے کتے کو صرف ماژندرانی کتا ہی پکڑ سکتا ہے۔

شعر کیا ہے شاعرانہ نثر ہے۔ مگر ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اگر اس کا اطلاق ہندوستان پر کیا جائے تو اس کا مطلب کچھ اس طرح نکلے گا کہ ہندوستان کے جنگل میں رہ کر صرف ہندوستانی' ہندوستان کو پکڑ سکتا ہے اور شعر کی صورت کچھ اس طرح ہو جائے گی۔

احمقاں کشور ہندوستان را
نگیرد جز احمق ہندوستانی

شعر وزن سے ضرور گرتا ہے مگر مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

ہندوستان سے ہماری مراد ہرگز اس ہندوستان سے نہیں جس پر ہمارے اجداد نے حکومت کی کہ ہزار خرابیوں اور خامیوں کے باوجود وہ ایک ہندوستان تھا اور ہندو مسلم امتیازات کے باوجود کسی نے بھی کبھی تقسیم اور بٹوارے کی بات نہیں کی۔ محلے' علاقے' شہر اور صوبے علیحدہ علیحدہ تھے

آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ مگر ملک بہر حال ایک رہا ہے اور ہندو مسلمان گویا ایک جان دو قالب۔

مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت کو یہ شکوہ تھا کہ پوری جنگ کے دوران فوج کی اعلیٰ کمان نے مشرقی پاکستان کو بس اللہ کے حوالے کر کے چھوڑ دیا تھا۔ مغرب اور مشرق کے درمیان ہوائی راستہ بند ہونے کے بعد دونوں بازو ایک دوسرے سے قطعی طور پر کٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں اگر ہندوستان مشرقی پاکستان پر ہلّہ بول دیتا تو کیا ہوتا۔ مغربی پاکستان کو تو خود اپنی پڑی تھی۔ بہادری اور سپہ گری کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود وہ دلّی تو بڑی بات ہے لاہور کے برابر والے شہر امرتسر تک نہ جا سکے۔ اگر فوج کا کام صرف مغربی پاکستان کی حفاظت کرنا ہے تو پھر ایسی فوج سے ان کا کیا واسطہ۔ آخر ان کی اپنی فوج کیوں نہ ہو اور اپنی فوج پر اپنا اختیار۔

جنگ بندی کے کئی ماہ بعد ایک عرصے تک فوجیں اپنے اپنے حربی ٹھکانے کو سنبھالے دونوں طرف ڈٹی رہیں۔ پھر امن کی بات چیت شروع ہو کر آگے بڑھی۔ اس دفعہ ملک روس سامنے آیا۔ وہاں کے وزیر اعظم نے جنرل ایوب صاحب اور ہندوستان بلکہ بھارت کے پردھان منتری لال بہادر شاستری صاحب کو تاشقند آنے کی دعوت دی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سے صدیوں پہلے ہمارے جد امجد حضرت ظہیر الدین بابر (نور اللہ مرقدہٗ) گھوڑوں پر سوار نکلے اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی داغ و بیل ڈالی۔ اب یہ علاقے روس کے پاس تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کے قائدین کے مابین تفصیلی گفت و شنید کے بعد امن کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر فساد کی جڑ یعنی مسئلہ کشمیر اپنی جگہ پر رہا۔ جنگ کے دوران جن علاقوں پر افواج کے قبضہ میں کیا تھا وہ ایک دوسرے کو واپس کر دیئے گئے۔ اسی طرح جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی ہو گیا۔ دلوں کی بھڑاس نکالنی تھی۔ سو نکال لی۔ پرنالہ پھر بھی وہیں گرتا رہا۔

جنگ کے بعد ہندوستان میں جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مگر پاکستان کے داخلی امن اور قومی یکجہتی کے در و بام ہمیں ہلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ بنگالی اب کھل کر غیر بنگالیوں یعنی مغربی پاکستان والوں کے سامنے آ کر ڈٹ گئے۔ ان پر بزدلی اور فن جنگ سے ناآشنائی کا جو داغ لگا تھا۔ وہ جنگ نے

دھوڈالا۔ اب وہ نہ صرف مرکز کی سول قیادت کو للکار رہے تھے۔ بلکہ فوج کی اعلیٰ کمان کو بھی طعنہ دیتے کہ دیکھ لو وقت پڑے پر کون کام آیا۔ تمہارے بہادر اور فن حرب کے ماہر پنجابی اور پٹھان' یا گورے کالے' پیلے اور پستہ قد بنگالی۔

معاہدہ امن کے فوراً بعد پاکستان میں گویا' شمشیر وسناں کے بعد' طاؤس ورباب آخر' کا دور شروع ہوا۔ جنرل یحییٰ صاحب کی کمان کا حال تو ہم بتا چکے ہیں۔ اب ہر جگہ ایک جشن سا برپا تھا۔ کشمیر سے لے کر کراچی تک پورا ملک تماشہ گاہ سا بن گیا تھا۔ جیسے دیکھو فتح ونصرت کے شادیانے بجا رہا ہے۔ جن جن اہم سرحدی علاقوں میں ابھی تک افواج پڑی تھیں وہاں لوگ' مرد وزن کھانے کی دیگیں لے کر فوجیوں کی تواضع کے لئے جوق در جوق جاتے' گلے مل مل کر انہیں ان کی فتوحات پر مبارک باد دیتے۔ اخبارات اور جرائد جرأت اور بہادری کی داستانوں سے بھرے ہوتے۔ آخر پاکستان کی مٹھی بھر فوج نے ہندوستان کی ظفر فوج موج کے چھکے چھڑا کر رکھ دیئے تھے۔ شہر لاہور جو ہر لحاظ سے پاکستان کا دل تھا بفضل تعالیٰ پاکستان کے پاس تھا۔ ہر چند کہ دشمن نے اس پر بھرپور حملہ کیا بلکہ شب خون مارا مگر اس کی ایک نہ چلی اور پورا شہر بغیر کسی قابل ذکر جانی یا مالی نقصان کے اپنی جگہ موجود اور دشمن منہ کی کھانے کے بعد اس سے کوسوں دور!

جشن اور باہمی مبارک باد کا یہ سلسلہ صرف چند ماہ چلا ہوگا کہ پاکستان کی فوجی کمان میں تبدیلی ہوگئی۔ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ جو غالباً اپنی ملازمت کی مدت پوری کر چکے تھے۔ فارغ کردیئے گئے ان کی جگہ جنرل یحییٰ صاحب کے تقرر کا اعلان ہوا ان سے ہماری شناسائی یک طرفہ سہی مگر بہر حال تھی وہ ہر لحاظ سے بہت دلیر اور ذہین معلوم ہوتے تھے۔ البتہ ان کا لاابالی پن' ان کی عجلت پسندی اور شراب نوشی ضرور کھٹکتی تھی۔ ہمارے خیال میں وہ ان لوگوں میں سے تھے کہ اگر قسمت ان کی یاوری کرے تو کامیابی ان کے قدم چومے اور اگر بدبختی ان کا مقدر ہو تو پھر ذہانت اور تجربے کے باوجود ان کا لاابالی پن اور شراب نوشی ان کے اور زیر کمان فوج کے لئے کسی بڑی آفت کا پیش خیمہ بن جائے۔ ان کے پیش رو جنرل موسیٰ جتنے منکسر المزاج اور آہستہ آہستہ خرام تھے۔ اتنے ہی یہ مستعجل اور تیز رو تھے۔ ان میں خطرات کا سامنا کرنے کا ولولہ بھی تھا اور

حوصلہ بھی۔ مگر وہ سمندر کا مدوجزر دیکھے بغیر ہر چہ باداباد کہہ کر کشتی پانی میں اتار دینے والوں میں سے تھے۔ ان کی کم وبیش وہی ذہنیت تھی کہ:

احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پر چھوڑدو لنگر کو توڑدو

پاکستان فوج کو جنرل یحییٰ کے حوالے کر کے لاہور کا رخ کیا۔ جنگ کے فوراً بعد وہاں جو جشن کا سماں بندھا تھا اب وہ بدل کر رہ گیا تھا۔ وہاں کا ماحول، وہاں کے لوگوں کا مزاج اور اخبارات کا لہجہ بدلا بدلا سا معلوم ہوتا تھا اور یہ سوال بار بار اٹھایا جا رہا تھا کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے علاوہ کفر و اسلام اس جنگ عظیم سے انجام کار ملا تو کیا ملا۔ دلّی تو کجا امرتسر تک لاہور سے ہنوز اتنی دور تھا جتنا لاہور امرتسر سے۔ کشمیر کا مسئلہ جہاں تھا وہاں رہا بلکہ اس غیر فیصلہ کن جنگ کے بعد اور الجھ کر رہ گیا۔

عام تنقید کا سب سے بڑا ہدف خود جنرل ایوب صاحب کی ذات والا صفات تھی۔ انہیں تو اپنی ہمت اور بہتر فوجی حکمت عملی پر اتنا ناز تھا۔ مگر انجام کار انہوں نے کر کے کیا دیکھایا۔ جنرل ایوب حکومت اور فوج دونوں ہی پر حاوی تھے۔ انہوں نے قوم کو پورا یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی ملی جلی سیاسی اور حربی منصوبہ بندی سے ہندوستان کے چھکے چھڑا دیں گے۔ مگر مہینہ تیس روز کی پنجہ آزمائی کا نتیجہ نہ صرف توقعات سے بہت کم نکلا بلکہ جہاں تک مغربی اور مشرقی پاکستان کی یکجہتی کا تعلق تھا سو اس کی تو گویا بنیاد ہی ہل کر رہ گئی تھی۔ ان کے زمین اور آسمان تو پہلے ہی جدا تھے۔ اب دل و دماغ بھی بٹ کر رہ گئے۔

دسواں باب

پاکستان میں فوجی انقلاب:

’’میں اور اندیشہائے دور و دراز‘‘

جنرل یحییٰ صاحب نے فوجی کمان سنبھالتے ہی گویا فیلڈ مارشل ایوب کا پتا کاٹ دیا۔ نام کو فیلڈ مارشل صاحب اب بھی ملک کے صدر اور افواج کے اعلیٰ ترین کمانڈر تھے۔ مگر فوج کی باگ ڈور مکمل طور پر جنرل یحییٰ کے ہاتھ میں تھی۔ فوجی امور میں وہ بالکل مختار کُل تھے اور کسی قسم کی مداخلت کے قائل نہ تھے۔ ویسے بھی فیلڈ مارشل صاحب کی فوجی حکمت عملی اور پیشہ ورانہ امور میں جنگ سے پہلے جو دھاک تھی وہ نہ صرف ختم بلکہ مذاق سا بن کر رہ گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے مغربی پاکستان سے ہندوستان کی طرف جس برق رفتار پیش قدمی کا فوجی منصوبہ انہوں نے بنایا تھا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

مشرقی پاکستان کے بنگالی بالخصوص فوجی فیلڈ مارشل صاحب کی غیر موثر کارکردگی پر منہ چھپا چھپا کر ہنستے بھی تھے اور کھلی خفگی کا اظہار بھی کرتے۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہمیں کرنل عثمانی صاحب کے اس رویہ اور ان حرکات سے ہوا جو جنگ بندی کے فوراً بعد دیکھنے میں آئیں۔ پہلے تو وہیں پنڈی کلب میں وہ اور ان کے ساتھی بے حد شاداں و فرحاں نظر آئے۔ بنگالیوں کے صرف ایک لڑاکا دستے (پلٹن) نے پنجابی اور پٹھانوں کی بے شمار پلٹنوں کے مقابلے میں کہیں بہتر اور جرأت و بہادری کے کارنامے دیکھائے۔

دوسری بار ہم نے کرنل عثمانی کو لاہور کے قریب اس جگہ پر دیکھا۔ جہاں بنگالیوں کی پلٹن پڑی تھی اور جہاں سے انہوں نے دشمن کے پے در پے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ میدان کیا تھا ایک جنگل تھا۔ قد آدم گھاس اور جھاڑیوں سے پٹا پڑا۔ درخت تھے' نہریں تھیں۔ زمانہ امن میں یقیناً اچھی خاصی تفریح گاہ رہا ہوگا۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے کرنل عثمانی بنفس نفیس وہاں موجود تھے اور ایک نوجوان افسر سے با آواز بلند گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی فوجی اردو' انگریزی اور بنگالی کا ایک عجیب ملغوبہ ساتھی جو بس تھوڑی بہت ہمارے پلے پڑی۔

جس نوجوان فوجی افسر سے وہ ہم کلام تھے۔ یہ وہی کرنل حق تھے۔ جنہیں ہم نے پہلی بار پنڈی کلب میں کرنل عثمانی کے ساتھ دیکھا تھا۔ کرنل عثمانی اس وقت خاصے بپھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور با آواز بلند کرنل حق کو کچھ سمجھانے سے زیادہ ڈانٹ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کرنل حق بنگالیوں کی اس بٹالین کے کمانڈر تھے جن کی جنگی کارکردگی کی اتنی دھوم مچی تھی۔ کرنل عثمانی صاحب کو کرنل حق سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے افسروں اور جوانوں کی اعلیٰ کارکردگی سے کہیں کم جی ایچ کیو سے ان کے لئے جنگی اسناد اور تمغات کی سفارش کی۔ اس کے برعکس پنجابی اور پٹھان اپنی نسبتاً کمتر کارروائی کے باوجود سب کچھ لے اڑے۔ ان کا اصرار تھا کہ کرنل حق جرأت اور بہادری کے تمغات کے انعام کے بارے میں مزید سفارشات پیش کریں مگر واہ رے کرنل حق' عمر عہدے اور مدت ملازمت میں ان سے کہیں کم ہونے کے باوجود ان سے قطعی متفق نہیں ہوئے۔

ان کا موقف اور اصرار یہ تھا کہ بحیثیت بٹالین کمانڈر کے وہ اور صرف وہ اپنی زیر کمان افسروں کی کارکردگی کے واحد شاہد تھے لہٰذا صرف انہیں یہ اختیار پہنچتا تھا کہ از روئے انصاف وہ صرف ان افسروں اور جوانوں کے حق میں سفارش کریں جنہیں صحیح معنوں میں وہ اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس میں بنگالی' پنجابی' پٹھان کا بھلا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ پاکستان فوج بحیثیت ایک قومی ادارے کے ہر قسم کے صوبائی تعصّبات اور امتیازات سے بالاتر تھی۔

ایک موقع پر کرنل عثمانی کرنل حق سے اتنے برہم دکھائی دیئے کہ جیسے اب ان کا ہاتھ اٹھنے ہی والا ہے۔ مگر پھر وہ گویا خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے کہ میدان جنگ میں صرف اور صرف مقامی

کمانڈر ہی کا حکم اور سفارش چلتی ہے۔ اس کا افسر اعلیٰ اس کی کسی حرکت یا غیر تسلی بخش کارکردگی کی بناء پر وہاں سے ہٹا تو سکتا تھا مگر صرف اس کی بات پوری طرح سننے اور سمجھنے اور ان نتائج کا اچھی طرح اندازہ کرنے کے بعد۔ انجام کار ہم نے دیکھا کہ کرنل عثمانی نے خاصہ منہ لٹکائے لٹکائے کرنل حق کے علاقے سے واپسی کا رخ کیا۔ کرنل حق نے عین فوجی ضابطے اور آداب کے مطابق کرنل عثمانی سے زوردار مصافحہ کیا۔ پھر انہیں ان کی جیپ تک چھوڑنے گئے۔ انہیں وہاں بٹھایا پھر کھٹ سے ایڑیاں ملا کر سلوٹ کیا۔ خدا حافظ کہا اور رخصت کر دیا۔ کرنل حق کی ایک اعلیٰ افسر اور وہ بھی اپنی ہی طرح کے بنگالی کے سامنے اتنی جرأت مندی کے مظاہرے سے متاثر ہونا لازمی تھا اور منہ سے بے اختیار ان کے لیئے آفریں نکلا۔

ہندوستان کے مقابلے میں اگر پاکستان نے جنگ واقعی جیتی نہیں تو ہاری بھی نہیں بلکہ اگر اعداد وشمار اور اچانک بھرپور حملے بلکہ شبخون کے اس عنصر کو سامنے رکھا جائے' جو ہر لحاظ سے ہندوستانی فوج کے حق میں تھا' تو پلے میں حاصل کی تھی وہ مشرق اور مغرب کے مابین خطرناک حد تک کشیدگی کی نظر ہوگئی۔ فوج میں کرنل عثمانی اور نوجوان بنگالی افسروں کی بڑی اکثریت پنجابیوں اور پٹھانوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھنے لگی اعلیٰ سطح پر بھی جنرل وصیع الدین کی ہمدردیاں بنگالی افسروں اور جوانون کے ساتھ تھیں۔ تاہم عہدے کی ذمہ داری اور بھرم کے لحاظ سے وہ بہت لئے' دیئے رہتے۔ یقیناً کرنل حق جیسے اور بھی محب وطن بنگالی فوج کے مختلف عہدوں پر فائز ہوں گے۔ البتہ ہم اس کے بارے میں یقین سے کیا کہہ سکتے ہیں۔

جنگ کے دوران بنگالی افسروں اور جوانوں کی کارکردگی کے اعتراف اور اعزازات کی تقسیم کے معاملے میں جی ایچ کیو کی طرف سے کوتاہی کے علاوہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی بڑھتی ہوئی کشیدگی میں سیاسی عناصر اور قوتوں کا بھی پورا دخل تھا۔ مشرقی پاکستان کے سیاست دان تو بالکل بپھرے ہوئے تھے اور صوبائی امور میں مکمل خودمختاری سے کم ہرگز کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ اب پاکستان میں ویسی حالت تھی جسے ہم طوائف الملوکی کہتے تھے اور جس سے ہمارے پرکھوں کا واسطہ حضرت محی الدین اورنگزیب کی وفات کے بعد پڑا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین

کشیدگی نے اب بُعد المشرقین کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جنگ میں ناقص کارکردگی' اس پر روزافزوں تنقید اور مشرقی پاکستان کی طرف سے احتجاج کے بعد فیلڈ مارشل صاحب بظاہر بجھے بجھے سے معلوم ہوتے تھے۔فوج پر بھی ان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔'ہندو' ہندوستان سے معاہدہ امن کے بعد ان کی حالت اور غیر ہوگئی تھی۔تاہم وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت ہی ایسی بنائی تھی کہ وہ گری سے گری حالت میں بھی کھڑے ہی معلوم ہوتے۔ البتہ ان کا سرخ و سپید چہرہ جس کا رنگ اب پھیکا ہوتا جا رہا تھا ان کی اندرونی کیفیت' خلفشار اور خدشات کا آئینہ بنتا جا رہا تھا اور چھپائے نہ چھپتا۔

سیاسی مسائل اپنی جگہ تھے کہ ان سے تو کسی نہ کسی طرح نمٹا ہی جا سکتا تھا۔بات چیت سے نہیں تو فوجی کاروائی سے مگر جب فوج ہی بس سے باہر ہو جائے تو پھر اندیشہائے دور دراز تو لازمی ٹھہرے ہر چند کہ ایوب خاں صاحب کے ساتھ جنرل یحییٰ کی وفاداری میں بظاہر کسی قسم کے شک کی بھی گنجائش نہ تھی۔مگر بھائی اقتدار کی ہوس اور جنگ تو بھائی بھائی کو الگ کر دیتی ہے۔باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے مقابل بھی لا کھڑا کرتی ہے۔ہابیل قابیل کا جھگڑا تو خیر قرون اولیٰ کی بات ہے۔خود ہمارے جدامجد اور فاتح ہند حضرت اورنگزیب نے اپنے والد ماجد حضرت شہاب الدین شاہجہاں اپنے برادر بزرگ حضرت داراشکوہ اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ کیا کیا۔خود فیلڈ مارشل صاحب نے اپنے زندگی بھر کے دوست اور مربی اسکندر مرزا (یہ نام بہت دیر بعد ہماری لغت میں آیا) کے ساتھ کیا کیا۔

فیلڈ مارشل ان کے وزراء اور ڈھنڈورچیوں کے چکنے چپڑے بیانات کے باوجود بنگالی اپنی جگہ بپھرے ہوئے تھے۔ان میں سے کم از کم دو اصحاب کا نام بار بار مغربی پاکستان کے اخبارات کی زینت بنتا تھا۔ایک کوئی شیخ مجیب الرحمٰن اور دوسرے مولانا عبدالحمید بھاشانی' تصویر میں شیخ مجیب اچھے بھلے نظر آتے تھے۔گھنی مونچھیں' آنکھوں پر عینک اچھی مردانہ صورت تھی۔مولانا بھاشانی البتہ تصویر میں بھی خاصے خوفناک نظر آئے۔ان کی سفید داڑھی کا ایک ایک بال گویا طیش میں کھڑا ہوتا معلوم ہوتا۔تصویر میں بھی ان کا منہ کچھ اس طرح کھلا ہوتا جیسے اس سے انگارے برس

رہے ہوں۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات مشرقی پاکستان کی خودمختاری بلکہ آزادی کے دعویدار تھے۔ مگر آپس میں ایک دوسرے کے نہ صرف حریف بلکہ رقیب اور دشمن، دونوں مشرقی پاکستان کو صرف اپنے اقتدار کی جولانگاہ بنانے پر تلے تھے۔ مجیب اور بھاشانی صاحبان کچھ اس طرح ٹھنی تھی جیسے ملک کے دو بازوؤں میں۔

مشرقی پاکستان والوں کا گلہ یہ تھا کہ اگر مغربی پاکستان کی فوج حالت جنگ میں انکے دفاع کا معقول بندوبست نہیں کرسکتی تو پھر انہیں اسکی کیا ضرورت ہے۔ وہ آخر اسے کیوں برداشت کریں اور کس لئے اور اس پر اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا ایک پیسہ بھی خرچ کریں۔ انہیں اپنے دفاع کے لئے اپنی فوج چاہئے تھی اور مغربی پاکستان میں فوج اپنے مشن میں ناکامیاب ہوچکی تھی۔

سوال یہ بھی اٹھایا جارہا تھا کہ آخر یہ جنگ سرے سے لڑی ہی کیوں گئی۔ اس کا کیا جواز تھا۔ خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھائے اپنے سر مصیبت کیوں مول لی۔ معلوم ہوا کہ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے ملک میں صدارتی انتخابات ہوئے تھے۔ ایوب خاں کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے بل بوتے پر انتخابات میں ان کی یقینی کامیابی کے امکان کے باوجود مخالف جماعتوں نے گٹھ جوڑ کر کے ان سے مقابلے کی ٹھان لی۔ اور محمد علی جناح مرحوم و مغفور کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں اپنا متفقہ امیدوار بنا کر کھڑا کیا۔

محمد علی جناح کی وفات کے دن ہمیں پہلی بار محترمہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چاندی جیسے چمکتے سفید بال، آنکھوں میں بلا کی چمک ایسی کہ جیسے سچ مچ بجلی کوندرہی ہو۔ دراز قامت دیکھنے میں ضعیف و نزار مگر چہرہ اتنا پرعزم کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں مرعوب ہوجائیں کیا مجال جو کوئی ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھ سکے۔

انتخابات میں توقعات یا خدشات کے مطابق ایوب خان صدر منتخب ہوگئے تھے۔ مگر عوام کی متوقع حمایت سے کہیں کم پر۔ انہیں پورا اعتماد تھا کہ پورا ملک ان کی پشت پر کھڑا ہے اور محترمہ ان کے مقابلے میں بری طرح ہاریں گی۔ مگر نتیجہ توقع سے بہت کم نکلا تھا۔

شاید اس داغ کو مٹانے کے لئے انہوں نے جنگ کا قضیہ کھڑا کردیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے

بعد جنگ کا بھی کم وبیش وہی نتیجہ نکلا جو اس سے پہلے ہونے والے انتخابات کا۔ یعنی ان کی توقعات اور امیدوں سے بہت کم۔ انتخابات اور جنگ دونوں میں توقعات سے بہت کم کامیابی کے نتیجے میں ایوب خان خاصے بوکھلا اٹھے۔ اب انہوں نے خود اپنی اور اپنی حکومت کی شان میں قصدے کا سہارا لیا اور اس کی کامیابی کے لئے قصیدہ نویسوں کی ایک اچھی خاصی فوج اکٹھا کر لی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب امور مملکت اس نہج پر پہنچ جائیں تو سمجھ لیں کہ کار مملکت تمام ہوا۔ قصیدہ گو تباہی کے قاصد بن جاتے ہیں۔ اپنی جگہ ہم نامراد سہی مگر اتنے نالائق اور نابلد بھی نہیں کہ تاریخ کے اس اہم باب سے بھی ناواقف ہوں۔

جنگ کے بعد پاکستان میں حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ ان کا ساتھ دینا دشوار بھی ہوا اور ہمارے لئے بڑی حد تک بالکل بے معنی بھی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ حالات پاکستان اور ہندوستان دونوں کو کشاں کشاں اس منزل کی طرف دھکیل رہے تھے جس کی نشاندہی اولیاء اللہ اور بزرگان دین پہلے ہی کر چکے تھے۔ یعنی تقسیم در تقسیم اور پے در پے جنگ۔ ادھر ایوب خان کے قصیدہ نویسوں نے ان کی شان میں اخبارات کے صفحات پر صفحات کالے کئے ادھر خود ان کی سرکار میں پھوٹ پڑی۔ وہ کچھ چاہتے اور کہتے اور ان کے وزراء کچھ اور چاہتے اور کہتے۔ بس وہی مثل تھی کہ من چہ می سرائم وطنبورہ من چہ می سرایدٔ

بھانت بھانت کی بولیاں' بھانت بھانت کے مطالبات۔ مشرق کا ہاتھ مغرب کے گلے پر اور مغرب کا مشرق کی گردن پر۔ مشرق خودمختاری کی آڑ میں آزادی کا طالب اور مغرب اس کے ہر مطالبۓ ہر بیان کو غداری قرار دیتا۔ باہمی مصالحت اور سمجھوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ نہ یہ اپنی وضع بدلنے کو تیار کہ وہ اپنی خو بدلنے پر راضی۔ ہنگامی سیاست کی وہ بنیادٔ جسے اسلامی اخوت اور یکجہتی کا نام دیا گیا اور جس کے سہارے پاکستان کی جنگ لڑی گئی بیٹھی جارہی تھی۔ سیاسی میدان توپ وتفنگ کے بغیر ہی میدان کارزار بنتا جارہا تھا۔

رہ گئے بچارے فیلڈ مارشل تو انہوں نے توپ وتفنگ کو اصلی جنگ میں بھی کون سا تیر مار لیا تھا جو سیاسی جنگ میں کچھ کر کے دکھاتے وہ بچارے تو بس گھر کر رہ گئے تھے۔ ان کی حالت کم وبیش

ویسی ہی ہو کر رہ گئی تھی جیسے خود ہماری غدر کے وقت تھی ۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارا سامنا غیروں سے تھا اور یہ اپنوں کے نرغے میں تھے۔فوج کا سایہ بھی ان سے جدا ہوتا معلوم ہوتا تھا اس سے پہلے کہ مشرقی پاکستان اپنی خودمختاری کا اعلان کرے فوج نے بغیر کسی اعلان کے اپنی خودمختاری کا سکہ بٹھا دیا۔ جنرل یحییٰ خاں اب فوج کے مختارِکُل تھے۔ بظاہر ان کا اہم ترین ہدف اور ارادہ ہندوستان سے تیسری اور آخری فیصلہ کن جنگ تھی ۔ وہ پچھلی جنگ کے نتائج سے قطعی غیر مطمئن بلکہ خفا نظر آتے تھے اور اس کی ذمہ داری بڑی حد تک خود فیلڈ مارشل اور ان کے مشیروں پر ڈالتے تھے کہ اگر یہ لوگ ذرا سی بھی اور ہمت دیکھاتے تو گویا میدان ان کے ہاتھ تھا۔ ہندوستان کو منہ کی کھانا پڑتی اور ہمیشہ کے لئے اس کا مزاج درست ہو جاتا۔انہوں نے فوج کی ازسرنو منصوبہ بندی کی ۔اس کی تعداد کو بڑھایا اور اس میں بنگالیوں کو بھی شامل کیا۔امریکہ اور برطانیہ نے جب ترسیل اسلحہ سے اپنا ہاتھ کھینچا تو روس کا رخ کیا اور اس طرح دشمن یعنی ہندوستان کے دوست کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کی۔

ایک طرف تو فوج میں توسیع اور ترقی کا عمل جاری تھا دوسری طرف پورے ملک میں سیاسی افراتفری کا دور دورہ تھا۔ اتنے میں فیلڈ مارشل صاحب پر فالج گرا اور وہ بچارے بستر سے لگ گئے ۔ان کی سنگین علالت کے فوراً بعد ان کے جانشین کے بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ سیاست دان تو خود آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ سیاسی ادارے انتہائی غیر مستحکم تھے۔ایسے حالات میں صرف ایک فوج ہی کا سہارا تھا۔لہذا سب کی نگاہیں فوج اور جنرل یحییٰ پر لگی ہوئی تھیں ۔مگر پھر فیلڈ مارشل صاحب جلد ہی روبصحت ہوئے اور دھیرے دھیرے امور مملکت سنبھالنے کے قابل ہو گئے مگر ان کی موذی بیماری نے انہیں اندر سے اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ بظاہر صحت یابی کے بعد بھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو سکے۔

دریں اثناء مشرق اور مغرب کے تعلقات اتنے بگڑے اور اس کے جلو میں پورے ملک میں ہنگامہ آرائی اور احتجاج کی ایک ایسی لہر آئی کہ پورا ملک ڈوبتا معلوم ہوا۔ ناچار فیلڈ مارشل صاحب کو فوج کو بلانا پڑا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے دونوں حصوں میں بس فوج ہی فوج نظر آنے

لگی ۔ بچارے فیلڈ مارشل صاحب اپنی جگہ جیسے نہتے ہوکر رہ گئے ۔اب ان کے اقتدار کا مکمل انحصار جنرل یحییٰ اوراس سوال کے جواب پر کہ وہ کب اور کہاں تک ان کا ساتھ دیتے ہیں ۔ فیلڈ مارشل صاحب کی سیاست کی بساط عملاً پلٹ چکی تھی ۔ان کی سیاست کے سارے مہرے پٹ چکے تھے ۔ ایک فوج تھی جو اب بھی ان کی وفاداری کا دم بھرتی معلوم ہوتی تھی مگر تا بکہ' میر جعفر اور میر صادق کہاں نہیں ہوتے ۔ جب تک ہوا کا رخ ٹھیک رہتا ہے ۔ وہ غائب رہتے ہیں مگر ادھر ہوا کا رخ پلٹا ادھر وہ پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے آ دھمکتے ہیں اور وہ کچھ کر گزرتے ہیں جس کا سان وگمان تک نہیں ہوتا ۔ دوست اور ماتحت کی وفاداری کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جیسے حالات اس حد سے گزرتے ہیں حلف وفاداری کی حیثیت حرف غلط کی سی ہو جاتی ہے ۔

انجام کار یہی ہوا ۔ایک دن اخبارات سے معلوم ہوا کہ فیلڈ مارشل اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے اور پورے ملک میں مارشل لا کا نفاذ ہوگیا ہے اور جنرل یحییٰ خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ۔اس طرح فوجی انقلاب کے جس راستے سے فیلڈ مارشل نے اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کیا تھا ۔ اس راستے سے وہ ایوان اقتدار سے باہر کردیئے گئے ۔ان کے حق میں ملک کے کسی کونے سے کوئی ہلکی سی آواز بھی سننے میں نہیں آئی اور نہ ہی جنرل یحییٰ کی طرف کسی نے انگلی اٹھائی ۔ گویا سب نے اسے ہونی شدنی سمجھ کر قبول کرلیا ۔ فیلڈ مارشل چھٹی پر کہیں پہاڑوں پر چلے گئے اور یحییٰ خان نے تخت صدارت کو سنبھال لیا ۔

ہرچند کہ ہمیں بزرگان دین کی طرف سے تنبیہ تھی کہ انہیں بار بار نہ چھیڑا جائے ۔ مگر اب حالات ایک ایسے سنگین اور فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ رہے تھے کہ ہمیں ان کی ہدایت اور رہنمائی کی اشد ضرورت محسوس ہوئی اور کوئی نہیں تو کم ازکم اپنے مرشد حضرت نظام الدین کی خدمت میں تو حاضر ہو ہی سکتے تھے کہ ان کی طرف سے اتنی سختی بھی نہ تھی ۔ اگر منہ سے بولنا بھی گوارہ نہ ہوتا تو ہوں' ہاں اور اشاروں میں کچھ نہ کچھ بتا دیتے ۔ضروری تھا کہ ذرا دلّی جا کر دیکھیں کہ پاکستان کے دوسرے فوجی انقلاب کے بارے میں ان کی کیا سوچ ہے ۔ لہذا دلّی پہنچ گئے اور فوراً آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔انہوں نے کمال خوش طبعی سے ہمیں اندر بلایا' معانقہ کیا اور فرمایا:

''تم نے دیکھ لیا تقسیم، در تقسیم، در تقسیم۔ بھلے یہ اپنے اپنے حق میں اور اپنے اپنے حساب سے نقشے پر لکیریں کھینچتے رہیں۔ بٹوارے پر بٹوارہ کرتے رہیں۔ مگر اللہ کی زمین جہاں کی تہاں رہے گی۔ سرزمین ہندوستان کے بے شک ٹکڑے ٹکڑے کر دو مگر اس کی روحانی وحدت اور یکجہتی ہر حالت میں رہے گی۔

تقسیم در تقسیم، در تقسیم، حضرت یعنی چہ؟ اس کا مطلب ذرا سمجھ میں نہیں آیا...' میں نے عرض کی۔

''آ جائے گا، آ جائے گا۔ جلد ہی آ جائے گا جو کچھ ہو رہا ہے وہ گویا اس عمل کی بازگشت ہے جو تقسیم الہند کے پیچھے کارفرما تھا یعنی وہی فرقوں کی لڑائی۔ پہلے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو آپس میں دست بگریباں ہوئے اور نقشے پر خط تقسیم کھینچ گیا۔ اور اب مغرب کے مسلمان بنگالیوں کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح ماضی میں ہندوؤں کو دیکھتے تھے اور بنگالی مغرب والوں کو غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں۔ اکٹھے رہیں تو کیسے رہیں...'

پھر اچانک حضت کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''سراج الدین تیار ہو جاؤ۔ خون کی ندیاں بہنے والی ہیں۔ پاکستان میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بعد کربلا کو بھول جاؤ گے۔ جرنیل بھی یزیدیت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

حضرت کے منہ سے یہ سن کر میرے تو گویا ہوش اڑ گئے۔ عقل ماؤف ہو گئی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر حضرت نے فرمایا:

''عذاب قبر کی حقیقت زمین کے انتقام سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان لوگوں سے جو زندگی میں زمین کو ٹھوکر مارتے ہیں اور اہل زمین سے ناانصافی کرتے ہیں۔ ان پر ظلم کرتے ہیں اور خون ناحق کے سزاوار ہوتے ہیں انہیں زمین کبھی معاف نہیں کرتی۔ کیونکہ اہل زمین پر ظلم خود زمین پر ظلم ہے اور زمین ظالم کو کبھی نہیں چھوڑتی اسے کبھی معاف نہیں کرتی۔

''زندگی میں اگر ظالم بچ کر نکل بھی جائے تو موت کے بعد عذاب قبر سے اسے کسی طرح مفر نہیں۔ یہ ظلم جو خود ہندوستان والوں نے سرزمین ہند پر کیا ہے اس کا بدلہ تو انہیں ہر حالت میں چکانا ہوگا۔ نسلاً بعد نسلاً اس سے بڑی زیادتی بھلا اور کیا ہوگی کہ جس زمین کے تقدس کی قسم کھاتے ہیں جس کی حفاظت کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اسی زمین پر بسنے والوں کے لہو سے زمین سرخ کر دیتے ہیں۔

''ہم لاکھ عقل کے ان اندھوں جنہیں اہل ہند کہا جاتا ہے کہ حق میں دست بدعا ہوں مگر زمین ہر حالت میں ان سے اسی طرح بدلہ لے گی جس طرح تقسیم کے وقت لیا اس سے بچ کر نکلنا محال ہے...''

ہم نے کبھی پیر و مرشد کو غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو سراپا عفو، سراپا صلح کل، سراپا مہربان تھے مگر آج تو جیسے برسوں کا غبار ان کے دل و جان سے نکل رہا تھا۔

پھر انہوں نے مصلیٰ کا کونا سیدھا کیا اور نیت باندھ لی۔ گویا محفل برخواست اور ہمیں رخصت کا حکم مل گیا۔ دلّی اور نئی دلّی میں کچھ دیر قیام کیا وہاں کے اخبارات پاکستان میں فوجی انقلاب کی خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ ہندوستانی افواج کو چوکس رہنے کے احکامات بھی تھے۔ اس سے زیادہ اور دیکھنے اور سمجھنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ سیدھے لاہور کا قصد کیا اور حضرت علی ہجویری کے حضور پیش ہوئے وہ نماز میں تھے سلام پھیرا اور فرمایا:

''نظام الدین نے جو کچھ بھی تم سے کہا بالکل ٹھیک تھا بس اب تم پنڈی جاؤ اور وہیں تکیہ کرو کہ آئندہ جو کچھ بھی ہوگا وہیں سے شروع ہوگا'' (اتنا کہا اور پھر نیت باندھ لی۔)

پنڈی یعنی پنڈی کلب پہنچے۔ اب تو گویا یہی ہمارا ٹھکانہ بن گیا تھا۔ پچھلی جنگ اور اس کے بعد خاموشی بلکہ مایوسی کی جو فضاء وہاں پیدا ہوئی تھی وہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اب وہاں جشن کا وہی سماں تھا جو ہم نے شروع شروع میں دیکھا تھا۔ محفل نا و نوش گرم تھی۔ جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ بار قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ ہال کے سامنے والی دیوار پر جہاں پہلے فیلڈ مارشل ایوب کی تصویر تھی۔ اب جنرل یحییٰ کی تصویر تھی۔ یقیناً پرانی ہوگی کیونکہ تصویر کے مقابلے میں ان کا اصل حلیہ بدل کر رہ گیا تھا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بھدے اور بھاری ہو گئے تھے۔ تصویر میں

البتہ خاصے بانکے سجیلے دیکھائی دیتے تھے۔کلب میں موجود سب کے سب بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔جنرل یحییٰ کی تعریف پر تعریف ہورہی تھی۔فیلڈ مارشل پر لعن طعن تونہیں البتہ ان کے بارے خیر کا ایک کلمہ بھی سننے میں نہیں آیا۔دیکھنے میں لاکھوں میں ایک ہونے کے باوجود وہ اصل میں وہ نہیں تھے جونظر آتے تھے۔ان کی شخصیت فیصلے کی اس قوت سے عاری تھی جس کا ان کا اعلیٰ ترین فوجی عہدہ متقاضی تھا۔کسی صاحب نے انہیں شیر قالین بھی کہا وہ جو کہتے ہیں نہ کہ اتر اشہنہ مُردک نام سو اس وقت اس کا اطلاق فیلڈ مارشل ایوب کی شان میں کہے جانے والے کلمات سے ہورہا تھا فااعتبرو یا اولی الابصار۔ واقعی عبرت کا مقام تھا۔

جنرل یحییٰ کے اقتدار کا ابتدائی دور بطریق احسن چلا۔امن وامان کی حالت سدھری' شورش اوراحتجاج کا خاتمہ ہوا۔ سیاست دان باہم ایک دوسرے دست بگریباں ہونے کے بجائے منقار ہوکر اپنے اپنے کونوں میں بیٹھ رہے۔مشرق اور مغرب کے تعلقات میں بھی بہتری کی طرف پیش رفت ہوتی نظر آئی۔فیلڈ مارشل ایوب کو بنگالیوں سے گویا جنم' جنم کا بیر تھا۔وہ انہیں پٹھان اور پنجابیوں کے مقابلے میں بہت گھٹیا اور کمزور سمجھتے تھے۔ جنرل یحییٰ کم از کم اس ضمن میں ان کی بالکل ضد تھے۔ویسے بھی وہ ہر قسم کے تعصّبات سے بالاتر معلوم ہوتے تھے۔انہوں نے بنگالیوں کو بڑھاوادیا۔ان کی تعداد اور نمائندگی ہیں مرکزی وزارتوں اور دوسرے محکموں میں اضافہ کیا خود فوج میں بھی ان کی تعداد کو دوگنا کردیا۔ابھی تک فوج بنگالیوں کیلئے بمنزلہ شجر ممنوعہ تھی۔مگر اب فوج کے اعلیٰ عہدوں اور ہر سطح پر نظر آتے تھے۔

جنرل یحییٰ نے کھلے الفاظ میں یہ دعویٰ اور اعلان بھی کیا تھا کہ وہ فیلڈ مارشل کی طرح حکومت میں اپنے اقتدار کو طول دینے نہیں آئے۔ان کے صرف دو بڑے مقاصد تھے۔اول یہ کہ حکومت کے مختلف شعبوں کی کارکردگی کو بہتر بنائیں اور انہیں ہر قسم کی بدعنوانیوں سے پاک کرکے صحیح ڈگر پر ڈالیں۔دوئم یہ کہ جلد از جلد عام انتخابات کرا کے اقتدار اعلیٰ عوام کی نمائندوں کے حوالے کریں۔

ایک اچھے اور سچے فوجی کی حیثیت سے وہ قوم سے کئے ہوئے وعدوں کی تکمیل میں آگے بڑھتے رہے اور پوری قوم نے ان کی پذیرائی کی۔حتیٰ کہ بنگالی بھی ان کا دم بھرنے لگے۔ان کے

راستے میں جتنی بھی رکاوٹیں تھیں وہ انہیں کامیابی سے پار کر گئے۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو خود فوج ہی تھی۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں کی ایک بڑی جمیعت ان کی بنگال اور بنگالی نوازی کے خلاف نہ سہی مگر ان کے حق میں بھی نہ تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ آگے جا کر جنرل یحییٰ کی بنگال نوازی حد سے بڑھی توقعات کی صورت میں بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے پنجابی' پٹھانوں نے بنگالیوں کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں۔ وہ ان سے ہمیشہ الگ الگ اور کٹے کٹے رہے۔

مگر واہ رے جنرل یحییٰ، انہوں نے جو کچھ کہا وہی کر دکھایا۔ فوج کی دبی دبی ناراضگی اور سیاسی قائدین کے خدشات کے باوجود انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عام انتخابات کا انعقاد کیا اور انتخابات بھی اتنے صاف' شفاف کہ ایک عالم نے اس کا اعتراف کیا۔ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں سے بڑا تھا۔ لہذا وہیں کی ایک جماعت انتخابات کے نتیجے میں اکثریتی جماعت بن کر ابھری۔ اس جماعت کے قائداعلیٰ وہی شیخ مجیب الرحمٰن صاحب تھے جن کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ قباحت یہ تھی کہ اس کا ایک نمائندہ بھی مغربی پاکستان سے منتخب نہیں ہوا۔

انصاف کا تقاضہ تو یہی تھا کہ اس جماعت کو اقتدار اعلیٰ کا مستحق قرار دے کر حکومت کی باگ ڈور اس کے حوالے کی جاتی' مگر یہ بات کسی طور بھی مغربی پاکستان کے قائدین بالخصوص دوسری بڑی جماعت کے قائد کو منظور نہ تھی۔ ان صاحب کا نام ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ مغربی پاکستان میں ان کی جماعت وہاں کے عوام کی بڑی اکثریت کی نمائندہ ہو کر ابھری تھی۔ مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعت کی طرح اس کا بھی کوئی نمائندہ مغربی پاکستان میں نہیں تھا۔ اب مغرب میں بھٹو اور مشرق میں مجیب دونوں میں ٹھن گئی۔ آپس میں مل بیٹھ کر صلح صفائی کی تو بڑی بات تھی وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں معلوم ہوتے تھے۔

ادھر مشرقی اور مغربی پاکستان کی دونوں بڑی جماعتوں میں ٹکراؤ ہوا' ادھر فوج کی نیت بدلتی معلوم ہوئی۔ کہاں تو یہ دعویٰ کہ انتخابات کے بعد جلد از جلد اقتدار اعلیٰ عوام کے نمائندوں کے

حوالے کر دیں اور کہاں یہ سوال کہ آخر کریں تو کیسے اور کس طرح؟ دونوں کے باہمی تصادم نے فوج کی اقتدار اعلیٰ پر جمے رہنے کی ہوس کو بھڑکایا۔ فیلڈ مارشل ایوب کے دور میں فوج کو اقتدار اعلیٰ کا لہو تو بہرحال لگ چکا تھا۔ سیاست دانوں کو باہم دست بگریبان دیکھ کر جنرل یحییٰ اور ان کے جرنیل خاصے خوش معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے خود پنڈی کلب میں بارہا فوجی افسروں کو اس طرح پیدا ہونے والی نئی صورتحال پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سنا ان سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی ملک اور اس کی سلامتی کو سیاسی بھیڑیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔

تیزی سے بدلتی بلکہ بگڑتی یہ صورتحال کسی حد تک سیاست دانوں کی اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ تھی اور کسی حد تک خود فوج کی اقتدار اعلیٰ پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کی خواہش اور نیت پر معلوم تو یہی ہو رہا تھا کہ حکمرانی کی دبی دبی چنگاری اب شعلہ بن کر فوجیوں کے خاکستر سے نکل رہی تھی سیاسی کشمکش گویا فوج کے حکومت سے چمٹے رہنے کا جواز بنتی جا رہی تھی۔ فوج کی بڑی اکثریت کا تعلق چونکہ مغربی پاکستان سے تھا۔ اس لئے فوجی حکومت میں اقتدار اعلیٰ بہرحال مغربی پاکستان کے پاس ہی رہتا اور مشرقی پاکستان کے انتخابات میں اپنی کامیابی کے بعد بھی مغربی پاکستان کی اقلیت ہی کے تابع رہتا۔ تاہم مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کی شہ پر فوج کی اعلیٰ قیادت کو بھی یہ منظور نہ تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے اقتدار اعلیٰ ایک ایسی خطرناک اور پیچیدہ جنگ شروع ہوگئی کہ جنرل یحییٰ کی فوج اپنے ازلی دشمن یعنی ہندوستان کو بھلا کر خود گھر کے دشمن سے نپٹنے میں لگ گئی۔ ملک کی سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ کہاں سے؟ مشرقی پاکستان سے ملک کا سب سے بڑا دشمن بلکہ غدار کون؟ بنگالی؟ بنگالی کون؟ ہندو! ہمیں تو یہی لگا کہ جیسے سارے مسلمان مغربی پاکستان میں اور سارے ہندو مشرقی پاکستان میں بس گئے اور اس وقت جو بھی تصادم ہو رہا ہے اور آئندہ جو بھی تصادم ہوگا وہ ایک ہی ملک کے دو حصوں یا صوبوں میں نہیں ہوگا بلکہ ہندو مسلمان میں ہوگا۔

انتخابات کے انعقاد کے بعد جنرل یحییٰ صاحب تو اپنے عشرت کدہ میں چلے گئے۔ وہ سپاہی کی جگہ اگلے وقتوں کے رنگیلے شاہ بنتے جا رہے تھے۔ شراب سے تو انہیں فرصت ہی کہاں تھی۔ اس میں صبح و شام کرتے۔ ذرا دیر اور وہ بھی بس جب جی چاہا دفتر تشریف لائے سرکاری کام دیکھا اور

بس۔ دفتر میں بھی ان کا زیادہ وقت ملاقاتوں میں صرف ہوتا۔ سیاست دانوں میں شیخ مجیب الرحمٰن نے تو مغربی پاکستان نہ آنے کی تو گویا قسم کھا رکھی تھی۔ وہ کسی عنوان ادھر کا رخ کرنے کو تیار نہ تھے۔ البتہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب اکثر فوج کے جرنیلوں اور جنرل یحییٰ صاحب کی محفلوں میں دیکھے جاتے۔ جنرل یحییٰ کی تو صبح ہی شام کو ہوتی تھی اور محفل جمتی اور خوب جمتی۔ افسوس' صد افسوس۔ ایک موقع پر تو ہمیں اس قسم کی بے راہ روی کا انجام سوچ کر خود اپنے ہی ایک شعر کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد آ گیا کہ

یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

ہر چند کہ عام انتخابات سیاسی عمل کی پرامن بحالی اقتدار کا پیش خیمہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر اس کے بعد ایسی سنگین صورتحال پیدا ہوئی جو سنبھالے نہیں سنبھلی۔ حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ پورے ملک' پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔

ہندوستان بظاہر خاموش تماشائی بنا تھا مگر اس تاک میں تھا کہ کب پاکستان کی صورتحال مزید بگڑے اور کب اسے اپنی سی کرنے کا موقع ملے وہاں اب جواہر لال کی صاحبزادی محترمہ اندرا گاندھی کی حکومت تھی۔ ہم نے محترمہ کو صرف ایک بار اپنے دورۂ دلّی کے دوران دیکھا تھا۔ ان کی تیوریاں اکثر چڑھی رہتیں۔ اپنے والد محترم جواہر لال نہرو کی طرح ان کے مزاج بھی ایک الڑھ بچے کا سا تھا۔ مگر جواہر لال کی معصومیت انہیں چھو کر نہیں لگی تھی۔ ہم نے ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کی جھلک تک نہیں دیکھی۔ کہنے کو بیوی تھیں' ماں تھیں مگر بے حد ترش رو اور درشت مزاج۔

پاکستان کے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ معلوم ہوتا کہ اب وہ خود جنرل یحییٰ کے اختیار میں بھی نہیں۔ انتخابات کے بعد اقتدار اعلیٰ عوام کے نمائندوں کے سپرد کرنے کے بارے میں جتنے بھی وعدے کئے گئے تھے فوج کے جنرل ایک ایک کر کے ان سے منحرف ہونے لگے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو ان کے حلیف بلکہ ایک طرح سے سیاسی پناہ گاہ بن گئے۔ شیخ صاحب کے ہر مطالبے پر وہ بھٹو صاحب کو آگے بڑھا دیتے اور بھٹو صاحب بڑے

زور وشور سے اس مطالبے کو مسترد کر دیتے۔ یہ سوال بار بار اٹھایا جا رہا تھا کہ دونوں میں کون کون کس کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے۔ فوج بھٹو صاحب کے ہاتھ میں یا بھٹو صاحب فوج کے ہاتھ میں۔ نیولے اور سانپ کی لڑائی کے انجام کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون ہارے گا اور کون جیتے گا۔ البتہ فوج بیرونی دشمن کے سامنے تو ہتھیار ڈال سکتی ہے۔ مگر گھر کے دشمن کے سامنے فوج کو صرف اس وقت ہار ماننا پڑتی ہے جب پوری قوم فوج کے خلاف کھڑی ہو جائے۔

جنرل یحییٰ نے خدا خدا کر کے منتخب مجلس شوریٰ کا مشرقی پاکستان کے مرکزی شہر ڈھاکہ میں انعقاد کا اعلان کیا۔ مگر ابھی ان کے اس اعلان کی بازگشت بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ بھٹو صاحب' بلکہ عملاً پورا مغربی پاکستان' مجلس شوریٰ کے انعقاد کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ عجیب اور افسوس ناک صورتحال تھی۔ ایک طرف فوج قائدین کو دعوت دے رہی ہے کہ آئیں اور نیا آئین بنا کر اقتدار سنبھالیں۔ دوسری طرف مغربی پاکستان والے خاص طور پر وہاں اکثریتی جماعت کے صدر اور کرتا دھرتا مجلس شوریٰ کے افتتاحی اجلاس کے اس وقت تک التوا پر مصر تھے جب تک کہ ان کی اقلیتی جماعت اور شیخ مجیب کی اکثریتی جماعت کے ترازو کے پلڑے برابر' برابر نہ کر دیئے جائیں۔

فوج کو اس کے سوا اور کیا چاہئے کہ سیاست دان اسی طرح ایک دوسرے سے الجھیں رہیں اور وہ آرام سے حکومت پر ڈٹی رہیں۔ بظاہر جنرل یحییٰ نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ دونوں حریف یعنی مجیب اور بھٹو آپس میں مل کر کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ اس طرح اور کچھ نہیں تو کم از کم مجلس شوریٰ کا افتتاحی اجلاس کا انعقاد ہو جائے۔ شیخ صاحب تو کسی حالت میں بھی مغربی پاکستان آنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جنرل یحییٰ بنفس نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے اور شیخ صاحب سے گفت وشنید کا آغاز ہوا۔ مگر عین اسی وقت جب بات بنتی نظر آ رہی تھی۔ بھٹو صاحب کو ڈھاکہ طلب کر لیا گیا اور ان کے آتے ہی بات بگڑی اور ایسی بگڑی کہ پھر بنائے نہ بنی۔ ایک طرف شیخ صاحب اپنی سی کرتے رہے۔ دوسری طرف بھٹو صاحب عملاً وہی کرتے رہے جو فوج کو منظور تھا۔ اصولاً ان کا فوج سے معاملہ ہو گیا تھا۔ یعنی یہ طے ہو گیا تھا کہ خواہ کچھ ہو اقتدار کسی حالت میں بھی شیخ صاحب یعنی بنگالیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو پھر گویا ہمیشہ

کے لئے مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی اکثریت کے تابع ہو کر رہ جائے گا۔

ایک شب ہمیں خود بیک وقت تین بزرگان دین یعنی حضرت علی ہجویری، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت بوعلی قلندر کی جانب سے حکم ملا کہ سراج الدین اب وقت آ گیا ہے تم بنگال جاؤ اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بتاؤ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ اب فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ سلہٹ کے شاہ جلال سے ان سب کا رابطہ تھا۔ ان کا یہی فرمانا تھا کہ بنگالیوں کے سر پر قیامت کی گھڑی آ کھڑی ہے۔ دلّی جانے کا حکم بھی ملا کہ حضرت نظام الدین سے بلمشافہ ملاقات بھی ہو جائے اور یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ادھر یعنی ہندوستان والوں کی پاکستان کے بارے میں کیا سوچ ہے۔ اطراف یعنی شمال و جنوب مشرق و مغرب کے فرق کے باوجود سرزمین ہند بہرحال ایک جسد واحد ہے اور اس کی وحدت کو کوئی پارہ پارہ نہیں کر سکتا۔ ہندو کہ مسلمان، سکھ کہ عیسائی جو بھی ہندوستان میں رہتا ہے وہ بہرحال ہندوستانی ہے اس کا جینا اور مرنا اسی سرزمین کی ساتھ وابستہ ہے۔ سرحدیں اپنی جگہ بنتی رہیں بدلتی رہیں۔ بٹوارہ پر بٹوارہ ہوتا رہے مگر یہاں کے دریا اور پہاڑ، صحرا اور سبزہ زار جہاں پر روز ازل سے چلے آ رہے ہیں وہیں رہیں گے۔ انہیں کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔

دلّی پہنچے اور حضور کی خدمت عالیہ میں حاضری دی۔ امیر خسرو بھی وہیں پر تھے۔ خلاف عادت حضرت بہت چپ چپ تھے۔ دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے امیر خسرو نے فرمایا:

بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

اب تو صبح شام میں وقت بے وقت گویا کوئی فرق نہیں ہر طرف خون ہی خون۔ معاذ اللہ! پھر خود نظام الدین اس طرح گویا ہوئے:

''شاہ جلال واقعی صاحبِ جلال ہیں۔ اس کے باوجود کہ انہیں اور ہم سب کو اندازہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے مگر امید اور دعا یہی تھی کہ اللہ سبحان تعالیٰ کے فضل و کرم سے آئی بلا ٹل جائے گی مگر جس بے دریغ طریقے سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اتنا خود تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا...'' پھر ذرا وقفہ دے کر فرمایا:

''سراج الدین ادھر بنگال میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسی کو عذاب قبر کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے یہ عذاب مردوں کی بجائے زندوں پر نازل ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس وقت جہنم کے طبقات سے کم نہیں۔ وہ اپنا بدلہ لے کر رہے گی۔ تم نے بنگال کا قصد کیا ہے۔ جاؤ' سدھارو' شاہ جلال کے حضور ہمارا اور خسرو کا سلام پیش کرنا اور بس۔

''اول تو وہ بولتے بہت کم ہیں بلکہ بولتے ہی نہیں۔ بہر حال تم ہم کلامی کی صرف اس وقت جرأت کرنا۔ جب وہ تم سے خود مخاطب ہوں ورنہ زانوئے ادب طے کئے بیٹھے رہنا۔ اچھا پھر اللہ کے حوالے۔ تمہارے سر پر ہم جو کانٹوں کا تاج رکھا ہے اس کو اوڑھے رہو اور منہ سے اُف نہ کرو...''

ہمیں بے اختیار مرزا نوشہ کا شعر یاد آ گیا جو ہمیں بے حد پسند ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

ہم نے پہلے ہی اپنے تئیں طے کر لیا تھا کہ جو فرض ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کی تکمیل تک چین سے نہ بیٹھیں گے آخر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانی کے شانہ بشانہ اتنے بزرگوں کا سایہ بھی ہمارے سر پر تھا۔ اپنے عہد کی دل ہی دل میں تجدید کی اور حضور سے رخصت لے کر اپنے راستے پر چل پڑے۔

بنگال پہنچ کر معلوم ہوا کہ جنرل یحییٰ صاحب بھی اپنے مشیروں کے ساتھ ڈھاکہ میں تشریف فرما ہیں۔ شیخ مجیب سے علیحدہ علیحدہ اوران کے ساتھیوں سمیت جنرل یحییٰ صاحب کے گفتگو کے کئی دور ہو چکے ہیں۔ بھٹو صاحب بھی وہیں ڈھاکہ میں موجود ہیں۔ معاملات سلجھنے کی بجائے اور الجھتے جا رہے ہیں۔ بنگالی اپنی اکثریت کے بل پر مکمل خود مختاری بلکہ آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں جبکہ مغربی پاکستان والے' بشمول فوج اور بھٹو صاحب' کسی طور سمجھوتے پر تیار نہیں۔ ان کے نزدیک یہ حل' حل نہیں بلکہ ملک اور قوم کی یکجہتی کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ باہمی رسہ کشی میں رسی بس اب ٹوٹا ہی چاہتی تھی۔

ڈھاکہ کے بڑے بازار کی ایک طرف ایک بہت عالیشان مسجد دیکھی۔ مسجد کی پیشانی پر مسجد بیت المکرّم کندہ تھا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ مسجد اندر سے تو خالی تھی مگر باہر سڑک پر فوجی قطار اندر

قطار کھڑے تھے۔ قد کاٹھ' چہرے مہرے سے سب کے سب بنگالی دکھائی دیتے تھے۔ مسجد کی ایک اونچی سیڑھی پر وہی پنڈی کلب والے کرنل عثمانی کھڑے تھے۔ وہ فوج سے کب کے فارغ ہو چکے تھے۔ مگر اس وقت تمغوں سمیت پوری وردی میں ملبوس تھے۔ ان کی گھنی مونچھیں میں سفیدی آ چکی تھی۔ کرنل عثمانی اس وقت بہت بارعب لگ رہے تھے۔ مجسم بردباری اور دبدبہ۔

''ارے یہ حضرت یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' پہلے تو ہمارے ذہن میں یہی سوال اٹھا۔ مگر جلد ہی پتہ چلا کہ آج پاکستان میں کوئی بڑا دن ہے۔ اس موقع پر ہمیشہ افواج پاکستان کی پریڈ ہوتی ہے مگر اس بار ڈھاکہ میں بدامنی بلکہ کھلی بغاوت کے بعد پاکستان افواج کی پریڈ تو منسوخ کر دی گئی ہے۔ البتہ جنرل عثمانی صاحب نے ڈھاکہ اور آس پاس کے دوسرے علاقوں میں موجود پنشن یافتہ بنگالی فوجیوں کو اکٹھا کر کے پریڈ کا اہتمام کیا ہے وہ خود اس پریڈ پر سلامی بھی لیں گے اور آزاد بنگال۔ یعنی بنگلہ دیش کے پرچم کشائی بھی کریں گے۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔ نوبت جب یہاں تک پہنچ جائے تو اکٹھے رہنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب پاکستان تقسیم در تقسیم کے دہانے کھڑا ہے۔ بس وقت کی بات ہے۔ نیز یہ کہ کن مراحل سے گزر کر شکست و ریخت کی منزل تک پہنچے گا۔

بنگالیوں کی پیریڈ پر کرنل عثمانی صاحب کو سلامی لیتے اور اس کے بعد پرچم کشائی کرتے ہم نے خود دیکھا۔ پریڈ کی رونق اور گھما گھمی کے علاوہ پورے شہر میں مکمل سناٹا تھا۔ دوکانیں ساری کی ساری بند۔ آنے جانے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ پریڈ پر حاضر فوجی خود ہی تماشہ کرنے والے تھے اور خود ہی تماشہ دیکھنے والے بھی۔ چنانچہ ادھر پریڈ ختم ہوئی اور ادھر سب کے سب جلد ہی وہاں سے کھسک لئے۔ صرف بنگال یا بنگلہ دیش کا سبز اور سرخ جھنڈا ہوا میں اکیلا لہراتا رہ گیا۔

پریڈ کو ہوئے ابھی ایک دو روز ہی ہوں گے کہ ایک شب جب ہم حسب معمول نماز اور تلاوت مصروف تھے ایک دم یوں لگا جیسے طوفان باد و باراں پھٹ پڑا ہے۔ بادلوں کی گرج سے کان کے پردے پھٹے جاتے تھے' بجلی بری طرح کڑک رہی ہے اور وقفے وقفے سے اس کی تیز روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ یاالٰہی خیر' آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو نہ بادل نہ باراں نہ برق۔ مگر

آسماں سے گویا آگ برس رہی تھی اور زمین دھماکوں سے ایسے ہل رہی تھی۔ جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ پھر بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک توپ وتفنگ کے شور میں بدل گئی۔ بلا کی گولہ باری ہو رہی تھی۔ شہر ڈھاکہ پر پاکستانی فوج نے دھاوا بول دیا تھا۔ گولوں کی دھما دھم اور گولیوں کی تڑا تڑ میں کبھی کبھی گھرے ہوئے انسانوں کی آہ و بکا بھی سنائی دے رہی تھی۔ جس پاکستان کو بنگال کے بنگالیوں اور پنجاب کے پنجابیوں اور سرحد کے پٹھانوں نے مل جل کر بنایا تھا۔ اب پاکستان کے مشرقی حصے پر مغربی حصے نے حلّہ بول دیا۔

دوسرے دن ڈھاکہ شہر میں ہُو کا عالم تھا۔ رقص بسمل تو شب کے پردے میں ہوا اور خوب ہوا اب تو صرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں یا پھر فوجی گاڑیاں جو فراٹے بھرتی سنسان سڑکوں پر دندناتی پھرتی تھیں۔ ایسا وقت تو غدر کے وقت خود ہماری دلّی پر بھی کیا پڑا ہوگا۔ فوجی گاڑیوں کا تو خیر سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا۔ اس وقت کے گولہ بارود کی حیثیت آج کل کے خوفناک گولہ بارود لاہور توپوں کے مقابلے میں پھلجھڑی سے زیادہ کیا ہوگی۔ ڈھاکہ میں جتنا اور جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد اور دیکھنے کا یارا نہ تھا۔ لہذا اپنی اصل منزل یعنی حضرت شاہ جلال کی درگاہ کا قصد کیا۔ راستے میں جدھر نظر پڑی بس دو چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو فوجی طرح طرح کی گاڑیوں میں سوار بھی اور پیدل بھی اور دوسری طرف آفت کے مارے انسان جو سروں پر گٹھڑیاں سنبھالے اور منہ اٹھائے بس چلے جارہے ہیں۔ نہیں معلوم کہ کہاں سے آئے ہیں اور کدھر جارہے ہیں۔ بس وہی منظر جو ہم نے تقسیم کے وقت دلّی اور پنجاب میں دیکھا تھا۔ وہی کچھ دہرایا جارہا تھا۔ راستے میں جتنے بھی گاؤں، گوٹھ پڑے۔ جتنی بھی بستیاں دیکھیں سب میں سناٹا' جھونپڑیوں میں زن و مرد سہمے سہمے منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ کیا عبرت کا مقام تھا۔

آخر سلہٹ پہنچ گئے۔ یہاں بالکل امن' جمی تھی۔ نہ شور نہ ہنگامہ۔ سڑکوں پر لوگوں کی آرجار تھی مگر سب سہمے سہمے صرف سرگوشیوں میں بات چیت کرتے۔ حضرت علی ہجویری کی درگاہ کی طرح حضرت شاہ جلال کی درگاہ بھی شہر کے بیچ تھی۔ دور ہی سے نظر آ گئی۔ میرا ان سا آمنا سامنا صرف ایک بار اولیاء اللہ کی مجلس شوریٰ میں ہوا تھا۔ انتہائی کم گو تھے۔ زیادہ تر اشاروں میں بات کرتے۔

رنگ بنگالیوں کی طرح پکا سا تھا۔ مگر ریش مبارک ایسی سفید براق کہ اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کے بارے میں کہیں سنا تھا کہ وہ اپنے وقت کے منصور الحلاج ہیں۔ حق' حق کے علاوہ کم ہی کچھ کہتے ہیں باقی سب اشاروں میں۔

درگاہ میں داخل ہوا ہوا تو صحن بندگان خدا سے پٹا پڑا تھا۔ مجھ سمیت' ہر فرد کوئی نہ کوئی آرزو' کوئی نہ کوئی تمنا' کوئی نہ کوئی گلہ شکوہ لے کر آیا تھا۔ درگاہ کے ایک کونے میں چار خانے والی چادر تنی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ حضور اس کے پیچھے تشریف فرما ہیں۔ دبے پاؤں چادر کا پلو اٹھایا اور اندر داخل ہوا۔ حضور گویا سراپا نور بنے مصروف عبادت تھے۔ دم سادھ کر اور زانوئے ادب طے کر کے ایک طرف ہو کر بیٹھ رہا۔ حضور نے سلام پھیرا۔ مجھے دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں میرے آداب و سلام کا جواب دیا اور پھر نیت باندھ لی اور یہ سلسلہ کافی عرصے سے چلتا رہا۔

پھر انہوں نے آخری بار سلام پھیر کر میری طرف نگاہ کی اور فرمایا: ''دیکھ لیا؟'' میں نے جواب میں آہستہ سے گردن ہلائی۔ پھر وہ جیسے مراقبے میں چلے گئے۔ آنکھیں موندھ لیں۔ سر مبارک اوپر کی طرف کیا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں نیم وا کر کے مجھے دیکھا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میں نے ہمت کر کے سب کا سلام ان کی خدمت میں عرض کیا۔

''وہ تو ہمیں پہلے ہی پہنچ چکا ہے۔ وہ خود سب کے سب ادھر آ کر جا بھی چکے ہیں۔ تم آئے۔ بہت اچھا کیا کہ ان سنگین حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرنا کارِ شاہان باشد...''

''حضور کہاں میں فقیر اور کہاں بادشاہی' میری منہ سے بے اختیار نکلا۔ سنتے ہی حضور کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آنکھیں سرخ سرخ ہو گئیں۔

''تمہاری اسی کمزوری نے تو ہندوستان کو اس حالت میں پہنچایا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اگر بادشاہ بنے ہو تو پھر بادشاہی کر کے دکھاؤ۔ حق اور انصاف کا بول بالا کرو...''

اس کے بعد وہ ایک دم سے خاموش ہو گئے اور جیسے فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ صرف ان کا نور 'ظہور' باقی رہ گیا۔ وہ ہمارے سامنے تھے بھی اور نہیں بھی۔ ہم آہستہ سے اٹھ کر الٹے پاؤں رخصت ہوئے۔

ہم بیک وقت خوش تھے کہ شاہ جلال نے ہم کو ہم کلامی کا شرف بخشا اور انتہائی دل گرفتہ اور پریشان بھی۔ اس وقت پورا مشرقی پاکستان کربلا بنا ہوا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون۔ بھائی بھائی کو ذبح کر رہا تھا۔ بہنوں کی بے حرمتی کر رہا تھا۔ بچوں کے خون ناحق کا گنہگار ہو رہا تھا۔ پاکستان کی فوج پورے صوبے پر چھائی ہوئی تھی اور لوگ سہمے سہمے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ مسلمان' مسلمان کے گلے پر چھری چلا رہا تھا۔ نہ عورت کی عزت وناموس محفوظ تھی نہ بچوں کا خیال۔ بس جو بھی سامنے آ گیا' پس کر رہ گیا۔

وہاں اتنا کچھ دیکھنے کے بعد اور دیکھنے کا حوصلہ نہ رہا۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

معلوم ہوا کہ پاکستان فوج کے سارے بنگالی سپاہی باغی ہوکر سرحد پار ہندوستان بھاگ گئے۔ کرنل عثمانی مفرور ہو چکے تھے اور اب ہندوستان میں غدار بنگالی سپاہیوں کو خود اپنے ملک پاکستان پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بتا رہے تھے۔ عجیب صورتحال تھی۔ ایک ہی فوج دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف آمادہ بہ پیکار تھی۔ ہندوستان میں اس وقت جواہر لال کی صاحبزادی محترمہ اندرا گاندھی کا راج تھا۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فوجی کاروائی کے فوراً ہی بعد اعلان کر دیا کہ ان کا ملک پاکستان کی بگڑتی ہوئی صورتحال سے لاتعلق نہیں رہے گا اور ہر وہ کاروائی کرے گا جو اس کے حق میں ہوگی۔ وہ بنگالی مسلمانوں کی حمایت اور خیر خواہی کے پردے میں پاکستان کو ختم کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

محترمہ اور ان کی فوج پاکستان کے خلاف برابر منصوبہ بندی میں لگی تھی۔ ادھر پاکستان والے اپنی ترنگ میں آئے ہوئے تھے۔ مغربی پاکستان خاص طور پر پنڈی میں جو حال دیکھا وہ کسی طرح تسلی بخش نہیں تھا۔ یہاں والوں کی بڑی اکثریت مشرقی پاکستان کے تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات سے بڑی حد تک بے نیاز اپنے معمولات میں مصروف دیکھائی دیتی تھی۔ مشرقی پاکستان اور وہاں پر ہونے والی فوجی کاروائی کا اکثر ذکر ہوتا بھی تو اس طرح جیسے کسی غیر ملک اور اس پر آنے والی آفات کا۔

جنرل یحییٰ اور ان کے جنرل پتہ نہیں کس امید پر' کس کی حمایت پر تکیہ کئے بیٹھے تھے۔ انہیں اگر

ذرا سی فکر بھی تھی تو صرف ہندوستان سے تیزی سے بگڑتے ہوئے تعلقات کی۔ ہندوستان اب کھل کر بنگالی باغیوں کے شانہ بشانہ اوران کی امداد کے بہانے پاکستان پر وار کرنے لگا تھا۔مشرقی پاکستان پراس کی گولہ باری بڑھتی جارہی تھی۔مشرقی پاکستان کی سرحدوں پرافواج کے اجتماع میں بھی روزافزوں اضافہ تھا۔ادھر پاکستان میں ایک طرف جنرل اور کرنل اپنے اپنے دفاتر میں بیٹھے خدا جانے کس قسم کی منصوبہ بندی کررہے تھےاور دوسری طرف وہاں کے سیاست دان اقتدار کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔شیخ مجیب الرحمٰن تو کب کے گرفتار ہوکے مغربی پاکستان میں قید تھے۔ ان کی جماعت پر پابندی لگ گئی۔ رہے بھٹو صاحب تو انہیں صرف اورصرف اور ہر حالت میں اقتدار چاہئے تھا۔ ملک جائے بھاڑ میں۔انہیں تو صرف اقتدار سے غرض تھی۔ان کے لئے ملک صرف حصول اقتدار کی حد تک اہم تھا۔اگر اقتدار نہیں تو پھر ملک کس کام کا۔

اب رہے جنرل یحیٰی اوران کے مقربان خاص تو ہمیں ان پر بیک وقت بے حد غصہ اوران کی بدنصیبی پر رونا آتا تھا۔ان کے دور کی اٹھان کتنی اچھی تھی۔یہی لگتا تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب کے آخری دور میں ملک جس افراتفری اورمشرق ومغرب کی کشیدگی کے شکنجے میں پھنس کر رہ گیا تھا بالآخراس سے نکل جائے گا مگر 'اسے بسا آرزو کہ خاک شدے!'

مشرقی پاکستان کی صورتحال انتہائی تیزی سے بگڑتی جارہی تھی۔وہاں پر متعین فوجی مرکز یعنی جی ایچ کیو کے احکامات اور ہدایات کا انتظار کئے بغیر اپنی من مانی کررہے تھے۔ جسے چاہتے غدار اور ہندوستانی جاسوس قرار دے کر جہنم رسید کردیتے۔ ادھر بڑے جنرل صاحب کا نام ٹکا خان تھا دوسرے صاحب کا نام نامی امیر عبداللہ خان نیازی تھا۔باقی جنرل فرمان تھے' جنرل رحیم تھےاور نہ جانے کون کون' وہ سب اپنی من مانی کررہے تھے۔فوج کا مرکزی نظم ونسق عملاً ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں ہر ایک مختار کل تھا۔

جنرل ٹکا خان کی کمان میں سب سے پہلے ڈھاکہ پر شب خون مارا گیا۔فوج کو جیسے ہی اپنی کاروائی کے آغاز کے احکامات ملےاس نے پورے شہر پر چڑھائی کردی۔شیخ مجیب گرفتار ہوئے۔ باقیوں نے بھاگ کر سرحد پار ہندوستان میں پناہ لی۔ان میں سے ایک کرنل عثمانی صاحب بھی'

ہندوستان، بلکہ محترمہ اندرا گاندھی کو ایسے ہی موقع کا انتظار تھا کہ کب پاکستان میں فساد ہو بغاوت اور افراتفری کا دور دورہ ہو اور کب وہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ سوانہیں جو کرنا تھا اس کی تکمیل میں شب و روز لگ گئیں اور جیسے جیسے پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے ویسے ویسے وہاں ان کی اور ان کی افواج کی مداخلت بڑھتی گئی۔ پاکستان کے حکمران جرنلوں نے اس پر واویلا تو بہت کیا مگر معقول منصوبہ بندی سے بے نیاز بلکہ غافل رہے۔

جنرل ٹکا خان اور امیر عبداللہ خان نیازی نے باہمی صلاح و مشورے کے بغیر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اپنا کام کرتے رہے۔ جنرل ٹکا خان بظاہر بہت سخت گیر اور احکامات کے پابند۔

ان کے برعکس جنرل امیر عبداللہ خان نیازی ایک نڈر اور جنگ آزمودہ سپاہی کی شہرت رکھتے تھے۔ تاہم زن اور زر دونوں ان کی کمزوری معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے مغربی بنگال پر قبضہ کا بیڑا ابھی اٹھایا ہوا تھا۔ وہ جب اپنی ترنگ میں ہوتے تو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مار مار کر بیانگ دھل اعلان کرتے کہ وہ کلکتہ جا کر ہی دم لیں گے۔ ہندوستان یعنی ہندوؤں کی فوج کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتے اور ایک مسلمان سپاہی کو دس ہندوؤں کے مساوی بلکہ ان پر بھاری سمجھتے۔

ہمارے اور پوری دنیا کے سامنے تو یہی دو جنرل تھے۔ عہدے اگر چہ دونوں کے برابر مگر جنرل ٹکا خان گورنر کی حیثیت سے جنرل نیازی پر فوقیت رکھنے کے باوجود ان کے سامنے بالکل نہتے تھے۔ کیونکہ مشرق پاکستان میں متعین پوری فوج کی کمان جنرل نیازی کے ہاتھ میں تھی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ عہدے میں کوئی خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو۔ اصل طاقت اس کی ہوتی ہے، جس کے ہاتھ میں فوج کی کمان ہو اور جنرل نیازی جنرل ٹکا خان کے ساتھ وہی کچھ کر رہے تھے جو خود جنرل یحییٰ خان نے فوج کی کمان سنبھالنے کے بعد فیلڈ مارشل ایوب کے ساتھ کیا!

ادھر مشرق میں ٹکا خان اور نیازی میں باہمی چپقلش ادھر پنڈی میں یحییٰ (یعنی صدر یحییٰ خان) اور ان کے ہیڈ کوارٹر کے گنتی کے جرنیل ایک طرف اور جی ایچ کیو ایک طرف۔ ہر چند کہ جی ایچ کیو میں جنرل یحییٰ نے اپنے ہی ایک دیرینہ دوست اور معتمد خاص یعنی وہی پنڈی کلب والے جنرل حمید کو بٹھا رکھا تھا۔ وہ اچھے آدمی تھے اور ان کا شمار ایک قابل پیشہ ور جرنیل کی حیثیت سے ہوتا تھا مگر قوت فیصلہ ان کی بھی مخل نظر تھی۔ کچھ دوستی کا بھرم تھا کچھ خود ان کی کمزوری کا تقاضہ کہ وہ اپنے

ہر فیصلے سے پہلے جنرل یحییٰ کی طرف دیکھتے اور ان کی ہدایت اور حکم کے محتاج رہتے۔ پہل وہ کسی کام اور کسی طور پر بھی نہیں کر پاتے۔

ان کے بعد جن صاحب کا نام آتا تھا وہ پستہ قد مگر خاصی بھاری بھر کم شخصیت والے صاحب تھے۔ جنہیں ہم نے پہلی بار بریگیڈیئر کے عہدے میں دیکھا تھا یعنی گل حسن صاحب' گل صاحب اب بڑے جنرل تھے اور جی ایچ کیو کے اہم ترین کلیدی عہدے پر فائز۔ پوری فوج کا نظام اس کی نقل و حرکت ان کے ماتحت تھی۔ بظاہر جنرل گل حسن ایک مضبوط اور فیصلہ کن شخصیت کے مالک نظر آتے تھے مگر فیصلے کی گھڑی میں ان کے قدم بھی ڈگمگاتے شراب اور سگریٹ کے وہ بھی رسیا تھے۔ پتہ نہیں وہ کام کب اور کیا کرتے تھے۔ ہم نے تو جب بھی انہیں ان کے دفتر میں دیکھا تو یا تو پڑھنے والی عینک لگائے سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو جلدی جلدی نمٹاتے۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتے کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے یا پھر ملاقاتیوں کے درمیان' ان کے ماتحت جنرل اور بریگیڈیئر ان کے پاس آتے۔ اپنی اپنی تجاویز ان کے سامنے پیش کرتے۔ وہ صرف ہاں اور نا میں جواب دے دیتے۔ وہ ذہین تھے مگر بات کو سمجھ کر اور اسے ٹھوک بجا کر دیکھنے کی بجائے سنی اَن سنی کر کے اسے ٹال دیتے۔

معلوم ہوا کہ جنرل گل حسن اور جنرل یحییٰ میں تو عملاً بات چیت بھی نہیں اور جنرل حمید سے بھی ان کے تعلقات کی نوعیت بیشتر سرکاری اور رسمی نوعیت کی تھی۔ دفتری اوقات کے دوران ایک دو بار مل گئے اور بس۔ جس فوج کی اعلیٰ کمان میں اس طرح کا باہمی فاصلہ ہو' اس قسم کی اجنبیت سو باقی فوج کا حال اس سے کیا بہتر ہوگا اور وہ بھی آزمائش کی اس کڑی گھڑی میں جب ملک خطرناک سنگین خانہ جنگی کے علاوہ ہندوستان کے ساتھ ایک بڑی اور فیصلہ کن جنگ کی طرف کشاں کشاں بڑھا جا رہا تھا۔

ادھر ہندوستان میں جنگی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ادھر پاکستان میں خانہ جنگی اتنی زور پکڑ چکی تھی کہ اب فوج کے ہاتھ سے بھی نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان میں اپنی مدت ملازمت پوری کر کے راولپنڈی واپس آ چکے تھے۔ جنرل یحییٰ' جنرل حمید' جنرل گل حسن خبر نہیں خوش فہمی کی کس دنیا میں کھوئے ہوئے تھے جو اتنی خرابی کے باوجود وہ اپنی جگہ پر مطمئن نظر

آتے تھے۔ ہم نے صرف ان جنرلوں کا نام اس لئے لیا کہ فوج اعلیٰ ترین حکمت عملی کی ذمہ داری انہیں تینوں پر عائد ہوتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی اگرچہ وہاں کی مالک سیاہ وسفید تھے مگر ہندوستان سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ انہیں تینوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ تینوں گویا دو مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کیمپ میں جنرل یحییٰ' جنرل حمید اور ان کے ساتھی اور دوسرے کیمپ میں جنرل گل حسن' بظاہر وہ اپنی جنگ اکیلے ہی لڑ رہے تھے ان کو صرف انہیں افراد کی حمایت یا ذاتی وفاداریاں حاصل تھیں جو براہ راست ان کے ماتحت تھے۔

ادھر مشرق میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کے ساتھ اور اس کے پار' بنگالی باغیوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی کمان کرنل عثمانی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حوصلے اب اتنے بڑھ چکے تھے کہ وہ سرحد پار کر کے دور تک پاکستان کے دیہاتوں اور شہروں میں گھس کر وہاں وسیع پیمانے پر ہر قسم کی تخریب کاری میں لگے تھے۔ جنرل نیازی کی فوج کا بڑا حصہ ہندوستانی فوج کے مقابلے کے لئے سرحدوں پر لگا تھا اور کرنل عثمانی (جواب شاید جنرل عثمانی بن گئے تھے) کے باغی سپاہی اور شہری ڈھاکہ تک پہنچ کر وہاں کے امن وامان کو تہہ وبالا کر رہے تھے اور جنرل نیازی گھٹنوں پر ہاتھ مار مار کر ہندو فوج کو سبق پڑھانے کا اعلان کرتے رہے۔

ادھر مغربی پاکستان میں فوج کو سرحدوں پر اپنی جنگی چوکیاں اور خندقیں مستحکم کرنے کے بعد جنرل یحییٰ اور ان کے جرنیل اپنی اپنی جگہ انتہائی مطمئن ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ نوبت بانیجا رسید کہ ہندوستانی افواج نے کھلے بندوں مشرقی پاکستان پر کئی طرف سے ہلہ بول دیا۔ مگر مغربی پاکستان میں بیٹھی پاکستان کی اعلیٰ کمان کے کان پر بھی جوں تک نہ رینگی اور ان کی عیش وعشرت کی زندگی میں ذرا بھی فرق آتا نظر نہیں آتا۔ خدا معلوم وہ خوابوں میں کس حسین دنیا میں کھو چکے تھے کہ نوشتہ دیوار کی سرخی بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو کر رہ گئی تھی۔ اب حالت یہ ہوئی کہ مشرق میں ہندوستان کی طرف سے رزم اور مغرب میں گویا جرنیلوں کی بزم!

اس کے بعد حالات بہت تیزی سے پاکستان کے حق میں بگڑنے لگے۔ مشرق میں ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی جاری تھی اور مغرب میں پاکستان فوج کی اعلیٰ کمان شاید کسی معجزے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں۔ فوج سرحد پر تیار کھڑی تھی مگر جہاں کی تہاں' ہلے بغیر' ہماری

نگاہیں مشرق اور مغرب دونوں جانب تھیں۔ایک طرف غنیم کی برق رفتار پیش قدمی دوسری طرف انتظار کی طوالت۔ بالآخر پاکستان افواج بھی حرکت میں آئیں۔ دریا پار انہوں نے ہندوستان کے کچھ علاقے پر قبضہ بھی کرلیا۔مگر پھر وہیں تھم گئیں۔ سننے میں تو یہی آیا تھا کہ مشرق کی لڑائی کا فیصلہ مغرب میں ہوگا۔مگر ہوا اس کے بالکل برعکس۔یعنی مشرق میں تو ہندوستان فوج کے آگے بڑھتے بڑھتے ڈھاکہ کے دروازے تک پہنچ گئیں۔جبکہ مغرب میں پاکستانی افواج ابتدائی پیش قدمی کے بعد چھوٹی چھوٹی کارروائیوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں کرسکیں۔

مغربی پاکستان کے عوام بڑی فوجی کامیابی کے انتظار میں بے تاب تھے۔مگر اِدھر وہ اس انتظار میں رہے اُدھر ہندوستانی افواج ڈھاکہ سے صرف چندکوس کے فاصلے پر رہ گئیں۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کی ساری شیخی اور لاف زنی دھری کی دھری رہ گئی۔ ہندوستانی فوج کی پیش قدمی کے آگے ان کا دل اور دماغ دونوں جیسے شل ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ہندوستانی افواج فتح کی جھنڈے لہراتی ڈھاکہ میں داخل ہوگئیں۔ جنرل نیازی نے ان کے اعلیٰ کمانڈر کا استقبال کیا اور پھر ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مشرقی پاکستان میں حکمران پاکستان فوج ہندوستان کی قید میں آگئی۔مشرقی پاکستان ختم ہوا۔ بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا۔اس طرح ربع صدی سے بھی کم مدت میں سرزمین ہند چار بار تقسیم ہوئی۔ پہلے مرحلے میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم۔ پھر اس کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم اور اب پاکستان کی تقسیم یعنی تقسیم در تقسیم۔سرزمین ہند اہل ہند سے اپنا انتقام لے رہی تھی۔اولیاء کرام کا کہا نقش کالحجر ہوکر سامنے آرہا تھا۔تقسیم کے جس عمل کو تعمیر سمجھا تھا محض فریب نظر نکلا۔

گیارہواں باب

قلعہ معلیٰ' دیوان خاص

''سامعین گراں قدر

آپ کی خدمت اقدس میں اس بندہ عاجز کا سلام پہنچے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں' بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

''آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔ بھلا کہاں میں جلاوطن' راندہ درگاہ' نام کا بادشاہ اور کہاں یہ اجتماع نُور و ظہور۔ ہمارے پیرومرشد حضرت نظام الدین اپنے ہمدم دیرینہ اور ہم نشین امیر خسرو کے ساتھ تشریف فرما ہیں جو اس کل کارروائی کے محرک ہیں ان کے شانہ بشانہ حضرت علی ہجویری ہیں۔ شیخ احمد سرھندی' بوعلی قلندر' قطب الدین بختیار کاکی' خواجہ فرید گنج شکر' عثمان مروندی' شاہ عبداللطیف بھٹائی' نصیر الدین چراغ دہلی' بری شاہ عبداللطیف' خواجہ باقی باللہ' خواجہ سلیم چشتی' خواجہ معین الدین چشتی' شاہ جلال' مادھو لال حسین' سلطان باہوؒ سائیں بُلّھے شاہ الحمداللہ سب ہی تشریف فرما ہیں۔ نشست میں درجات کا ہرگز کوئی امتیاز نہیں۔ بس جس ترتیب سے آپ تشریف لائے اس ترتیب سے تشریف فرما ہوئے۔ ان کے درجات کا واحد پیمانہ ان کی ریاضت' تقویٰ ٹھہرا بلکہ اس سے بھی سوا' معرفت حق اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ان کی قربت جس کا دنیاوی جاہ وحشمت اور مراتب عالیہ کے باب میں کوئی نعم البدل نہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

''اس اجتماع انوار میں ایسی چند عظیم شخصیات بھی شامل ہیں جو اس عاجز کی درخواست پر بطور خاص تشریف لائے ہیں اور میں ان کے سامنے ہاتھ باندھے اور نگاہیں جھکائے کھڑا ہوں کہ بجز اس کے میں کس طرح اور کس زبان سے ان کا شکریہ ادا کرسکتا ہوں۔ جو الفاظ زبان تک آتے ہیں ان میں دنیاداری اور گستاخی کا ایسا شائبہ ہوتا ہے کہ وہیں نوک زبان پر آ کر رک جاتے ہیں۔

''ان مقدس اور ہندوستانی تہذیب' تمدن اور مذہبی رواداری کی محافظ ہستیوں میں بھگت کبیر' راجہ بھرت ہری' میرابائی' بابا گورو نانک اور انکے ہمعصر اور ہمسایہ حضرت ولی قندھاری بھی شامل ہیں۔

''حضرت ولی قندھاری کا اسم گرامی سنکر ہوسکتا ہے آپ کچھ چونک سے پڑیں کہ ہر چند کہ ان کا شمار اپنے عہد اور مسلک کی جید ہستیوں میں ہوتا ہے۔ مگر تہذیب وتمدن کے باب سے انکا براہ راست کوئی گہرا تعلق نہیں۔ البتہ مذہب کی ذیل میں جس طرح شدید کشیدگی کے باوجود کمال رواداری اور صلح کل کا طویل سفر انہوں نے بابا گورو نانک کے شانہ بشانہ طے کیا۔ حتیٰ کہ اپنی منزل مقصود کو پالیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس کے بغیر تہذیب وتمدن کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔

''ان مقدس ہستیوں کے علاوہ ہم نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ اس اجتماع عظمت ونور میں ہم ان ہستیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیں جو اُس پورے عمل کے سرخیل اور کرتا دھرتا تھے' جو انجام کار ہندوستان کی تقسیم پر ختم ہوا۔ لہذا ہم نے مہاتما گاندھی' محترم محمد علی جناح۔ محترم جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے دست بستہ درخواست کی کہ وہ ہماری دعوت اور درخواست کو شرف قبولیت عطا فرمائیں۔ اور آج کی اس تقریب میں بنفس نفیس تشریف لائیں اور اپنے اور اپنے سیاسی کردار کے متعلق اگر کچھ فرمانا چاہیں تو بلاتکلف مرحمت فرمائیں۔ اپنی رضا اور منشا کے مطابق کہنے یا نہ کہنے پر ہرگز کوئی پابندی نہیں۔ اور وہ سب اس وقت ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں۔''

ان افتتاحی کلمات۔ کے بعد میں نے ذرا توقف کیا ہی تھا کہ اجتماع میں شرکت فرما تمام حضرات ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے باری باری بابا گورو نانک' بھگت کبیر' مہاتما گاندھی' محمد علی

جناح، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے مصافحہ اور معانقہ کیا میرا بائی کونے میں کھڑی۔ اپنے ساز، غالباً ایک تارہ، کے بغیر بالکل ادھوری، ادھوری معلوم ہورہی تھیں۔ میں چبوترے سے نیچے آیا اور خاصی جھجک کے باوجود اپنے حقِ شاہانہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنے ساتھ چبوترے پر لے آیا۔ انہوں نے سب کو پرنام کیا اور پھر بلا تاخیر وہیں ایک کونے میں جا کر کھڑی ہوگئیں۔ اس کے بعد ابھی ہم اپنی نشست پر جا کر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ہمارے پیرو مرشد نظام الدین کھڑے ہوئے۔ آداب سلام کے بعد انہوں نے شرکاء کو مخاطب کر کے فرمایا ''سراج الدین بہادر شاہ ظفر اپنا خطاب جاری رکھیں گے۔ اور ان تجربات اور مشاہدات نیز ان نتائج کا جو انہوں نے اپنی روحانی سفر کے دوران اخذ کئے، مختصر جائزہ پیش کریں گے'' پھر وہ واپسی اپنی نشست پر چلے گئے۔ میں نے شرکاء سے اجازت خطاب مانگی۔

''بسم اللہ'' حضرت علی ہجویری نے فرمایا اور میں نے بلا تاخیر گفتگو کا آغاز ان الفاظ میں کیا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

رب العزت کی عنایت فراواں اور آپ سب کی ہدایت اور دعاؤں کے طفیل اس ربع صدی میں نے وہ کچھ دیکھا، پرکھا اور حسب المقدور کیا جو شاہی، خواہ برائے نام سہی، میں بھی نہ کر پایا بلکہ میرے اجداد محترم بھی نہ کر پائے۔ میرے پیرو مرشد حضرت نظام الدین کا فرمان تھا کہ سراج الدین تم نے شاہی میں تو فقیری کی اب فقیری میں شاہی کر کے دکھاؤ کہ عالم ارواح میں یہی تمہارا منصب اور اولین فرض ہے۔

''اپنے پہلے ہی اجلاس میں آپ نے مجموعی طور پر جن خدشات کا اظہار کیا تھا اور جن خطرات کی نشاندہی کی تھی وہ سب کے سب بعینہٖ ظاہر ہوکر سامنے آ گئے۔ روز روز کے خون خرابے کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین تین بار باقاعدہ جنگ چھڑی۔ پہلی جنگ کے نتیجے میں کشمیر تقسیم ہوا۔ دوسری جنگ کے بعد پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصے ایک دوسرے سے گریزاں اور دور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ تیسری اور ابھی تک آخری جنگ کے بعد خود پاکستان تقسیم ہوگیا اس طرح آپس کی بھڑاس نکالنے کے ساتھ ساتھ تقسیم در تقسیم در تقسیم کے جس خطرے کی نشاندہی

کی گئی تھی وہ ہو بہو حقیقت کا روپ دھار کر دنیا کے سامنے آ گیا۔

''انتہائی دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جان اور مال کے اس عظیم نقصان کے باوجود جو دونوں ہمسایہ ملکوں کو پے در پے جنگ کے نتیجے میں بھگتنا پڑا وہ ابھی تک نہ صرف ایک دوسرے کے درپہ آزار ہیں بلکہ پھر آمادہ بجنگ۔ دونوں طرف افواج کا بول بالا ہے بلکہ پاکستان میں تو حکومت پر بھی فوج ہی قابض ہے دونوں طرف افواج کو کیل کانٹے سے لیس کیا جا رہا ہے۔

''شنید یہ بھی ہے' اور اس کی تصدیق اخبارات کی بڑی جلی سرخیوں سے ہوتی ہے کہ دونوں ممالک نے ایک ایسا گولہ ایجاد کر لیا ہے جو آناً فاناً میں پورے کے پورے شہروں کو جلا کر خاکستر بنا سکتا ہے اور ان کی آبادی کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ آئے دن یہ ایک دوسرے کو اس کے استعمال کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ باری تعالیٰ ان پر اور ان سے بھی کہیں زیادہ ان کی رعایا کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔

''جہاں تک تہذیب اور تمدن کے تحفظ اور روحانی رشتوں کی بقا کا تعلق ہے سو ان کی نسبت اس سرزمین سے آج بھی اس طرح ہے جو تقسیم سے پہلے تھی۔ قلعہ معلی' قطب مینار' تاج محل' قلعہ لاہور اور شاہی مسجد آج بھی اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ مقدس درگاہیں اور مزار آج بھی اسی طرح مرجع خلائق ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ۔

''ہمارے اپنے خیال میں ہندوستانی تہذیب ایک ایسی جامع حقیقت ہے جس کی جان' جس کی روح کو ہرگز مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وقت کے ساتھ اس کی صورت اور ہیئت جس طرح سدا سے بدلتی چلی آ رہی ہے اس طرح آئندہ بھی بدلتی رہے گی۔

تبدیلی کے اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا اور نہ اسے روکنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ اس باب میں ہر سعی نہ صرف سعی لاحاصل ہوگی بلکہ اس عمل کی بھی ضد جس کی خود فطرت اور قدرت متقاضی ہے بقول ہمارے دوست اور ہم عصر مرزا نوشہ

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

''ہماری بڑی خواہش اور کوشش تھی کہ مرزا نوشہ آج یہاں بنفس نفیس تشریف لائیں۔ مگر وہ کسی طور نہ مانے۔ فرمایا:'' صاحب عالم وشاہاں بشاہاں بدھند' تم اپنی جگہ بادشاہ اور اجلاس میں شریک ہونے والے بزرگ اور اللہ کے نیک بندے اپنی جگہ بادشاہ ادھر میں حقیر فقیر عاصی گنہگار کہاں وہ اور کہاں میں' صاحب عالم مجھے تو آپ بس میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

نے تیر کمان میں ہے نہ صیاد کمین میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

''مرزا نے جو کچھ کہنا تھا سو کہہ دیا۔ اس کے بعد ان سے الجھنا بیکار تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔ اشارے سے آداب کیا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

''میری اپنی ناچیز رائے میں جب تک دیوان غالب اور کلیات میر اور دوسرے اساتذہ کا کلام باقی ہے ہندوستانی تہذیب کی روح کو کوئی مسخ نہیں کر سکتا۔ قلعہ معلیٰ اور تاج محل مرور ایام کے ساتھ شکست و ریخت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ بھونچال کے ایک ہی سخت جھٹکے سے زمین بوس ہو سکتے ہیں۔ مگر اساتذہ کی نگارشات صرف اس وقت ختم ہوں گی جب اہل ہند دیوانگی کی اس منزل پر پہنچیں گے جب اجتماعی خودکشی ہی میں انہیں امید کی آخری کرن نظر آئے گی اور انشاءاللہ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔

''جہاں تک اساتذہ کی نگارشات ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی بقاء کی ضامن ہیں وہاں آپ بزرگوں کے آستانے اور درگاہیں اور مزار شریف خود سرزمین ہند کی بقا کے محافظ ہیں۔ ان کی حیثیت گویا ان میخوں کی ہے جنہیں نکالنے کے بعد ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب کا پورا گھروندہ زمین بوس ہو کر رہ جائے گا۔ آپ کو ہر زمانے میں غیب سے حیات نو ملتی چلی آئی ہے اور ملتی رہے گی انشاءاللہ۔

''زمین ہوگی تو تہذیب کی بات ہوگی۔ درخت ہوگا تو آشیانے کا ذکر ہوگا۔ اگر خود درخت ہی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے تو پھر آشیانہ کا ذکر ہی کیا۔

''انگریز کے زمانے میں اور آج بھی مٹھی بھر ہندوستانیوں نے لاکھ سر مارا کہ وہ انگریزی تعلیم

اور تہذیب کے راستے انگریز کے برابر ہو جائیں مگر انگریز نے انہیں بڑی بڑی آسامیوں پر فائز کر کے اور اپنی ماتحتی میں اعلیٰ اختیارات دے کر صرف یہ ثابت کیا کہ وہ ان کے ساتھ دفاتر میں اٹھ بیٹھ تو سکتے ہیں مگر روزمرہ کی زندگی میں ان کی برابری نہیں کر سکتے وہ لاکھ انگریزی بولیں۔ بھلے انگریزوں سے بھی اچھی' لاکھ ان کا لباس پہنیں اور ان کی طرز زندگی کو اپنائیں مگر وہ رہیں گے ہندوستانی کے ہندوستانی' محکوم کے محکوم۔

''اور پھر واقعی ایک وقت ایسا آیا کہ خود ہندوستانیوں کو شدید احساس ہوا کہ وہ انگریز کی نقل سے انگریز نہیں بن سکتے۔ لہٰذا انہوں نے خود اپنی تہذیب' اپنے تمدن' اپنے وطن کی طرف مراجعت کی۔ بھلے انگریزی زبان وادب کو نہیں چھوڑا اور کسی حد تک روزمرہ کی زندگی میں ان کے لباس کی افادیت کے پیش نظر اسے اپنا لیا کہ یہ تو سدا ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔

''خود ہمارے اجداد بھی ہندوستان میں انگرکھا' شیروانی اور تنگ پائجامہ پہن کر تھوڑا آئے تھے۔ مگر یہاں آ کر یہیں کے دھوتی کرتے میں مناسب ترمیم کر کے اپنا جدی' پدری لباس چھوڑ کر اسے اپنا لیا' کہ حالات اور موسم کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ جس قسم کا دفتری کام فی زمانہ ہوتا ہے اور آئندہ بھی کم وبیش اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس میں انگریزی کوٹ پتلون' انگرکھے اور شیروانی سے کہیں زیادہ بہتر اور کام کی ہے۔

''تاہم اب عوام وخواص کی ذہنیت میں پہلے کے مقابلے میں زمین وآسمان کا فرق آ گیا ہے۔ اب اہل ہند خود کو ذہنی طور پر انگریزی نہیں سمجھتے بلکہ بہت بڑی حد تک دیسی ہو چکے ہیں اور آئندہ اور زیادہ ہوں گے۔

''اب رہا تقسیم کا سو آپ کے ارشادات کے مطابق جو خط بلکہ خطوط تقسیم نقشے پر کھینچے جا چکے ہیں انہیں اپنی جگہ چھوڑنا ہی مناسب ہوگا۔ بھارت والے اپنے بھارت میں' پاکستان والے اپنے پاکستان میں اور بنگالی اپنے بنگلہ دیش میں اپنی اپنی جگہ خوش ہیں تو ہم ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے والے کون ہوتے ہیں۔ ہماری تو خدائے بزرگ و برتر سے یہی دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں خوش رہیں شاد وآباد رہیں' آمین۔

''ہمیں اپنے تئیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ آخر تقسیم کی نوبت آئی ہی کیوں' وہ کونسے ایسے عوامل اور محرکات تھے جو اس عمل کے پیچھے کارفرما تھے۔ اس میں خود انگریز کی کونسی شاطرانہ چالیں تھیں اور خود ہندی قیادت کی کونسی کونسی حماقتیں' کوتاہیاں اور کمزوریاں اسی باعث میں نے ان چار محترم شخصیات سے درخواست کی کہ وہ یہاں خود تشریف لائیں اور اگر مناسب سمجھیں تو ان حالات کا جائزہ لیں جن کے باعث تقسیم ہند ناگزیر ہو کر رہ گئی۔

''برسہا برس کی ہمسائیگی اور رفاقت کے بعد وہ کونسی طاقت تھی جس نے ہمسایہ کو ہمسائے اور بھائی کو بھائی سے دست بگریباں کر کے انہیں ایک دوسرے سے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ گاندھی جی' محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے ہوتے ہوئے آخر ایسی کونسی بپتا پڑی تھی کہ ایک دوسرے کی صورت تک سے بیزار ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے علامہ اقبال نے اپنا مشہور ترانہ ہندی لکھا 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' اس کی بازگشت ہم نے بارہا دوران سفر سنی۔ تعجب ہے کہ ہر چند کہ پاکستان میں علامہ کا نام خالق پاکستان محمد علی جناح (قائداعظم) کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے مگر ان کا لکھا ہوا ترانہ ہندی گویا پاکستان میں ممنوع ہے۔ کم از کم ہم نے تو اس کی بازگشت وہاں کہیں نہیں سنی۔ جبکہ ہندوستان میں کوئی تقریب بھی ترانہ ہندی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

''گاندھی جی تاریخ کے ہر مرحلہ اور ہر مقام پر ہندو۔مسلم بھائی بھائی کا درس دیتے رہے محمد علی جناح کا شمار ایک زمانے تک سب سے بڑے ہندوستانی قوم پرست اور ہندو مسلم اتحاد کے پرجوش حامیوں میں سے ہوتا رہا۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ گاندھی جی نے اپنے متحدہ ہندوستان کے خواب کو ہی سرے سے خیرباد کہہ دیا اور جناح صاحب نے پاکستان بنا کر ہی دم لیا اور جواہر لال' جناح صاحب سے اتنے خفا ہو گئے کہ ان سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں رہے۔ ایک رہ گئے مولانا آزاد' سو صاحب یہ نہ ہیوں میں نہ شیعوں میں۔ ہندوؤں کے نزدیک مسلمان اور مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ ہندو نہیں پھر بھی ہندوؤں کے طرفدار' میں آپ سب کی اجازت سے ان سب حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ آئیں اور ہمیں سمجھائیں کہ آخر یہ رائی کا پہاڑ بنا تو کیسے...'

میں ابھی بول رہا تھا کہ میرے بالکل سامنے مادھولال حسین' شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بلھے شاہ

کھڑے نظر آئے۔ مادھولال حسین نے باآواز بلند مادھولال کا نام لیا اس کی کئی بار تکرار کی اور پھر اسکے ساتھ حسین کو جوڑ کر مادھولال حسین، مادھولال حسین کی اسی طرح تکرار کی ''ادھر راوی ادھر گومتی، دونوں ایک، دونوں میں پانی، پانی میں آگ، آگ میں پانی، میں بھی فانی تو بھی فانی، عشق لافانی، عشق، عشق عشق...''

پھر ایکدم سے انہوں نے اپنا لہجہ بدلا۔ لہجہ میں انتہائی نرمی آ گئی۔ یوں لگا جیسے بے ہوشی سے ہوش میں آ رہے ہوں۔ پھر فرمایا ''عشق کی انتہا وصل نہیں، جذب ہے ایسا جذب کہ فریقین کا فرق اور امتیاز ختم ہو کر رہ جائے۔ مادھولال حسین، سالک رام، مہتاب چند اور آفتاب پرشاد میں بھلا فرق ہی کیا ہے...''

پھر وہ اچانک جیسے حال سے بے حال ہوئے اور چکرا کر وہیں گویا ڈھیر ہو گئے اس کے بعد سائیں بلھے شاہ نے اپنی مشہور کافی پڑھی

رانجھا، رانجھا کردی ہن میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ میں رانجھے وچ غیر خیال نہ کوئی...

اس کیفیت میں پہنچ کر دوئی کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور ہر طرف ایک ہی قادر کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں مالکِ کُل کے عشق کے رنگ میں اس طرح رنگ گیا ہوں کہ خودی کا احساس بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اب مجھے کل عالم میں محبوب کا ہی جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

سائیں بلھے شاہ کی کافی کا میں نے اردو ترجمہ کیا کہ میں خود بھی کبھی کبھار پنجابی میں کہہ لیا کرتا تھا سامعین نے سائیں بلھے شاہ کو کھل کر داد دی۔ حضرت نظام الدین اور خسرو اس پر خوش معلوم ہوتے تھے۔ مگر حضرت علی ہجویری اور شیخ احمد سرہندی بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

اس کے بعد میں نے بھٹائی کے شاہ عبداللطیف سے کچھ فرمانے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب پورے سندھ کے گویا بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کا عارفانہ کلام اور کافیاں آج بھی زبان زد خلائق تھیں شاہ صاحب کی منکسر المزاجی اور بندہ پروری ضرب المثل تھی۔ انہوں نے میری طرف

شفقت اور محبت سے لبریز نظروں سے دیکھا اور پھر بغیر کسی حجت کے اپنا عارفانہ کلام پیش کیا۔

ہماری اپنی بدقسمتی کہ شاہ صاحب کی زبان ہمارے لئے بالکل غیر تھی اور شاہ صاحب کو بھی یقینا اس کا احساس تھا۔لہذا انہوں نے اپنے کلام کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کیا:

''آدمی آدمی کو قتل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے تو آدمی آدمی کو پیار کرتا تھا۔
اب کیا ہو گیا ہے ایک دوسرے کا دشمن بن گیا ہے۔'' واہ واہ سبحان اللہ شاہ
صاحب نے تو واقعی دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور انسان دوستی کا وہ فریضہ
جو ہمارے سپرد کیا گیا تھا اسکی مکمل ترجمانی کی۔

جیسے ہی شاہ صاحب تشریف فرما ہوئے میں نے سلطان باہو کی طرف دیکھا اور ان سے کچھ کہنے کی درخواست کی' انتہائی سادگی کے ساتھ ساتھ ان کا کلام ایک ایسے تیکھے پن' ایک ایسی انقلابی ذہنیت کا حامل تھا جس کا تعلق درپیش حالات سے کہیں زیادہ صرف شاعر کی اپنی جرات طبع اور قوت تخلیق پر ہوتا ہے ان کا کلام مذہبی تعصب سے بالکل پاک تھا وہ مندر اور مسجد کو بیک وقت خانہ خدا سمجھتے خدا کا جلوہ مندر اور مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا پر محیط ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بصیرت اور احساس کی دولت سے مالا مال کیا ہو وہ اسے ہر جگہ پا سکتا ہے ان کے دوھے ان کی دلی کیفیت کے پوری طرح آئینہ دار تھے:

ناں میں عالم ناں میں فاضل نا مفتی نا قاضی ہُو
ناں دل میرا دوزخ منگے ناشوق بہشتیں راضی ہُو
ناں تریہے روزے رکھے ناں میں پاک نمازی ہُو
باجھ وصال اللہ دے باھو دنیا کوڑی بازی ہُو

بابا بلھے شاہ کے بعد میں نے بھگت کبیر کی طرف رخ کیا اور ان سے کچھ فرمانے کی درخواست کی۔ بھگت کبیر واقعی ہندو مسلم اتحاد کا گویا سنگم تھے۔کوئی انہیں ہندو مانتا کوئی مسلمان' مگر دراصل وہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان صرف اور صرف انسان تھے میری درخواست پر انہوں نے اپنے کئی دوہے سنائے۔ ان میں سے اکثر تو ہمارے سر سے گزر گئے۔مگر کچھ ہماری سمجھ میں آئے۔ان میں کم از کم

دو اپنی سادگی اور پرکاری میں لاجواب تھے۔ ایک ان کا وہی مشہور دوہا۔

کبیرا کھڑا بجار میں مانگے سب کی خیر
ناکو ہو سے دوستی ناکو ہو سے بیر

اور دوسرا:

لال مورے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں چلی میں بھی ہوئے گئی لال

اس کے بعد ہم نے حضرت نظام الدین کی طرف نگاہ کی اور انہیں انتہائی عاجزی سے کرسی صدارت سنبھالنے کی درخواست کی، عرض کی کہ "حضور اس بندہ عاجز کو جو کہنا تھا کہہ گزرا اب آپ تشریف لائیں اور اجلاس کی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔" ازراہ کمال عنایت حضرت فوراً ہی کھڑے ہو گئے اور مسکرا کر فرمایا:

"صاحب عالم آپ اس وقت بھی ہم پر چوٹ کئے بغیر نہیں رہے۔ معلوم ہے آپ کی اس فرمائش بلکہ فرمان کا مطلب کیا ہے یعنی آپ راجا اور ہم پرجا اور پرجا کو جو کچھ بھی کہنا ہو بادشاہ کے بعد۔ بہر حال ہمیں یہ فرق مراتب نہ صرف منظور ہے بلکہ بے حد پسند خاطر بھی کہ بالآخر آپ اس مقام تک پہنچ گئے جو ہر لحاظ سے آپ کا تھا اور جہاں سے فرنگی نے آپ کو زبردستی نہ صرف معزول کیا بلکہ جلاوطن بھی۔

"تاریخ کی یہی وہ ناقابل تنسیخ حقیقت ہے جس نے ہمیں اس پر آمادہ کیا کہ ہم آپ کے پاس جائیں اور آپ کو آپ کے موروثی مقام کی بازیابی کیلئے آمادہ کریں۔ الحمد للہ آپ اپنے امتحان میں پورے اترے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی صرف وہ کر سکتا ہے جو شاہوں کا شاہ ہونے کے باوجود الفقر فخری کا قائل اور اہل ہو۔ گذشتہ برسوں میں آپ جن مشاہدات اور تجربات سے گزرے ہیں اور اس ضمن میں آپ نے جو سوچا اور کیا ہے اس کے بعد ہندوستانی تہذیب کا وہ سرمایہ اور روحانی تسلسل جو تباہی بلکہ خاتمے کی حد تک پہنچ گیا تھا اب بڑی حد تک محفوظ ہو گیا ہے۔ تقاضہ وقت اور تغیر کی قوت اپنی جگہ ہیں۔ ان کے سامنے بند

باندھنا نہ ممکن ہوگا نہ مناسب۔ آنے والی زندگی نئے سانچوں میں ڈھلے گی۔ مگر تہذیب کی اقدار اعلیٰ کی جڑیں اس زمین ہند ہی میں پیوستہ رہیں گی اور وہیں پھلتی پھولتی رہیں گی ... ''

پھر وہ اچانک خاموش ہو گئے اور ان کے چہرے پر گہرے سوچ وفکر کے آثار نمایاں ہوئے انہوں نے شرکائے مجلس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر ان کی نگاہیں جیسے ڈھونڈتی ڈھونڈتی مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے دوچار ہوئیں اور وہیں ذرا کی ذرا جم کر رہ گئیں۔ پھر انہوں نے وہاں سے نگاہیں اٹھائیں اور اپنے خطاب کا دوبارہ آغاز کیا۔

''بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ سرزمین ہند پر جو گزری سو گزری۔ اس کے سینے پر تقسیم در تقسیم کے جو ہل چلے سو اپنی جگہ مگر اس کے بعد مذہب کے نام پر جس طرح اس سرزمین پر بسنے والوں نے ایک دوسرے کو تہ تیغ کیا ایک دوسرے کے کلیجے چھلنی کئے وہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا المناک باب ہے جسے لاکھ بھلاؤ پر بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس نے باہمی رواداری، باہمی برداشت اور بھائی چارے کی اس طویل روایت کو ختم کر کے رکھ دیا جو ہندو۔ مسلم تاریخ کے بدترین دور میں بھی کسی نہ کسی صورت، کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی اور ہماری کم وبیش ہزار سالہ بقاء باہمی کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

''مذہب کو تقسیم ہند کا واحد جواز قرار دیا گیا۔ ہندو کا مت اور مسلمان کا مذہب اور اس ناقابل تردید حقیقت سے تو بھلا پہلے بھی کسے انکار تھا۔ مسلمانوں کا کعبہ شریف، ہندو کی مقدس کاشی دونوں کا مقام اپنی اپنی جگہ علیحدہ اور منفرد مگر اپنی اپنی جگہ دونوں ہی لائق احترام و پرستش، ایک کا بھگوان، صنم کدہ میں دوسرے کا خدا، مسجد میں مگر دل کے آئینے میں اللہ اور بھگوان ایک ہی ذات کے دو پرتو ایک ہی حقیقت کی دو پرچھائیں ہیں۔

''دنیا بھر میں یہ شرف صرف ہندوستان کی سرزمین ہی کو حاصل تھا کہ مذہبی فرق اور امتیاز کے باوجود سرزمین ہند اگر کاملاً نہیں تو پھر بھی بہت بڑی حد تک مذہب یا عقیدت کی بنیاد پر اس باہمی منافرت اور تعصب سے پاک رہی جو دنیا کے اور حصوں میں پائے گئے اور جن کی تاریخ نشاندہی کرتی ہے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا کہ ادھر آزادی ملی اور ادھر اہل ہند کا ایک بڑا طبقہ گویا مادر پدر

آزاد ہو کر رہ گیا۔ برسہا برس سے ایک ہی شہر' ایک ہی محلے' ایک ہی پڑوس کے مکین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ محض اس لئے کہ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان جس شہر اور محلے میں ہندو کی اکثریت وہاں مسلمان کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ جہاں مسلمان کا پلڑہ بھاری وہاں ہندو کا خون ارزاں ہوا۔ صاحبو! یہ کس قسم کی دیوانگی ہے کیا اس دیوانگی اور پاگل پن کا نام آزادی ہے۔ معاذ اللہ!

''ایک طرفہ تماشہ یہ تھا کہ جس جدوجہد کو جنگ آزادی کا نام دیا گیا۔ اسے تقسیم کے لئے لڑا گیا اور انجام تک پہنچایا گیا۔ بھلا یہ کیسی جنگ آزادی تھی کہ بٹوارے کو جس کی پہلی اور آخری شرط ٹھہرایا گیا۔ ان صاحبان اعلیٰ مقام سے جا کر کوئی پوچھے کہ حضور آپ جنہیں جنگ آزادی کے سپہ سالار کی حیثیت حاصل تھی جو جدوجہد آزادی کے سرخیل تھے۔ ذرا یہ تو فرمائیں کہ ملک کی شکست و ریخت اور پامالی تو اس دشمن کا کام ہے جو جنگ میں فتح پائے اور دوسرے کے ملک پر قابض ہو جانے کے بعد اس کا جو بھی حشر کرنا چاہے کرے مگر آپ کا تو گویا ہر انداز نرالا ہے کہ جنگ آزادی میں فتح کے جلو میں آپ نے خود اپنے ہاتھوں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے اور اس کی اس تاریخی وحدت کو ایک طویل عرصے کیلئے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا جو مذاہب اور رسوم کے باہمی امتیاز کے باوجود ہر صورت صدہا سال قائم رہی۔

''نیز ان صاحبان سے یہ پوچھا جائے کہ جب مذہب کی بنیاد پر بٹوارہ ہو گیا تو پھر اس تاریخی ورثہ پر کسی کا دعویٰ جھوٹا اور کس کا سچا رہا جو آدھا سرحد کے اس پار اور آدھا اس پار۔ تاج محل اور قلعہ معلیٰ کس کے کھاتے میں آئے اور ٹیکسلا کے قدیم شہر کے آثار کس کے کھاتے میں۔ ہماری درگاہ کسی کی جاگیر ہوئی اور سید علی ہجویری کی کن کے نام۔ خواجہ فرید کا نام کس کے قبالے میں لکھا گیا اور قطب الدین بختیاری کاکی کا کس کے۔ اجمیر والے خواجہ کدھر گئے اور فتح پور سیکری والے کدھر۔ سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائی کدھر کے کہلائے جائیں' سندھ کے یا سرزمین ہند کے۔ سندھ جو باب الاسلام ہے اس پر کیا صرف پاکستانی مسلمانوں کا حق ہے اور دوسرے اس سے محروم ہیں۔ اسی سندھ کے عثمان مروندی جن کے فارسی کلام اور وسیع المشربی کا ایک عالم

گرویدہ ہے کیا وہ عثمان مروندی سے عثمان سندھی ہو کر رہ جائیں۔ سرہند کے شیخ احمد جن کے چشمہ معرفت سے ایک عالم سیراب ہوا کیا اب صرف سرہند کے ہو کر رہ گئے۔ پانی پت کے بوعلی قلندر جن کا آستانہ ہنوز ہندو پاکستان کے عوام کا مرجع خلائق' کیا اپنے ہم نفس سید علی ہجویری سے علیحدہ ہو کر رہ جائیں گے۔

''بظاہر ہم اس عالم ظاہر سے کب کے رخصت ہو چکے ہیں صرف ہمارے مزار باقی رہ گئے ہیں۔ مگر سرزمین کے خاص و عام ہمارے رشتے کی جو رسی بندھی وہ ہمیشہ اسی طرح بندھی رہے گی جس طرح صدہا برس سے بندھی چلتی آ رہی ہے۔ بنگال کے شاہ جلال کو دیکھیں ان کی آنکھیں آپ کو اس وقت بھی نمناک نظر آئیں گی اور دل اس عظیم صدمے سے لبریز جو انہیں اس قیامت صغریٰ کے دوران ہوا جو پاکستان کی خانہ جنگی اور ہندو پاکستان کی جنگ کے نتیجے میں ان کی سروں پر ٹوٹی اور یہ سب کچھ خود ان کے سامنے اور ان کی ابدی آرام گاہ کے گردوپیش ہوا مگر انتہائی دیوانگی کے اس عالم میں جس میں پورا پاکستان اور ہندوستان پھنس کر رہ گیا تھا۔ اور اہلِ ھند خود اللہ تبارک وتعالیٰ کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اللہ کے یہ نیک بندے ان کے حق میں دعا گو رہے۔

''ملاحظہ کریں کہ مذہب کے نام پر جنگ آزادی کو لڑا اور فتح سے ہم کنار کیا گیا۔ پھر اس مذہب کے نام پر ہندو نے مسلمان کا' مسلمان سے ہندو کا اور آگے چل کر مسلمان نے مسلمان کا گلا کاٹا۔ معاذ اللہ۔

''جو فرض ہم نے صاحب عالم بہادر شاہ ظفر کے سپرد کیا تھا اس کا مقصد اور منشا صرف یہ تھا کہ ہندی تہذیب وتمدن کی اس مقدس میراث کو محفوظ کیا جائے جو صدہا سال سے چلی آ رہی ہے اور جس کی اہمیت اس گائے کی سی ہے جس کے دو سینگوں پر پوری دنیا کی بنیاد رکھی ہے اور اس گائے اور اس کے دونوں سینگوں کو ہمیشہ بالکل ساکت رہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر یہ ذرا سی بھی ہلی اور اس کے سنگھوں میں ذرا سی بھی جنبش ہو تو پھر پوری دنیا بھونچال کی زد میں آ جائے گی۔

''آپ نے دیکھا کہ بٹوارے کے نتیجے میں ادھر تہذیب کی اس گائے نے ذرا سے سینگ ہلائے اور ادھر پوری دھرتی میں بھونچال آ گیا۔ بھونچال کی شدت اگرچہ بڑی حد تک ختم ہو چکی

ہے مگر وقفہ وقفے سے اس کے جھٹکے ابھی تک محسوس ہوئے جا رہے ہیں۔

''جیسا کہ صاحب عالم نے اپنے خطاب میں فرمایا ہے ہم تغیر اور ارتقاء کی نفی نہیں کرتے کہ یہ قدرت کا ایک ایسا تقاضہ ہے جس کے بغیر پورا ارتقائی عمل جامد اور معطل ہو کر رہ جائے گا اور وہ گھڑی اور وہ دن قیامت کا ہوگا۔ جس کا علم صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کو ہے۔

''صاحب عالم کے روحانی سفر اور اس کی روئیداد انتہائی مفید نتائج کی حامل رہی۔ اول یہ کہ ہم سرزمین ہند یعنی بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوئے۔ دوئم ہم نے یہ دیکھا کہ مذہب کو اگر سیاست کا آلہ کار بنایا جائے تو اس کے نتائج انتہائی سنگین اور دوررس ہوتے ہیں۔ عہد سلاطین کو مغلیہ کو دیکھ لیں ہزار خامیوں اور خرابیوں کے باوجود انہوں نے کبھی مذہب کو اپنے سیاسی عمل کا حربہ نہیں بنایا۔ ہندو اور مسلمان میں اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ ایک فاتح اور دوسرا مفتوح، ایک حاکم اور دوسرا محکوم، مگر نہ تو کبھی حاکم نے محکوم پر اپنا مذہب مسلط کیا نہ دوسرے امور سلطنت اور نفاذ قانون میں کوئی قابل ذکر امتیاز برتا۔ لگ بھگ ہزار سال کے اس کے اس دور میں ہندو مسلمان اچھے بھائی، بھائی کی طرح نہ رہے ہوں مگر اچھے پڑوسیوں کی حیثیت میں ان کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی رواداری اور دوستی کا رہا۔

''مگر ادھر انگریز آیا ادھر اس نے ہندو مسلمان کے بیچ نفرت کا بیج بو دیا۔ ہندو کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ان کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا بلکہ صرف اور صرف اس لئے کہ فن اور تعلیم کے میدان میں مسلمان کی اجتماعی پسماندگی کے پیش نظر ہندو کے ذہن میں تکبر کا احساس پیدا کر کے اسے مسلمان کو بہ نظر حقارت دیکھنے پر آمادہ کر دے اور انگریز ہی کی مدد اور حمایت سے مسلم اقتدار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی آرزو اور ارادہ ہندوؤں میں اجاگر کرے۔ منجملہ اور عوامل اور حقائق کے جو مغلیہ بادشاہت کے خاتمے کا سبب بنیں۔ انگریز کی پیدا کردہ ذہنیت کی یہ تبدیلی میری اپنی ناچیز رائے میں سب سے زیادہ اہم اور دوقیع ہے۔

''سوئم نتیجہ جو ہم نے صاحب عالم کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اخذ کیا وہ یہ کہ اب جب یہ دونوں پڑوسی ممالک کئی مہیب جنگوں اور دوسری محاذ آرائیوں کی شکل میں بڑی حد تک اپنے

اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے ہیں۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ جب انہیں لگام دیں' اس سے قبل کہ وہ حماقت کی اس آخری منزل کو پہنچ جائیں جس پر پہنچ کر اجتماعی خودکشی ناگزیر ہوکر رہ جاتی ہے۔ ہماری مراد انسانیت سوز' مہلک ہتھیاروں کے استعمال سے ہے جو انہوں نے بنائے ہیں اور بات بات پر جن کے استعمال کی ایک دوسرے کو دھمکی دیتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر ہندوستان تہذیب ہی نہیں بلکہ سرزمین ہندوستان سے ہاتھ دھولیں۔ تاج محل اور قطب مینار اور قلعہ معلیٰ تو خیر اگر آج نہیں تو مرورِ ایام سے کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جائیں گے البتہ اگر تہذیب ایک بار صفحہ ہستی سے مٹ گئی تو پھر اس کی بحالی ناممکن ہوگی۔ بنابریں آج کے بعد ہم سب کی یہی کوشش اور دعا ہوگی کہ روحانیت کا وہ تانا بانا جو ہندوستانی تہذیب کی جان ہے وہ نہ صرف قائم رہے بلکہ اور مضبوط ہو کہ اس کے بغیر ہندوستانی تہذیب ہی کیا بلکہ پورا ہندوستان بکھر کر رہ جائے گا۔

''چہارم نتیجہ جو ہم نے اخذ کیا وہ یہ ہے کہ وہ حضرات جو جنگ آزادی کے سرخیل تھے ان کا خلوص نیت اور وطن سے محبت میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں وہ سب آزادی کے تصور سے سرشار اور اس کے حصول کیلئے ہر قربانی پر تیار سربکف وہ اپنی منزل کی طرف پوری تیزی سے رواں دواں رہے حتیٰ کہ انہوں نے اپنی منزل کو پالیا۔

''مگر یہ منزل مقصود وہ نہ تھی جس کا خواب دیکھا گیا تھا۔ تقسیم ہند کو آزادی کی شرط اول ٹھہرا کر اور تسلیم کر کے وہ منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اصل آزادی کی منزل سے اتنے دور ہوئے کہ وہ آنکھ ہی سے اوجھل ہوکر رہ گئی اور جس نے' صاحب عالم کے خیال میں' آزادی کی اس عظیم تحریک کو اپنی صحیح سمت سے ہٹا دیا' یہ تمام حضرات خود اپنی پیرانی سالی اور بڑھتی ہوئی جسمانی تکان کے باعث حصول منزل کیلئے اتنی عجلت میں تھے کہ انہوں نے جب پورا دھن جاتے دیکھا تو آدھا لیجئے بانٹ کے مصداق جو کچھ بھی ہاتھ لگا اسے مال غنیمت سمجھ کر قبول کرلیا۔ اس قسم کی اجتماعی تحریکات میں جب اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاد کا عنصر شامل ہو جائے تو اس کی یکجہتی بکھر کر رہ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ایک عمر شانہ بشانہ چلنے والے بھی ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں۔

''پانچواں اور آخری سبق جو ہم نے سیکھا وہ یہ کہ ہندوستان کو اپنے آپے میں رہنا چاہئے

اور ہراس چیز' الاّ فن اور علم کے' جو دساور سے آئی ہو' ہر اس چیز' جو آنکھوں کو خیرہ کر دے اور دماغ پر فریفتگی کی کیفیت طاری کر دے' گریز کرنا چاہئے۔

''مثلاً دولت اور تعیش کا تعاقب' اچھی زندگی کیلئے ہرگز ضروری نہیں کہ ہم زندگی کی ہر اس روش کو آنکھوں پر پٹی باندھ کے اختیار کر لیں جو ولایت سے آئی ہو' ولایتی علم اور ولایتی مال میں بہت فرق ہے۔

''ہندوستان اپنی تاریخ کے آغاز سے عوامی سطح پر ایک غریب ملک چلا آ رہا ہے۔ اسے غریب رہنے دیں۔ البتہ ہمیں غربت اور پسماندگی میں امتیاز کرنا ہوگا۔ غربت کا مطلب ہرگز فاقہ کشی نہیں بدحالی اور محتاجی نہیں بلکہ قناعت اور توکل ہے تونگری قاروں کی طرح سونا' چاندی اور ہیروں کا ذخیرہ کرنا نہیں بلکہ گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیٹ پالنے' جسم ڈھانپنے اور سر چھپانے کا نام ہے باقی سب ہیرا پھیری ہے۔ یعنی

تونگری بدل است نہ بمال

''غربت کا جو تصور اولیاء کرام نے دیا ہے وہی تہذیب ہند کی روح اور جان ہے یعنی محتاجی کے مقابلے میں فقیری' الفقر فخری' اسکے برعکس مال و جان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا نام' انسان اور انسانیت کی دلیل نہیں کھلی تذلیل ہے۔ سبقت کی دوڑ' فن اور علم اور نیکی یعنی تقویٰ تک محدود رہے تو پورا معاشرہ اور معاشرے کا ہر فرد خوشحال ہوگا۔ مگر اگر یہی دوڑ ہوس زر کی صورت اختیار کرے تو نتیجے میں پورا معاشرہ اور ملک کا نظام اور ملک افراتفری اور ناہمواری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

''آج تک دنیا میں کوئی ایسا معاشرہ ایسا نظام پیدا نہیں ہوا جہاں مالی اور مادی لحاظ سے سب برابر' برابر ہوں۔ وہاں غریب بھی ہوں گے اور امیر بھی اور یہی دورنگی زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔

''سو ہمارا اہل ہند کیلئے یہی پیغام ہے کہ غربت کو سینے سے لگائیں اور فاقہ کشی کو ٹھوکر ماریں۔ جس غربت کی میں بات کر رہا ہوں وہ گویا ہندی تہذیب کی جان ہے۔ وہ ایک ایسی شان بے نیازی ہے جس نے مہاتما بدھ' میرابائی اور راجہ بھرت ہری جیسے نامور پیدا کئے کہ تاریخ عالم پر جن

کے نام نامی رہتی دنیا تک سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ ہمارے درمیان اس وقت جتنے بھی اولیاءاللہ تشریف فرما ہیں ان کا پورا پیغام پوری زندگی کا ماحاصل صرف شان بے نیازی کے دو لفظوں میں پوشیدہ ہے خود ہمارے محترم علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے کہ

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

''تونگری دراصل اس غربت کا نام ہے جسے علاّمہ اقبالؒ 'خودی' کہتے ہیں اور جس کی موجودگی میں 'خدا بندے سے خود پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے' اس سے پہلے کہ اپنا بیان ختم کروں میں ان چاروں حضرات سے جو کاروان آزادی کے سرخیل تھے اور اس وقت ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں مودبانہ درخواست کروں گا کہ اگر وہ تحریک آزادی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تقسیم کے متعلق کچھ کہنا چاہیں تو بسم اللہ ہم سب گوش برآواز ہیں۔''

حضت اتنا کہہ کر واپس اپنی نشست پر تشریف لے گئے۔ ہم نے ہمت کر کے ان سے آنکھیں چار کیں تو ان کی آنکھوں میں شوخی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ اس قسم کی شوخی جو کبھی امیر خسرو کے ساتھ ان کی بے تکلف صحبتوں میں دیکھی ہوگی۔ انہوں نے مجھے بھی نظر بھر کر دیکھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور پھر قائدین پر اپنی نظریں جمادیں گویا ان کے جواب کے منتظر ہوں۔

اتنے میں مہاتما گاندھی نے کھڑے ہوئے ہاتھ جوڑ کر سب کو پرنام کیا۔ پھر انہوں نے زیرلب جیسے اپنے آپ سے کچھ کہا۔ اس کے بعد اونچی آواز میں بولے کہ انہوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مولانا ابوالکلا آزاد صاحب ان کے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کریں۔ مہاتما گاندھی کی زبان سمجھنے میں ہمیں خاصی دقت ہوئی مگر اسکا لب لباب یہی تھا۔ مولانا آزاد بلا تاخیر فوراً ہی کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر سب کو بآواز بلند سلام کیا۔ ہم کو صاحب عالم اور باقی شرکائے مجلس کو بزرگان دین کہہ کر خطاب کیا اور اپنی تقریر شروع کر دی۔

مولانا کی تقریر عربی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت کے باوجود انتہائی فصاحت و بلاغت کی حامل تھی۔ بیان میں بلا کی روانی تھی۔ مگر مجال جائے جو ایک لفظ کی بھی کمی یا بیشی ہو ان کے ہر لفظ کی مثال انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی سی تھی۔ مولانا کی پوری تقریر تو ہمیں یاد نہیں البتہ اس کا خلاصہ

یہ تھا کہ ''ان سمیت ان چار حضرات کے علاوہ جو اس وقت شریک مجلس تھے ان میں ان گنت ایسے افراد بھی تھے جو کاروان آزادی کے سرخیل رہے اور جنہوں نے آزادی کی راہ میں بے حساب قربانیاں دیں دراصل یہ انہیں انگنت اور کم شہرت یافتہ یا بالکل گمنام حضرات کی انتھک اور بے لوث سعی پیہم ہی کا کمال تھا کہ ہندوستان انگریز کی گرفت سے آزاد ہوا ہم اس کاروان کے قلب پر ضرور تھے مگر اہلِ کارواں کے بغیر کارواں کا وجود کالعدم ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر تھوڑا بہت ہو بھی تو بھی موثر نہیں ہوسکتا...''

مولانا نے اتنا فرمایا اور اس کے بعد وہ اچانک خاموش ہو کر جیسے کسی گہری سوچ و فکر میں کھو گئے ۔ پھر جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے خطاب کا از سرنو آغاز فرمایا:

''جب وہ اور ان کے ساتھی جنگ آزادی کے دوران اپنے کردار کو حق اور انصاف کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو ان کے سر گویا شرم سے جھک جاتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سب مجسم خلوص تھے ۔ قربانی کے لازوال جذبے سے سرشار مگر خلوص کے ساتھ ساتھ وہ ان سنگین نتائج سے اگر غافل نہیں تو حیرت انگیز حد تک نابلد ضرور تھے جن کی طرف ان کی جذباتی اور دوررس منصوبہ بندی سے عاری تحریک انہیں کشاں کشاں لئے جارہی تھی ۔ ایک طرف گاندھی جی تھے کہ جنہوں نے ہندو ۔ مسلم اتحاد اور یکجہتی کے عظیم ترجمان ہونے کے باوجود اپنی روزمرہ کی طرز زندگی کو خالص ہندومت کے سانچے میں ڈھالا ۔ اور اس طرح انجانے میں اسکے پرچارک بن کر مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرتے رہے کہ وہ اول اور آخر ہندو ہیں' حقیقت میں ہرگز ایسا نہ تھا اور گاندھی جی ہر قسم کے مذہبی تعصّبات سے بالاتر تھے ۔

''ان کے بعد قائداعظم محمد علی جناح آتے ہیں ۔ ان کا سب سے بڑا کمال سب سے عظیم کارنامہ تو یہی تھا کہ انہوں نے جہالت' پسماندگی اور آپس کے جھگڑوں میں الجھی ہوئی مسلمان قوم کو اندھیرے سے اجالے میں نکالا ۔ بکھری ہوئی قوم کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا اور نصرف یہ بلکہ انہیں عزت و وقار سے زندہ رہنے کا طریقہ سکھایا ۔ ان کی ٹیڑھی میڑھی صفوں کو درست کر کے انہیں ایک پیش امام کے پیچھے کھڑے ہونے کا سلیقہ سکھایا ۔ غدر کے بعد سے ہندوستانی مسلمان کی پسماندگی

کی تاریخ کے تناظر میں اگر قائداعظم کے اس کارنامے کا مطالعہ کیا جائے تو ہم سب کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسکی حیثیت اوراہمیت کسی پیمبرانہ کارنامے سے کم نہیں۔

''ان کا دوسرا کارنامہ ہندوستانی سیاست کو ہر قسم کے مذہبی تعصّبات اور فرقہ واریت کو بالکل علیحدہ رکھنا تھا اور وہ اسی نظریہ اور حکمت عملی پر اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان کے ناقدین اور مخالفین انہیں مسلم علیحدگی پسندی کی راہ اختیار کرنے پر بالکل مجبور نہیں کر دیا۔

''ان کا تیسرا کارنامہ قانون اور آئین سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ وہ انتہائی بااصول انسان تھے انہوں نے سیاست کو ہمیشہ اپنے سیاسی فکر اور اصول پسندی کے مطابق اور کھوکھلی جذباتیت سے پاک رکھا بالخصوص ایسی جذباتیت جس کے پیچھے کسی قسم کا مذہبی یا فرقہ وارانہ تعصب کارفرما ہو۔ حتیٰ کہ جس وقت گاندھی جی کی قیادت میں سلطنت ترکیہ کی خلافت کے حق میں پورے ہندوستان میں تحریک برپا ہوئی۔ اس وقت بھی جناح صاحب نے صرف اس لئے اپنے آپ کو اس سے دور رکھا کہ وہ اصولی طور پر سیاست میں مذہب کی آمیزش کے سخت مخالف تھے۔ پھر بھی اغیار کی ریشہ دوانیوں اور کچھ اپنوں کی بے اعتنائی اور بے وفائی کے باعث جناح صاحب کے سیاسی فکر اور حکمت عملی نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ صرف اور صرف اسلامیان ہند کے قائد بن کر رہ گئے اور آزادی ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے بھی نقیب اور علم بردار بن گئے کاش کہ ایسا نہ ہوتا۔ اپنوں کی تنگ دلی کے علاوہ اس پورے عمل میں غدر کے بعد کی تاریخ کا بھی بڑا دخل تھا۔ جس کے بعد مسلمان سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد گویا خود اپنے وطن میں پردیسی اور اچھوت ہو کر رہ گئے۔

''اب رہے جواہر لال تو ہماری زبان میں اور ہمارے نزدیک تو گھر اور میدان سیاست دونوں میں لالوں کے لال رہے۔ نیک صورت' نیک سیرت' مورخ' مفکر سب کے مونس وغم گسار۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی ہندی اسلامی تہذیب اور شائستگی کا بہترین مظہر۔ تحریر اور تقریر کے بادشاہ' صُلح کُل مجسم' اپنے آبائی محل سے نکل کر جیل کی کوٹھریاں آباد کیں۔ ہندوستان کی آزادی کیلئے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ انگریز کو انگریزی کی زبان میں اور اسی کی بچھائی شطرنج کی بساط پر شہ مات دی۔ گاندھی جی کے بعد آزادی سے پہلے والا ہندوستان انہیں کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

''بس ان کی طبیعت کا بچپن یا الہڑ پہن ان کی شخصیت ایک ایسا جزو تھا جو اکثر ابھر کر انہیں صراط مستقیم سے ہٹا کر ژولیدگی اور پریشان خیالی کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر ڈال دیا کرتا تھا اور پھر وہ ان پگڈنڈیوں پر بھٹکتے بھٹکتے اتنی دور نکل جاتے کہ سیدھے راستے سے واپس آنا دشوار ہو جاتا۔ اصول پرستی سے کہیں زیادہ ان کا یہی بچپن اور الہڑ پن تھا جو ان کے اور محترم محمد علی جناح کے باہمی تعلقات کی کشیدگی کے پیچھے کارفرما رہا۔ انہوں نے ہرگز جناح صاحب کو وہ مقام نہیں دیا جو اسلامیان ہند کے واحد مستند قائد کی حیثیت سے ان کا تھا۔ وہ بدمزاج سے کہیں زیادہ مزاج دار تھے نوابی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ہمارے نزدیک اگر جناح صاحب کے سلسلے میں ذرا بھی معقولیت اور حقیقت پسندی سے کام لیتے تو کم از کم میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ تقسیم کی ناگزیریت بڑی حد تک ختم ہو سکتی تھی۔ مگر بہر حال تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ' تاریخ کو آپ خواہ کسی ہی حوالے سے کیوں نہ دیکھیں۔ کسی تناظر میں کیوں نہ پرکھیں۔ انجام کار وہ مشیت ایزدی ہی کی توسیع اور تخلیق ہے۔ انسان اور انسانی منصوبہ بندی اور دوسرے مادی اور مرئی اسباب محض اس کا تانا بانا بنتے ہیں اس کا مادہ تولید نہیں۔

''تقسیم کے ہم سب ہی گنہگار ہیں مگر اس میں ہرگز کسی کی بھی بدنیتی کا دخل نہیں جو بھی غلطیاں ہم سے سرزد ہوئیں سراسر عجلت میں۔ ان میں گاندھی جی کا گاہے' گاہے خیر و شر کے فیصلے کے درمیان تذبذب۔ جناح صاحب کا اپنے مخالفین کی بے جا تنقید اور ضد سے برہم ہو کر ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت کو چھوڑ کر تقسیم یعنی تشکیل پاکستان کے مطالبہ پر ڈٹ جانا اور جواہر لال کا آخری وقت تک جناح صاحب سے بیزاری اور ان کے قائدانہ مقام سے مسلسل انکار بھی شامل ہیں۔

''جہاں تک خود اس بندہ عاجز کا سوال ہے تو میں ہندو بھائیوں میں مسلمان اور مسلمانوں میں ہندوؤں کا آلہ کار۔ میرا بس وہی حال تھا۔

واعظِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں ہیں

''میری واحد سنگین اور نا قابل معافی کوتاہی نا اہلی اور کمزوری میری اپنی قوت فیصلہ میں کمی رہی۔ میں اول سے آخر تک تقسیم کا سخت مخالف رہا۔ مگر جب گاندھی جی سمیت میرے سب ساتھی طوہاً وکرہاً تقسیم پر راضی ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر اس کی نفی کرنے کی بجائے خاموشی یعنی الخاموش نیم رضا کو اپنا شعار بنایا۔ اس وقت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں بانگ دُھل کھڑا ہو کر تقسیم کے خلاف نعرہ رندانہ بلند کرتا مگر میں نے مصلحت وقت کو ترجیح دی اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم پر اکتفا کیا۔ اللہ میرے گناہوں اور خطاؤں کو معاف کرے...''

اسکے بعد مولانا کی آواز رندھ گئی۔ ان کا گلا بیٹھنے لگا۔ انہوں نے معذرت کی اور بیٹھ گئے۔

جلسہ اب برخواست ہوا چاہتا تھا جس نے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ صرف بابا گرونانک ایسے تھے جو شروع سے لے کر آخر تک خاموشی اختیار کئے رہے۔ ان کا چہرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ آنکھیں نیم وا تھیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان سے خطاب کی درخواست کروں۔ مگر حضرت نظام الدین مجھے آنکھ اور انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر بابا گرونانک نے خود ہی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی بابا گرونانک کھڑے ہوئے۔ ویسے ہی انکے برابر تشریف فرما بابا ولی قندھاری بھی کھڑے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔

مجلس میں موجود سارے اولیاء کرام کا یہ فیصلہ تھا کہ زمین کے بٹوارے سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ معاملہ زمین اور اہل زمین کا ہے وہ جو چاہیں جو کریں زمین خود بہت ظالم ہے وہ اپنا بدلہ خود لیتی ہے اور لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی۔ ہماری کوشش اور دعا صرف یہ ہے کہ روحانیت کا جو ارتقاء سرزمین ہند میں صدہا برس میں ہوا ہے اور جو ہماری سب سے قیمتی میراث ہے وہ لوح محفوظ کی طرح باقی رہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں کا شکریہ ادا کرنے کیلئے اٹھنے ہی والا تھا کہ اتنے میں مرزا نوشہ دور سے نظر آئے۔ آخر وہ حسب عادت ٹپک ہی پڑے میں ان کے استقبال کیلئے چبوترے سے نیچے اتر کر آگے بڑھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر مسند پر لایا۔ مرزا نے انتہائی ادب سے جھک کر حضرت نظام الدین اور امیر خسرو کی خدمت میں آداب کیا۔ پھر شرکاء محفل کے روبرو ہو کر انہیں جھک کر سلام

کیااور مداخلت بے جا کے لئے معافی کے خواستگار ہوئے۔اس وقت مرزا نوشہ کی حالت ہی کچھ اور ہی تھی۔معمول سے بالکل بدلی بدلی۔شوخی انہیں چھو کر نہیں لگی تھی۔ایسا معلوم ہوتا کہ خود اپنے الفاظ میں کاغذی پیراہن پہنے بھری عدالت میں کھڑے ہیں۔میں نے ہمت کر کے ان سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔انہوں نے پہلے تو اپنی وہی دلّی کے آخری مشاعرے والی غزل پڑھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پھر ایک ہی زقند میں وہ غزل کے اس شعر پر آ گئے۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس کے بعد تھوڑی دیر کیلئے جیسے کھو گئے۔پھر بیدار ہوئے اور اپنے یہ اشعار پڑھے:

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اور پھر

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

''سبحان اللہ' سبحان اللہ' امیر خسرو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔اس کے بعد نظام الدین نے مرحبا' کا ورد کیا اور پھر سید علی ہجویری نے 'گلشن ناآفریدہ' کو بار بار دہرایا۔ہم نے دیکھا شیخ احمد سرہندی جنکا شعر و شاعری سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔انکے لب مبارک میں بھی جنبش ہوئی۔

اور پھر تمام شرکاءِ محفل دھیمی دھیمی آوازوں میں 'گلشن ناآفریدہ' کا ورد کرنے لگے۔

حق تو یہ کہ گلشن ناآفریدہ ہی تو ہماری آخری منزل ہے۔میرا بائی اس تمام کارروائی کے دوران اسی طرح کونے میں اپنا ایک تارہ لئے کھڑی تھیں۔انہوں نے تار چھیڑے اور ایوان خاص جیسے جھرنے کی سریلی آواز سے گونج اٹھا۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!

اپنڈکس

اولیائے کرام پاک و ہند

مختصر سوانح حیات

حضرت سید علی ہجویریؒ ۱۰۔۱۰۰۹ء - ۱۱۰۶ء

لاہور میں حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ حضرت سیدنا معین الدین چشتی اور حضرت فریدالدین گنج شکر جیسے اکابر صوفیہ نے یہاں چلہ کشی کی اور برصغیر ہندو پاک کے ہر بادشاہ نے یہاں کی حاضری کو اپنے لئے سعادت سمجھا۔

حضرت مخدوم کا نام علی اور والد محترم کا اسم گرامی عثمان تھا۔ آپ غزنی کے قریب ہجویر نامی ایک قریہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ بیعت جنیدی ہے۔

حضرت علی ہجویری لاہور میں ۱۰۷۰ء کے بعد آئے اور اسی شہر کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا تو یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ لاہور میں تبلیغ دین کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا۔ بے شمار لوگوں کو مسلمان کیا۔ آپ نے لاہور ہی میں اپنی معرکتہ الآراء کتاب کشف المحجوب تصنیف کی۔

حضرت بوعلی قلندرؒ ۱۲۰۸ء - ۱۳۲۴ء

آپ کا پورا نام شیخ شرف الدین بوعلی قلندر تھا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ مشکوک ہے لیکن ان کی وفات ۱۳۲۴ء میں پانی پت میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ فخرالدین سالار تھا۔ آپ نے

ہندوستان آ کر پانی پت میں رہائش اختیار کی۔ آپ چالیس سال کی عمر تک دنیاوی علوم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ کا رجحان روحانیت کی طرف ہو گیا۔ آپ ایک بلند پایہ صوفی فقیر مانے جانے لگے۔ آپ کا کلام فارسی اور پنجابی میں پایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق آپ نے ۱۲۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت امیر خسروؒ ۱۲۵۳ء - ۱۳۲۶ء

حضرت امیر خسرو پٹیالی میں پیدا ہوئے اور ان کے والد امیر سیف الدین محمود کا شمار بلخ کے شرفا اور امراء میں ہوتا تھا۔ سلطان التمش نے والد ماجد کو اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔ آپ کا اصل نام ابوالحسن اور لقب یمین الدین تھا جو آگے چل کر امیر خسرو کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہوا۔

حضرت امیر خسرو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اس کے بعد حضرت نے ان کی تعلیم و تربیت خود کرنی شروع کی۔ آپ ہی کے توسل سے امیر خسرو نے دربار شاہی میں رسائی حاصل کی اور سات بادشاہوں کے درباروں میں ملک الشعراء اور مشیر خاص کے عہدوں پر فائز رہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ۱۱۷۱ء - ۱۲۳۵ء

آپ کا اسم گرامی قطب الدین تھا مگر آپ کے پیر و مرشد خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین چشتیؒ آپ کو بختیار کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ بختیار کہلانے لگے۔ آپ خواجہ معین الدین حسن چشتی سے بیعت ہیں۔ چونکہ آپ کا خاندان چشت سے بیعت ہے۔ اس لئے آپ بھی چشتی کہلاتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کو قطب الاقطاب کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ آپ کا لقب کاکی ہے۔

آپ کا وطن مالوف اوش ہے۔ حضرت قطب کی عمر مبارک صرف ڈیڑھ سال کی تھی کہ والد کا

سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم وتربیت کا مقدس فریضہ والدہ نے انجام دیا۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے آپ کو چار دن میں قرآن شریف یاد کرادیا۔

حضرت بختیار کاکی اصفہان میں قیام پذیر تھے کہ انہیں دنوں حضرت خواجہ معین الدین سنجری بسلسلہ سیر وسیاحت اصفہان پہنچے۔ یہیں خواجہ غریب نواز نے حضرت قطب کو شرف مُریدی بخشا۔ وہ ان کے ہمراہ خانہ کعبہ کی زیارت کیلئے مکہ معظمہ پہنچے اور زیارت کعبہ سے مشرف ہوئے۔ بعد میں مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے ہاں حاضری دی۔

مدینہ سے بغداد اور ہرات سے ہوتے ہوئے لاہور سے دہلی اور پھر اجمیر شریف پہنچے۔ لاہور سے اجمیر تک سفر دو ماہ میں طے ہوا۔ حضرت قطب کو خواجہ ابواللیث سمرقندی (بغداد) کی مسجد میں بیعت خلافت عطا ہوئی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر پہلی ہی مجلس میں دہلی میں حضرت قطب سے بیعت ہو گئے۔ اس وقت بابا فرید کی عمر پندرہ سال تھی۔

حضرت خواجہ سید معین الدین چشتیؒ ۱۱۳۹ء - ۱۲۳۶ء

حضرت خواجہ صاحب اجمیری ابھی پندرہ سال کے تھے کہ والد ماجد سید غیاث الدین حسن کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ورثہ میں ایک باغ اور ایک پن چکی ملے جس سے حضرت خواجہ بسر اوقات کرتے۔

نیشاپور کے قریب قصبہ ہارون میں اس وقت کے مرشد کامل سید الاولیاء خواجہ عثمان ہارونی نے خواجہ غریب نواز کو خرقہ خلافت سے نوازا اور چند نصیحتیں ارشاد فرما کر حکم دیا کہ اب اللہ کی زمین پر سیاحت کیلئے روانہ ہو جاؤ۔

پہلے خواجہ غریب نواز بغداد گئے وہاں مختلف بزرگوں کی زیارت سے مستفیض ہوتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے۔ مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کی حاضری کے بعد مدینہ منورہ گئے اور مسجد نبوی میں

حاضری دی اور کئی روز قیام کیا۔ وہیں ایک روز بارگاہ رسالت سے ہندوستان جانے کا حکم ملا۔

بیس برس تک اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہنے کے دوران خواجہ غریب نواز اپنے مرشد کے ساتھ مکہ مدینہ بدخشاں اور بخارا وغیرہ گئے۔

روضہ رسول سے حضرت کو ہندوستان جانے کی بشارت ملی تو حضرت بغداد تبریز بلخ سے ہوتے ہوئے غزنی کے راستے ہندوستان آئے اور ۵۸۸ھ میں لاہور پہنچ کر حضرت شیخ سید علی ہجویری کے مزار پُرانوار پر چلہ کش ہوئے۔ لاہور سے حضرت ملتان تشریف لے گئے جہاں انہوں نے سنسکرت اور پراکرت زبانیں سیکھیں اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے ۵۸۹ھ میں اجمیر آ گئے۔

حضرت خواجہ خواجگان نے اجمیر میں بیٹھ کر جس استقامت اور استواری سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کا وصال اجمیر میں ہوا۔ انہیں اسی حُجرے میں دفن کیا گیا جہاں وہ عبادت کیا کرتے تھے۔

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ ۱۱۷۳ء - ۱۲۶۵ء

خواجہ فریدالدین ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام مسعود رکھا گیا اور یہیں آپ نے قرآن حفظ کیا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی نظر کرم آپ پر پڑی تو فرمایا جب تعلیم مکمل کر لو تو دہلی آنا۔ انشاءاللہ اپنی مراد کو پہنچو گے۔ بابا فرید نے تکمیل تعلیم کیلئے قندھار غزنی بغداد سیوستان اور بدخشاں وغیرہ میں گزارے اور پھر دہلی آئے۔ جہاں قطب عالم نے انہیں نعمتہائے روحانی سے مالا مال کر دیا۔

آپ نے انتقال سے پہلے تین بار نماز عشاء ادا کی اور آخر وقت تک حضرت نظام الدین کا انتظار کرتے رہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو اطلاع ہوئی تو اجودھن (پاکپتن) آئے۔ حضرت بابا صاحب کا مزار شریف تعمیر کرایا اور اس اہتمام کے ساتھ کہ ہر اینٹ پر ایک قرآن شریف ختم کیا گیا۔

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ - ۱۳۵۶ء

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی خاندان چشت کے روشن چراغ ہیں۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے جانشین ہیں۔ آپ کے جدامجد خراسان کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد حضرت شیخ محمود یحییٰ ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے۔ بعدۂ لاہور کی سکونت ترک کر کے اودھ میں رونق افروز ہوئے۔

آپ اودھ میں پیدا ہوئے۔ نام نامی نصیرالدین' خطاب محمود اور لقب ''چراغ دہلی'' ہے۔ آپ کے بہت سے خلیفہ ہیں۔ جو چند بہت مشہور ہوئے ان میں حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسودراز شامل ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی نے آپ کو دہلی میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ حضرت محبوب الٰہی کو خواجگان سے جو خرقہ' عصا' کاسہ اور نعلین ملے تھے وہ آپ کو عطا کیں۔ اس کے بعد حضرت چراغ دہلی نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ اپنی مجلسوں میں زیادہ تر قرآن حکیم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں گفتگو کرتے تھے۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ ۱۴۷۹/۸۰ء - ۱۵۷۲/۷۳ء

آپ کا نام نامی شیخ سلیم ہے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام بہاءالدین ہے۔ آپ کے آباؤاجداد اجودھن سے ہجرت کر کے لدھیانہ آئے۔ کچھ عرصہ لدھیانہ میں رہ کر دہلی گئے۔ پھر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ آپ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی اولاد سے ہیں۔

ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائی شیخ موسیٰ نے کی۔ انہوں نے آپ کی تربیت پر کافی دھیان دیا۔ آپ نے ۹۳۱ء میں حرمین شریفین کی زیارت کی۔ کچھ دن وہاں قیام کیا پھر دربار رسالت میں حاضری دی۔ آپ جب

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ - ۱۳۵۶ء

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلوی خاندان چشت کے روشن چراغ ہیں۔آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے جانشین ہیں۔آپ کے جدامجد خراسان کے رہنے والے تھے۔آپ کے والد حضرت شیخ محمود یحییٰ ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے۔ بعدہٗ لاہور کی سکونت ترک کر کے اودھ میں رونق افروز ہوئے۔

آپ اودھ میں پیدا ہوئے۔نام نامی نصیرالدین' خطاب محمود اور لقب ''چراغ دہلی'' ہے۔ آپ کے بہت سے خلیفہ ہیں۔جو چند بہت مشہور ہوئے ان میں حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسودراز شامل ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی نے آپ کو دہلی میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔حضرت محبوب الٰہی کو خواجگان سے جو خرقہ' عصا' کاسہ اور نعلین ملے تھے وہ آپ کو عطا کیں۔اس کے بعد حضرت چراغ دہلی نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔آپ اپنی مجلسوں میں زیادہ تر قرآن حکیم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں گفتگو کرتے تھے۔

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ ۱۴۷۹/۸۰ء - ۱۵۲۲/۲۳ء

آپ کا نام نامی شیخ سلیم ہے۔آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد کا نام بہاءالدین ہے۔آپ کے آباؤاجداد اجودھن سے ہجرت کر کے لدھیانہ آئے۔کچھ عرصہ لدھیانہ میں رہ کر دہلی گئے۔پھر دہلی میں سکونت اختیار کی۔آپ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی اولاد سے ہیں۔

ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائی شیخ موسیٰ نے کی۔انہوں نے آپ کی تربیت پر کافی دھیان دیا۔آپ نے ۹۳۱ء میں حرمین شریفین کی زیارت کی۔کچھ دن وہاں قیام کیا پھر دربار رسالت میں حاضری دی۔آپ جب

ہندوستان واپس آئے تو فتح پور سیکری میں گوشہ نشین ہوکر عبادات' مجاہدات اور ریاضات میں مشغول ہوئے۔ آپ شیخ ابراہیم چشتی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور ان سے خرقۂ خلافت پایا۔

مزار فیض آثار فتحپور سیکری میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ ۱۵۶۳ء - ۱۶۰۳ء

آپکا نام سید رضی الدین ہے۔ آپ خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپکے والد کا نام قاضی عبدالسلام ہے اور انہوں نے کابل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حضرت خواجہ کابل میں پیدا ہوئے۔ آپنے علوم ظاہری کے بجائے علوم باطنی کے اکتساب میں زیادہ کوشش کی۔

آپ ماوراءالنہر میں تھے۔ وہیں آپکی ملاقات حضرت خواجہ املنگی سے ہوئی۔ آپنے ان سے بیعت کی۔ اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق آپ ہندوستان تشریف لائے۔ لاہور پہنچ کر ایک سال وہاں قیام کیا۔ لاہور سے سکونت ترک کر کے آپ دہلی میں رونق افروز ہوئے۔

آپ نے دو شادیاں کیں۔ آپ کے دولڑکے ہوئے۔ حضرت خواجہ محمد عبید اللہ ایک بیوی سے ہیں اور حضرت خواجہ محمد عبداللہ دوسری بیوی سے۔ یہ دونوں بھائی دو سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر چالیس کی تھی۔ آپ کا مزارِ مبارک دہلی میں مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کے خلفاء میں حضرت شیخ احمد سرہندی جو مجدد الف ثانی کے خطاب سے مشہور ہوئے سب سے زیادہ عالم کامل اور ممتاز تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ۱۵۶۴ء - ۱۶۲۴ء

حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہند شریف میں پیدا ہوئے۔ جب آپ تعلیم حاصل کرنے کی عمر کو

پہنچے تو آپ کے والد ماجد شیخ عبدالاحد نے آپ کو مکتب میں داخل کیا جہاں آپ نے بہت ہی کم مدت میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ آپ نے دینی کتب کے علاوہ معقولات، تصوف اور علم حدیث میں درس لیا۔

آپ نے اپنے والد گرامی کے دست مبارک پر بیعت کی اور سلسلہ چشتیہ میں داخل ہوکر سلوک کی منازل حاصل کیں۔ آپ کے والد ماجد نے ۱۰۰۷ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ آپ حج بیت اللہ کے ارادہ سے سرہند شریف سے روانہ ہوکر دہلی پہنچے جہاں آپ کی ملاقات حضرت خواجہ باقی باللہ سے ہوئی۔ قیام کے دوران حضرت مجدد کے دل میں ان کے مرید ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ حضرت باقی باللہ سے آپ نے درخواست کی اور یوں آپ سلسلہ نقشبندیہ میں ان سے منسلک ہوگئے۔ حج سے واپسی پر حضرت باقی باللہ نے خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا ریاضت اور عبادت میں مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے اکبر کے نام نہاد ''دین الٰہی'' کے خلاف پوری قوت سے مزاحمت کی۔

۶۰ برس کی عمر میں آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت مجدد نے چار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ دین مبین کیلئے آپ نے نہایت شاندار کارنامے انجام دیئے اور اسی صلہ میں امت مسلمہ نے بالاتفاق آپ کو مجدد تسلیم کیا۔

شاہ لطیف بری امامؒ ۱۶۱۷ء - ۱۷۰۵ء

شاہ لطیف بڑے عابد، زاہد، مست و مجذوب بزرگ گزرے ہیں۔ بے شمار لوگوں کو روحانی فیض دیا۔ آپ کا نام سید عبداللطیف تھا اور والد بزرگوار کا نام سید محمود شاہ تھا۔ آپ کی ولادت موضع چولیاں کرسال تحصیل چکوال ضلع جہلم میں ہوئی۔ طریقت کے لحاظ سے قادری سلسلہ کے تھے۔

حضرت بری امام کی عمر جب دس بارہ سال تھی تو آپ کے والد نقل مکانی کر کے موضع ''باغ کلاں'' (موجودہ اسلام آباد) آ کر رہائش پذیر ہوگئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے

حاصل کی۔ آپ نے علوم عقلی و نقلی کی تعلیم کے ساتھ روحانی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے بعد کشمیر بدخشاں ایران عراق اور شام کے مختلف شہروں کی سیاحت کی۔ حرمین شریفین بھی گئے اور حج بھی ادا کیا۔

واپس آ کر آپ نے نور پور شاہاں کے پاس بہنے والی ندی ''نیلان'' میں کھڑے ہو کر برسوں عبادت و ریاضت کی۔ آپ کے مرشد حضرت سخی حیات المیر نے اس ''بر'' (زمین) کے لئے اپنا نائب امام مقرر کیا۔ چنانچہ اس روز سے آپ امام بری مشہور ہو گئے۔

ہزاروں لوگوں کو روحانی فیض سے مستفیض کر کے ۹۱ برس کی عمر میں ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۵ء) کو آپ فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ اسلام آباد کے قریب پہاڑوں کے دامن میں نور پور شاہاں میں ایک ندی کے کنارے واقع ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (۱۶۸۰۔۱۷۵۲ء)

سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے قبول عام اور شہرت دوام کی وجہ ان کی الہامی شاعری ہے۔ جس کے ذریعہ انہوں نے عالم انسانیت کو محبت' حق پرستی' خود شناسی' وطن دوستی' ایثار و قربانی اور انکساری اور عاجزی کا پیغام دیا ہے۔ اس طرح اپنی شاعری سے ''شاعری جزویست از پیغمبری'' کا کام لیا ہے۔

شاہ لطیف کی روحانی تربیت ان کے والد بزرگوار شاہ حبیب کے زیر سایہ ہوئی لیکن حقیقت میں انہوں نے روحانی طریقہ پر حضور نبی کریم ﷺ سے فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک فطری' الہامی اور دنیا کے بڑے شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ شاہ صاحب کے کلام میں فکر کی گہرائی اور وسعت ہے۔ اس کے علاوہ ان کا شعر سندھی زبان کے الفاظ اور محاوروں کے استعمال کے لحاظ سے سند کی حیثیت رکھتا ہے اور سندھ کی ثقافت' تہذیب و تمدن کا ترجمان ہے۔

شاہ صاحب' انسانی فطرت کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کر کے انسان کا رخ بدی سے نیکی کی طرف موڑتے ہیں۔ انسان کو اس کا شرف وشان یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صاف پانی کو بگلوں نے میلا کر دیا ہے
اب ہنس اس کے قریب آتے ہوئے شرماتے ہیں''

سائیں بُلھے شاہؒ ۱۶۸۰ء - ۱۷۵۸ء

آپ کا نام عبداللہ شاہ ہے۔ کنیت بُلھے شاہ ہے اور آپ کنیت سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد سید سخی درویش محمد اُچ میں رہتے تھے۔ اُچ سے سکونت ترک کر کے ملکوال میں تشریف لائے۔ پھر ملکوال سے پانڈو میں جا کر اقامت گزیں ہوئے۔

آپ کے والد ماجد اپنے زمانہ کے ایک عالم تھے۔ عربی و فارسی میں ان کو دستگاہ حاصل تھی۔ چنانچہ آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت آپ کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ تحصیل علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو علوم باطنی حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ تحصیل علوم باطنی بغیر مرشد کامل ہونا ممکن نہیں۔ اس سلسلہ سے آپ حضرت شاہ عنایت اللہ قادری کے پاس پہنچے۔

حضرت شاہ عنایت اللہ نے آپ کو بیعت سے مشرف فرمایا اور بعدۂ خرقہ خلافت عطا کیا۔ کچھ عرصہ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں رہ کر ان کے فیوض و برکات سے مستفیذ ہوئے۔ آپ نے پھر قصور میں سکونت اختیار کی۔ وہیں انتقال ہوا۔ آپ کا مزار بھی قصور میں ہے۔

آپ کو سمع کا بہت شوق تھا۔ فن موسیقی سے بخوبی واقف تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور آپ کا تخلص بُلھے شاہ تھا۔

بھگت کبیر داس ۱۳۸۸ء - ۱۴۴۰ء

ہندی شاعری میں بھگت کبیر داس کو جو درجہ قبولیت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شاید ہی کوئی

ایسا شخص ہو جو بھگت کبیر داس کے نام سے واقف نہ ہو۔ بھگت کبیر داس کے مفصل حالات صحیح طور پر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں بہت اختلافات ہیں۔

بھگت کبیر داس کی پیدائش کے متعلق سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ بنارس کا ایک مسلمان جولاہہ نیرون نامی اپنی پتنی نیما (نعیمہ) کے ساتھ جا رہا تھا' جب وہ ایک تالاب کے پاس سے گزرا تو اس نے تالاب کے کنارے ایک نوزائیدہ بچہ دیکھا۔ اس کو اس بے کس کے حال پر رحم آیا اور گو نعیمہ بدنامی کے خیال سے جھجھکتی تھی مگر وہ بچہ کو اٹھا لایا اور اس کی پرورش کرنے لگا۔ قاضی سے جب بچہ کے نام رکھنے کو کہا تو فال میں کبیر کا لفظ نکلا اور بچہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر ایک بیوہ برہمنی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک برہمن سوامی رامانند کے بڑے معتقد تھے اور ان کے درشن کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز اپنی بیوہ لڑکی کو بھی ساتھ لے گئے۔ جب لڑکی نے رامانند جی کو پرنام کیا تو انہوں نے اس کو دعا دی کہ تجھے بیٹا ہو۔ برہمن نے پریشان ہو کر لڑکی کے بیوہ ہونے کا حال بیان کیا رامانند جی نے کہا کہ میرا کہا بیکار نہیں جا سکتا۔ ایام مقررہ گزرنے کے بعد کبیر داس اس کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس نے لوگ لاج کے ڈر سے بچہ کو تالاب کے کنارے پھینک دیا جہاں سے وہ نیرہ اور نعیمہ کے گھر پہنچا۔ یہ روایات کبیر صاحب کی پیدائش کے متعلق سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کتنا اصل واقعہ ہے اور کتنا مبالغہ۔

کبیر داس کی پیدائش اور پرورش کے یہ واقعات ان کی زندگی کے پیش خیمہ تھے کیونکہ ہندوستان کی تاریخ میں کسی شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کرنے کی اور ان میں اتفاق اور یکجہتی پیدا کرنے کی کبیر صاحب سے زیادہ کوشش کی ہو۔

کبیر صاحب نے اپنی زندگی کے بعض حالات اپنے کلام میں نظم کر دیئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ذات کے جولاہے تھے' بنارس میں رہتے تھے' پڑھے لکھے نہ تھے اور رامانند کے چیلے تھے۔

لڑکپن ہی سے کبیر صاحب دنیا کی طرف کم اور خدا کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ان کے عقائد

ویدانیوں اور صوفیوں کے سے معلوم ہوتے ہیں۔ راما نند کے مرید ہونے کے بعد بھی کبیر نے رسمی معنوں میں دنیا کو نہیں چھوڑا۔ جولاہہ کا پیشہ کرتے تھے' کپڑا بنتے اور بازار میں جا کر بیچ آتے اور کبھی کبھی سادھو سنتوں کو دے ڈالتے اور گھر خالی ہاتھ لوٹ آتے۔

حضرت سلطان باہوؒ ۱۶۳۱ء - ۱۶۹۰ء

حضرت سلطان باہو شورکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام بایزید محمد ہے۔ وہ شہنشاہ شاہجہاں کی طرف سے کوہستان میں منصب دار تھے۔ حافظ قرآن اور اپنے زمانے کے ایک عالم تھے۔ انہوں نے کوہستان سے ملتان آ کر اقامت اختیار کی۔ ملتان سے وہ شورکوٹ تشریف لائے اور وہاں سکونت اختیار کی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت آپ کی والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ آپ ہمہ وقت تلاش حق میں مصروف رہتے۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کو کسی باکمال شخص سے بیعت ہونے کی تاکید فرمائی۔ آپ تلاش مرشد میں نکل کھڑے ہوئے۔ دہلی تشریف لائے اور یہاں حضرت سید عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت سے مشرف ہوئے اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔

دہلی سے آپ شورکوٹ تشریف لائے اور تعلیم وتلقین اور رشد وہدایت میں مشغول ہوئے۔ آپ نے شورکوٹ میں رحلت فرمائی اور وہیں آپ کا مزار ہے۔

حضرت مادھولال حسینؒ ۱۶۳۰ء - ۱۶۹۰ء

حضرت مادھولال حسین جمال معرفت اور کمالِ حقیقت سے آراستہ ہیں۔

آپ کے والد کا نام کلسن رائے تھا۔ انہوں نے سلطان فیروز شاہ کے عہد میں اسلام قبول کیا۔ اور ان کا نام شیخ عثمان رکھا گیا۔ وہ کپڑا بنتے تھے۔

آپ کا نام شیخ حسین ہے۔ لیکن آپ مادھو لال حسین کے نام سے مشہور ہیں۔

آپ نے چھبیس (۲۶) سال عبادت، ریاضت اور مجاہدے میں گزارے۔ روزانہ ایک کلام پاک ختم کرنا آپ کا معمول تھا۔ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر نہایت پابندی سے حاضر ہوتے۔

ایک روز شاہدرہ سے گزرتے ہوئے آپ کی نگاہ ایک نوجوان مسمی مادھو پر پڑی۔ مادھو برہمن تھا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی سولہ سال کی تھی۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ مادھو کو دیکھنا تھا کہ آپ ان پر عاشق ہوئے سولہ سال تک آپ نے مادھو کے مکان کا طواف کیا۔ مادھو نے کچھ التفات نہیں برتا۔

آخر کار مادھو پر آپ کے سچے عشق کا اثر پڑا۔ مادھو آپ کی خدمت میں آنے جانے لگے اور رفتہ رفتہ مادھو آپ سے قریب ہونے لگے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کا نام میاں محبوب الحق رکھا گیا۔ لیکن وہ مشہور مادھو ہی کے نام سے ہیں۔

حضرت شہباز قلندرؒ ۱۱۰۸ء - ۱۱۹۳ء

آپ کا اصل نام سید عثمان ہے اور آپ کے لقب لعل، شہباز قلندر، سیف لسان، شمس الدین، مہدی اور مخدوم ہیں۔ آپ کا شجرہ حضرت سید اسماعیل کے ذریعے حضرت امام جعفر صادق تک اس طرح پہنچتا ہے:

''حضرت عثمان مروندی بن سید کبیر بن سید شمس الدین بن سید نور شاہ بن سید محمود شاہ بن سید احمد شاہ بن سید ہاری شاہ بن سید مہدی بن شاہ سید منتخب بن سید غالب بن سید منصور بن سید اسماعیل بن امام جعفر صادق۔''

حضرت سید عثمان قلندر شہباز کے والد بزرگوار سید کبیر، جمادی الثانی ۵۰۱ھ (۱۱۰۸ء) میں تولد ہوئے اور سنہ ۵۹۰ھ (۱۱۹۳ء) میں فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ ''مروند (آذربائیجان)'' میں ہے۔ حضرت عثمان ''مروند'' میں تولد ہوئے۔ آپ کی ولادت کی تاریخ میں اختلاف ہے۔

جناب الطاف حسین کی مورخہ 27 جولائی 1997

کے خطاب سے اقتباسات

26 جولائی 1997ء کو ایم کیو ایم کے رابطہ کمیٹی کے چیئرمین جناب اشتیاق اظہر نے اپنی پریس کانفرنس میں ایم کیو ایم کی تبدیلی نام کا باقاعدہ اعلان کیا جو قومی روزناموں کی مورخہ 27 جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا۔ دوسرے روز یعنی مورخہ 27 جولائی 1997 کو ایم کیو ایم کے رہنما جناب الطاف حسین نے بذریعہ سیٹلائٹ کراچی کے جناح گراؤنڈ کے بہت بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اشتیاق اظہر صاحب کے بیان کی توثیق اور توضیح کی۔ للذا ہرچند کہ جماعت کے ابتدائی حروف وہی رہیں گے تک اس کے پورے نام سے مہاجر کا لفظ حذف کر دیا اور اس کی جگہ متحدہ کا لفظ اختیار کر لیا گیا۔

ہرچند کہ فی الحال میں ایم کیو ایم کے نام اور اس کی نسبت سے اس کے آئندہ پروگرام میں جو تبدیلی کی گئی ہے اس سے احتراز کروں گا بہر حال چند ایسے بنیادی سوالات ہیں جو میرے نزدیک جواب طلب ہیں مثلاً"

1- متحدہ کا نام اور منشور اختیار کرنے کے بعد جماعت کی اعلیٰ قیادت کی شکل اور نوعیت کیا ہو گی؟

2- وہ انتخابات جو جماعت نے مہاجر کے نام اور منشور کی بنیاد پر لڑے اور جیتے اب متحدہ کے تناظر میں ان کی اخلاقی ٹیکنیکل اور اور قانونی حیثیت کیا ہو گی؟

3- جماعت کے الگ ملک گیر حیثیت اختیار کرنے کے بعد کیا الطاف صاحب کے لئے یہ ناگزیر نہ ہو گا کہ وہ خود وطن واپس تشریف لیں اور اپنا پیغام گاؤں گاؤں قریہ قریہ شہر شہر چاروں صوبوں تک پہنچا دیں۔

4- کیا ایم کیو ایم کے ملک گیر پیغام کا آغاز خود صوبہ سندھ سے نہ ہونا چاہیے؟

5- کیا ایم کیو ایم کی اعلیٰ قیادت اپنی ان خدمات اور کامیابیوں سے مطمئن ہے جو اسے مہاجروں کے لیے انجام دیں؟

6- کیا پاکستان کی موجودہ بڑھتے ہوئے صوبائی نسلی اور لسانی رجحانات اور اس کی بنیاد پر اٹھتے ہوئے سیاسی عمل میں ایم کیو ایم کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ وہ کام جو اور جماعتیں